شیخ غلام فاروق ط کی اودیسی

پورب اکادمی

شیخ غلام فاروق ط کی اودیسی

شیخ غلام فاروق ط کی اودیسی

Design & laout: Athar Rasul
atharrasul@gmail.com

پروفیسر شیخ غلام فاروق کے آباؤ اجداد شہاب الدین غوری کے عہد میں اجمیر شریف سے بیکانیر اور وہاں سے ملوٹ آئے۔ 'گڈھوک شیخاں' کا موروثِ اعلیٰ کالی داس ہندو راجپوت تھا۔ وہ پرتھوی راج چوہان کا انیسویں پشت پوتا اور شیخ غلام فاروق کا دسویں پشت دادا تھا۔ کالی داس اپنے عہد میں عقلمند ماہر تعمیر جانا جاتا تھا۔ اس نے قلعہ ملوٹ کی دوبارہ تعمیر کروائی۔ ظہیرالدین بابر ۱۴۹۶ء میں کلر کہار آیا تو دیکھا آبادی ناپید ہے۔ سلطان نے زمین کو آباد کرنے کا حکم دیا۔ بمطابق 'گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخاں' کالی داس نے بابر سے فرمان جاری کرنے کی درخواست کی۔ کالی داس نے 'کرنگلی' پہاڑ کے دامن سے جھیل کا پانی جو پہلے ہی کوہ 'جودہ' سے دریائے جہلم میں جارہا تھا کو مزید گہرا کروا دیا بڑے رقبے پر کھڑا پانی دریائے جہلم میں بہہ گیا۔ بابر نے کالی داس کو علاقہ کا ''کاردار'' مقرر کردیا۔ کالی داس نے سلطان کی اجازت سے نئے آباد کردہ علاقہ کو ''دھن'' کا نام دیا۔ کالی داس کے فوت ہونے پر اہل کلر کہار نے تیسرے روز آگ کے ٹھنڈا ہونے پر چتا کے پھولوں کو اکٹھا کرکے دفن کردیا اور وہاں ایک چبوترہ بنا دیا۔ جو آج بھی کلر کہار میں 'کالی داس کی مڑھی' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

پروفیسر شیخ غلام فاروق کو لکھنے کے جراثیم وراثت میں ملے ہیں۔ شیخ صاحب کے دادا شیخ نورالدین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شیخ نورالدین نے ''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخاں'' تحریر کی۔ یہ اجمیر سے بیکانیر تا ملوٹ ہجرت کی داستان ہے۔ شیخ صاحب کے والد میاں شیخ نور احمد، شیخ نورالدین صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ مئی ۱۹۲۶ء میں شیخ نور احمد کو کشمیر کے شہر ہمیر پور سدھڑ بطور پوسٹ ماسٹر تبدیل کردیا گیا تھا۔ شیخ غلام فاروق نے لڑکپن یہیں ہمیر پور سدھڑ میں دیکھا۔ شیخ صاحب کا بچپن دوات قلم اور تختی کے ساتھ سیالکوٹ کنٹونمنٹ سکول میں گذرا ہے۔

پروفیسر شیخ غلام فاروق ۲۲ جولائی ۱۹۳۲ء کو اٹک میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر صاحب نے انگریزی ادب میں ماسٹر کرنے کے ساتھ ساتھ تکنیکی تعلیم میں ڈپلومہ فزیکل ایجوکیشن مکمل کیا۔ ساری عمر فزیکل ایجوکیشن کے شعبے سے وابستہ رہے۔ ڈائریکٹر فزیکل ایجوکیشن پنجاب اور چیف ایجوکیشن آفیسر نائجیریا رہے۔ دس سال ممبر اور ایک سال ڈائریکٹر اسلام آباد سٹاک ایکسچینج رہے۔ انکی مزید تصانیف انگریزی زبان میں ہیں۔ How can you benifit from Stock Exchange، اور دوسری کتاب، Adopted Physical Education ہے۔

اطہر رسول
ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلیکیشن (Emeritus)
لوک ورثہ اسلام آباد
atharrasul@gmail.com

شیخ غلام فاروق

کی

اُوڈیسی

شیخ غلام فاروق

کی

اُوڈیسی

شیخ غلام فاروق

پورب اکادمی، اسلام آباد

طبع اوّل: ستمبر 2016ء

ناشر: پُورب اکادمی، اسلام آباد

فون نمبر: 051 -231 7092

ای میل: poorab_academy@yahoo.com

ویب سائٹ: www.poorab.com.pk

شیخ غلام فاروق کی اوڈیسی

Shaikh Ghulam Farooq ki Odyssey

Author: **Shaikh Ghulam Farooq**

Editing & Cover Design: **Athar Rasul**

Published by: **Poorab Academy, Islamabad, Pakistan**

جناب والد صاحب مرحوم

کے نام

جنھوں نے مجھے قلم پکڑنی سکھائی

فہرست ابواب

دیباچہ

محبِّ گرامی جناب شیخ غلام فاروق صاحب کی زندگی محنت اور محبت سے عبارت ہے۔ ان کا سفر نامہ کسی ایک ملک یا شہر کے سفر کی روداد نہیں بلکہ ان کی زندگی کے سفر کی کہانی ہے۔ ان کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات عبرت انگیز اور بصیرت افروز ہیں۔ ان کی لڑکپن سے لے کر آج تک کی زندگی میں سیر و سفر کی داستان پڑھتے وقت میر تقی میر کا یہ شعر یاد آیا۔

کس کس طرح سے میر نے کاٹا ہے عمر کو
ٹک آخر آخر آن کر یہ ریختہ کہا

مجھے ایشیا افریقہ اور یورپ میں ان کی سیر و سیاحت سے پھوٹنے والے تجربات و مشاہدات تاریخی اور تعلیمی اہمیت کے حامل نظر آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے رنگ، نسل خطہ زمین کے تنوعات کے باوجود انسان رنگ و نسل میں بلاشبہ ایک دوسرے سے مختلف پہچان رکھتے ہیں۔ مگر اپنی انسانی سرشت میں مشترک اوصاف کی بدولت بھائی بھائی ہیں۔ یہی شرف انسانیت رنگ و نسل اور مولد و مسکن کے اختلاف کے باوجود آفاقی سطح پر انسان کی پہچان ہے۔ شیخ صاحب نے اس حقیقت کو اپنے تجربات اور مشاہدات کی بدولت کتاب سے نہیں بلکہ زندگی سے پہچانا ہے۔ اور زندگی کی اس معرفت کو اپنے اس سفر نامہ کی صورت قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ مجھے اس کتاب میں چند ایسے مقامات نظر نے اپنی جانب یوں متوجہ کیا ہے کہ میں ان مقامات سے برصغیر کی زندگی کی سچائیوں کو سمجھ پایا ہوں۔ جی چاہتا ہے اس سفر نامہ کا باب بعنوان ''دیوتاوں کے ہمراہ تعلیم'' پاکستان کے سکولوں کے نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔

یہاں شیخ غلام فاروق صاحب نے جموں میں اپنی زندگی کی حقیقتوں کو جس صداقت احساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس سے پاکستان کی نئی نسل کو بخوبی واقف ہونا چاہیے۔ ہندو معاشرہ میں ذات پات اور چھوت چھات کے عقائد نے مسلمانوں کو اچھوت سے بھی نچلا درجہ

تفویض کر رکھا تھا۔ نتیجہ یہ کہ

''ہندو لڑکے ہمیں شُودر سمجھتے اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہاتھ چُھو جانے پر بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتے۔ بات بات پر اپرا، اپرا، کا شور کرتے دونوں بھائی حیران تھے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ ایک مُسلمان استاد سے اِس لفظ کے معنی دریافت کیے۔ اُنہوں نے بتایا کہ یہ سنسکرت زبان کے لفظ اپرا پُرش اور اپراپر کرتی کا مخفف ہے جس کے معنی گھٹیا روح اور غلیظ مادہ کے ہیں۔ میں ایک بار ایک ہندو کشتری سے مار کھاتے کھاتے بچا۔ ایک براہمن لڑکے نے ہاتھ چُھو جانے کی وجہ سے ملیچھ کا خطاب عطا کیا اور سنسکرت کے چند فقرے خاص سُر میں پڑھے، بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ فقرے راماین کے ہیرو شری رام چندر نے شریمتی سِیتا کے اغواء کرنے پر راون کے لیے بددُعا کے طور پر کہے تھے۔ ایک بار بڑے بھائی غلام صدیق کے ایک ترش جواب پر ایک کشتری نے کلاس کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور بولا ''میں منہاس راجپوت ہوں باہر آؤ میں تماری مُسلمانی نکالتا ہوں''

اس ماحول میں۔

''پانچ ماہ کا عرصہ بڑی مُشکل میں گُزارا ہر وقت ذہنی تناؤ میں رہتے، جینا دوبھر تھا۔ پیاس ہوتی تو کسی ہندو لڑکے کی منت کرنی پڑتی، کہ وہ گھڑے سے پانی نِکال کر میرے ہاتھوں کی اَوک میں اُنڈیل دے تا کہ میں پانی پی کر اپنی پیاس بجھا سکوں۔ مُسلمان بچوں کے لیے گھڑا اسُتون کی دوسری جانِب علیحدہ رکھا تھا۔ جو اَکثر خالی ہوتا یا اُس میں پچھلے دو روز کا بدبُو دار پانی ہوتا۔ پانی لانے والا ہندو تھا، وہی مسلمان لڑکوں کے گھڑے میں پانی ڈال کر جاتا۔ وہ کسی مسلمان لڑکے کو بلاتا جو گھڑے کے ڈھکنے کو اٹھاتا، تاکہ وہ دور سے اس میں پانی ڈال دے۔ مسلمان گھڑے کو چھونے اور اس کی چھینٹوں سے بھرشٹ ہو جاتا۔ اس دوران ڈھکنا اٹھانے والا مسلمان لڑکا اگر پانی کے گھڑے سے کسی وجہ سے چھو جاتا، تو پانی ڈالنے والا ہندو بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتا۔ مسلمان گھڑے سے چھو جانا کسی ناپاک شے سے چھو جانے کے مترادف تھا۔ جب کبھی کوئی مسلمان لڑکا نزدیک نہ ہوتا تو وہ مجبوراً گھڑے میں پانی نہ ڈال سکتا۔ گھڑے کا ڈھکنا اُٹھانا اسکے لئے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔''

اپنے اسی احساس کی بدولت میں زیر نظر سفر نامے کے مندرجات کو محض ایک خوش وقت

سیاح کی سرگزشت سے کہیں بڑھ کر اپنی قومی تاریخ کا بیش قیمت سرمایہ قرار دیتا ہوں۔ میں شیخ غلام فاروق صاحب کا شکرگزار ہوں کہ انہوں اپنی یہ گراں قدر تصنیف اشاعت سے پہلے پڑھنے کی عزت اور مسرت بخشی۔

فتح محمد ملک

ریکٹر انٹرنیشنل اسلامک-یونیورسٹی اسلام آباد۔

جنوری۔۸۔۲۰۱۶

شیخ غلام فاروق کی یادداشتیں

شیخ غلام فاروق صاحب کی یادداشتیں اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت سے یاد رکھی جائیں گی۔ گذرتے وقت کے ساتھ ان کی افادیت مزید بڑھتی جائیگی۔ خصوصاً جموں کے تہذیب وتمدن کے بارے میں جس خوب صورتی سے انہوں نے منظرکشی کی ہے وہ نا قابل بیان حد تک لایق تحسین ہے۔ چندرسم ورواج کا تعلق مذہب سے زیادہ علاقائی پنڈتوں کی رسومات سے ہے۔

مکیش کمار

پروڈیوسر پروگرامز پاکستان ٹیلیویژن

سیکٹر آئی ایٹ فور اسلام آباد

عرض حال

تخلیق کا نوے پچانوے فیصد تعلق محنت سے ہوتا ہے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال نہ ہو۔ میں انگریزی زبان کا طالبعلم تھا۔ کالج کے زمانہ میں چکوال کالج میگزین ''شمشیر'' کے انگریزی سیکشن کا ایڈیٹر رہا۔

تکنیکی تعلیم 'فزیکل ایجوکیشن' کے ساتھ، ایم اے انگریزی زبان میں کیا۔ دوران سروس دس سال تک نائیجیریا میں ایک استاد کی حیثیت سے تعلیم دی۔ نائیجیریا میں ذریعہ تعلیم اور وسیلہ گفتگو انگریزی تھا۔ نائیجیریا میں ایک کتاب Adopted Physical Education اڈاپٹڈ فزیکل ایجوکیشن انگریزی زبان میں تحریر کی۔ جب پاکستان آیا تو انگریزی میں سٹاک ایکسچینج پر کتاب How can you benifit from Stock Exchange تحریر کی۔ معلوم نہیں کب اور کیسے اردو میں کم مائیگی کے باوجود ''اوڈیسی'' "ODYSSEY" لکھنا شروع کردی۔ یہ صرف اللہ تعالےٰ کی مہربانی تھی کہ ستر اسی سال پہلے رونما ہونے والے واقعات میرے سامنے ایک ترتیب میں اس طرح آئے جیسے وہ سب حال ہی میں وقوع پذیر ہوئے ہوں۔ وہ سب چلتی فلم کی مانند سامنے آتے گئے اور میں انہیں سپرد قلم کرتا گیا۔ میں نیشنل لائبریری کی اسسٹنٹ لائبریرین نادیہ صدیق صاحبہ مسٹر ریاض احمد صاحب اور مسز کنیز کبرہ کمال کی ابتدائی مدد کا بہت مشکور ہوں کہ ان کی حوصلہ افزائی نے مجھے منزل دکھائی۔

اس سفرنامہ کو مکمل کرنے میں میری جو مدد جناب لفٹیننٹ کرنل (ر) ارشد حیات صاحب اور جناب اطہر رسول صاحب ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلیکیشن (ر) لوک ورثہ اسلام آباد نے فرمائی۔ اُس کے لیے میں ان دو حضرات کا بے حد مشکور ہوں انہوں نے ایک استاد کی مانند مسودہ میں اصلاح فرمائی۔

میں جناب فتح محمد ملک صاحب سابق ریکٹر اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کا سیر حاصل تبصرہ

لکھنے پر ممنون ہوں۔ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر مسودہ کو پڑھا اور اپنی رائے سے مستفید کیا۔

میں ان حضرات کے علاوہ جناب فیصل محمود۔ حسیب افتخار۔ اسد ستی۔ عدنان احمد، بہت سے اور مہربانوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو میری ہر قسم کی مدد کے لیئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ میں بیگم صاحبہ کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے پنجابی اور انگریزی زبان کے الفاظ کا اردو میں ترجمہ کرنے میں میری مدد فرمائی۔

کتاب اُوڈیسی مکمل سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں تاہم اگر کسی وجہ سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو، میں ان سے معذرت خواہ ہوں ماسوائے اپنے خاندان کے باقی تمام نام فرضی ہیں۔ اتفاقیہ مماثلت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اس سفرنامہ کی بہتری کے لیئے مثبت تنقید کا ہر وقت منتظر رہوں گا۔

شیخ غلام فاروق

مورخہ۔۱۶۔۷۔۲۹

مکان نمبر ۱۰۴۰ گلی ۷ پولیس فاونڈیشن اسلام آباد

فون ۰۳۲۳_۵۴۷۲۳۵۴_۰۳۳۱_۵۰۰۴۸۷۹

تعارف

بابا کالیداس

میرے خاندان کا موروث اعلیٰ بابا کالیداس ایک ہندو راجپوت تھا۔ وہ پرتھوی راج چوہان کا انیسویں پشت پوتا اور میرا دسویں پشت دادا تھا۔

میرے آباو آجداد شہاب الدین غوری کے عہد ۱۴۶۵ء عیسوی میں سری کسیب نامی سردار کی زیر قیادت اجمیر سے بیکانیر اور وہاں سے ملوٹ نقل مکانی کر آئے۔

بابا کالی داس کی تاریخ پیدائش اور وفات کے متعلق حقائق تو کہیں سے دستیاب نہ ہو سکے۔ البتہ ''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان'' از شیخ نورالدین سے اتنا معلوم ہوا کہ بابا کالیداس کے والد مہتہ چندورائے کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ اولاد نرینہ کی خواہش لیئے ہندو مذہب کے ایک اوتار 'سری کالکاجی' کی پوجا کرتا، اور اپنی دعا میں اولاد نرینہ کی خواہش کرتا۔ خوش قسمتی سے اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام اس نے 'سری کالکاجی کی نسبت سے کالک داس رکھ دیا جو بعد میں کالی داس کے نام سے مشہور ہوا۔ اس عہد کے رواج اور مروجہ اصولوں کے مطابق وہ ایک معاملہ فہم سمجھدار اور عقلمند ماہر تعمیر پہچانا جاتا۔ اس نے قلعہ ملوٹ کے ڈیزائین میں کچھ ردوبدل کر کے اس کی دوبارہ تعمیر بھی کروائی۔

سلطان ظہیر الدین بابر پہلی بار کلر کہار آیا تو اُس نے دیکھا کے علاقہ میں تمام برساتی ندی نالے اور دریا پانی سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور آبادی ناپید ہے ظہیر الدین بابر کے مزید دریافت کرنے پر لوگوں نے اسے بتایا کہ یہ بارش کا پانی سالہا سال سے یہاں کھڑا ہے اور کہیں نہیں جاتا۔ بادشاہ نے لوگوں سے دریافت کیا، کہ اس علاقہ میں کوئی عقلمند اور سمجھدار ماہر تعمیرات ہے تو اسے

پیش کیا جائے۔ جواب میں لوگوں نے کالیداس کا نام لیا۔ جب وہ پیش ہوا تو بابر بادشاہ نے اسے بارشی پانی سے بھرے ندی نالوں کو خشک کرنے اور حاصل ہونے والی زمین کو آباد کرنے کا حکم دیا۔

بمطابق ''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان'' اس کے جواب میں کالی داس نے بابر بادشاہ سے چند فرمان جاری کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ اس کام کو احسن طریق سے سرانجام دے سکے۔ ظہیر الدین بابر نے کالی داس کی درخواست منظور کرتے ہوئے، تمام فرمان جاری کر دیئے۔ حسب خواہش فرمان جاری ہو جانے کے بعد کالی داس نے اس جھیل کے گرد سروے کیا۔ اس نے دیکھا کہ اس جھیل کا پانی پہلے ہی کوہ 'جودہ' (کوہستان نمک) سے مشرق کی جانب 'کرنگلی' پہاڑ کے دامن سے دریائے جہلم میں جا رہا ہے۔ اس نے اس جگہ کو مزید گہرا کروا دیا۔ جس سے وسیع رقبے میں کھڑا پانی مکمل طور پر دریائے جہلم میں بہہ گیا۔

آبادکاری کے لیے اس نے ہر آباد گاوں سے دو دو تین تین لوگوں کو بے گھر کر کے اس علاقہ میں آباد کیا۔ ظہیر الدین بابر دوسری بار جب ہندوستان آیا تو اس نے دیکھا کہ تمام ندی نالے خشک ہو چکے ہیں۔ اور حاصل شدہ زمین پر لوگ آباد ہیں۔ ظہیر الدین بابر نے اپنے مترجموں سے دریافت کیا کہ شاباش کو ہندی زبان میں کیا کہتے ہیں۔ انہوں نے اسے بتایا کہ شاباش کو ہندی میں ''دھن'' کہتے ہیں۔ ظہیر الدین بابر نے کالی داس کو مخاطب کر کے کہا۔

''کالی داس دھن دھن بر کارے تو''

(کالی داس تمہارے کام کی احسن تکمیل پر تم کو شاباش اور تمہارا شکریہ)

بمطابق ''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان'' ظہیر الداین بابر نے کالیداس کو علاقہ کا 'کاردار' مقرر فرمایا۔ (اسکی تفصیل معلوم نہ ہو سکی کہ یہ کوئی عہدہ تھا یا کوئی خطاب)

''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان'' میں تحریر ہے کہ ظہیر الدین بابر نے کالی داس کو پچاس لاکھ روپیہ بطور انعام دینا منظور کر لیا۔ لیکن کالی داس نے اتنا روپیہ اکھٹا لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میرے اور میری آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایسا انعام تجویز کیا جائے جو میری اولاد ہمیشہ وصول کر سکے اور مجھے اور آپ کو یاد کرے۔

''چیزے رسوم برائے بندہ تعین شود تا بر صفحہ روز یادگار بمانند و پسماندگان من را بکار آید۔''

ظہیر الدین بابر نے کالی داس کی یہ درخواست منظور کرتے ہوئے، دو فیصد مالیہ بطور رسوم دائمی

منظور کیا۔ یہ دو فیصد مالیہ کالی داس کی اولاد پانچ پشتوں تک وصول کرتی رہی۔

اورنگزیب عالمگیر نے ایک فرمان کے ذریعہ غیر مسلم رعایا کا سرکاری دفاتر میں داخلہ ممنوع قرار دے دیا۔ غیر مسلم ہونے کی بنا پر کالیداس کی اولاد کو رسوم دائمی کی رقم ملنا بند ہوگئی۔ اس رسوم دائمی کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کالی داس کی اولاد میں سے ایک شخص مسمی میگھراج نے اسلام قبول کر کے دوبارہ رسوم دائمی محمد شریف کے نام سے وصول کرنا شروع کر دیا۔

کالی داس نے ظہیر الدین سے درخواست کی کہ اگر اجازت ہو تو اس نئے آباد کردہ علاقہ کو ''دھن'' کا نام دیا جائے۔ جسے ظہیر الدین بابر نے منظور کر لیا۔

کالی داس کا اہل کلر کہار بہت احترام اور عزت کرتے تھے۔ اظہار عقیدت کے لیے ان کی وفات کے تیسرے روز آگ کے ٹھنڈا ہو جانے پر چِتا کے پھولوں (ان جلی ہڈیاں) کو مرتبان میں اکٹھا کر کے دفن کر دیا اور وہاں ایک چبوترہ بنا دیا۔ جو آج بھی کلر کہار میں 'کالی داس کی مڑھی' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

چاچا جی، شیخ ہدائیت اللہ

چاچا جی، شیخ ہدائیت اللہ ابا جی کے چھوٹے بھائی نہ تھے، حقیقت میں وہ میرے نانا تھے۔ وہ ایک جگت چاچا تھے۔ باپ کو چاچا کہہ کر پکارنا اس عہد کا رواج تھا۔ میری والدہ اور ماموں بھی انہیں چاچا جی ہی کہتے۔ ان کی پیروی میں ہم سب ان کے دوہتے اور پوتے بھی انہیں چاچا جی ہی کہتے۔ چاچا جی دو جڑواں بھائی تھے شیخ ہدائیت اللہ اور شیخ حبیب اللہ گھر کا ہر فرد انہیں چھوٹے چاچا جی اور بڑے چاچا جی ہی کہتا۔ دونوں ہم شکل تھے، اُن کا پہچاننا سب کے لیئے مشکل تھا۔ چاچا جی نے ہی بتایا کہ ان کے والدین بھی اکثر اس مشکل میں پھنس جاتے۔ اکثر ایک شرارت کرتا اور سزا دوسرے کو مل جاتی۔ چاچا جی ہی نے ہمیں بتایا کہ بچپن میں ان کی پیٹھ پر بہت سی پھنسیاں نکل آئیں۔ سونے میں تکلیف ہوتی، رات جاگتے گزرتی۔ ان کے والد، شیخ کرم دین جنہیں وہ بھی چاچا جی ہی کہہ کر پکارتے، نے محلے کے حکیم سے اس کا ذکر کیا اس نے کہا آپ بچے کو لے آئیں۔ میں مرہم لگا دونگا اور اگر ضرورت ہوئی تو نشتر سے پیپ بھی نکال دونگا۔ جس کے بعد بچہ آرام اور سکون سے سوئے گا اور جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ چاچا جی گھر آئے اور میری بجائے بھائیا جی کو

غلط فہمی میں مرہم لگوانے لے گئے۔ میں گلی میں باہر کھیلنے گیا ہوا تھا۔ جب حکیم صاحب کے پاس پہنچے تو بھائیا جی کا کُرتا اُٹھا کر حکیم صاحب کو دکھایا کہ دیکھیں اسے یہ پھنسیاں نکلی ہیں۔ ان کی پیٹھ پر تو کوئی پھوڑا یا پھنسی نہ تھی۔ چاچا جی شرمندہ ہو کر حکیم صاحب سے کہنے لگے۔

''یار یہ میرے جڑواں اتنے ہم شکل ہیں کہ پھنسیاں تو چھوٹے کو نکلی ہیں، اور میں غلطی سے بڑے کو پکڑ لایا ہوں۔ اکثر انہیں پہچاننا ہمارے لیئے مشکل ہو جاتا ہے''۔

حکیم صاحب نے چاچا جی سے کہا کہ آپ انہیں مختلف رنگوں کے کپڑے پہنائیں آپ کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔

چھوٹے چاچا جی کے بڑے بھائی جنہیں ہم سب ''بڑے چاچا جی'' کہتے، نے قانون کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اتنے کامیاب وکیل بھی نہ تھے۔ اکثر شراب کے نشہ میں دھت کچہری پہنچ جاتے۔ وکالت ہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ جو بدنامی کا شکار ہو کر جلد ختم ہوگئی۔ انہوں نے تین شادیاں کیں ان کی تیسری بیوی سے دو بچے پیدا ہوئے، ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بڑے چاچا جی نے اپنی تینوں بیویوں کو طلاق دے کر بچوں کو ان کی ماں کے حوالے کر دیا۔ اور خود اپنے چھوٹے بھائی ہدائیت اللہ کے گھر ڈیرہ جما لیا۔ چھوٹے چاچا جی نے بڑے بھائی کا بچے ماں کو دینے پر اعتراض کیا اور خود جا کر دونوں بچوں کو گھر لے آئے۔ اور دونوں کی شادی اپنے خاندان میں کر دی۔ بڑے چاچا جی انیس سو چالیس میں ساٹھ سال کی عمر میں ہی فوت ہوگئے۔

چھوٹے چاچا جی' کافی عمر رسیدہ تھے۔ زندگی کی ستر سے زیادہ بہاریں دیکھ چکے تھے۔ وہ انیس سو تیس میں سیشن جج کی عدالت سے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائیر ہوئے اور چوبیس روپے چھ آنے پینشن پائی۔ وہ دراز قد دبلے پتلے بڑے ہنس مکھ اور صاف گو شخص تھے۔ اکثر بچوں کو اپنی جوانی کے زمانے کے قصے کہانیاں اور تجربے سناتے۔ ایک بار انہوں نے بتایا کہ وہ ہر کام کرنے سے پہلے کامیابی کے لیے خواجہ خضر سے مدد طلب کرتے۔ ایک بار انہیں خواجہ خضرؑ سے سامنا بھی ہوگیا۔ لیکن وہ انہیں پہچان نہ سکے۔ چاچا جی نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ گاؤں سے چوا سیدن شاہ میلہ پر جا رہے تھے۔ اپریل کی دھوپ میں تمازت زیادہ تھی۔ جنگل میں ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں ستانے کے لیئے بیٹھ گیا۔ چھاؤں ٹھنڈی تھی زمین پر ہی لیٹ گیا۔ اُونگھ آئی اور سو گیا۔ جب بیدار ہوا، تو سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ پہاڑ کو رات سے پیشتر پار کرنا

ممکن نہ رہا تھا۔ بہت خوف ہوا کہ کوئی جن بھوت پریت نقصان نہ پہنچائے۔ کہنے لگے یہ سوچتے ہی میں خواجہ خضرؑ سے اونچی آواز میں مدد کا طلبگار ہوا۔ فرمانے لگے کہ ابھی چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ ایک بلند قامت مظبوط جسم والا شخص سامنے آیا۔ اس نے سامنے آکر مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش کی لیکن بات کیے بغیر چل دیا۔ میں سمجھا کہ کوئی مسافر تھا۔ کسی غلط فہمی میں کھڑا ہو گیا۔ شاید وہ غلط فہمی دور ہو گئی چنانچہ بات کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ جب وہ چلا گیا تو پیچھے سے آواز آئی۔

''ہر کوئی میرا طلب گار ہے اور وقت بے وقت وجہ بے وجہ بلاتا ہے۔''

یہ فقرہ سن کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ اس کے بعد میں نے خواجہ خضر کو مدد کے لیے پکارنا چھوڑ دیا۔

انہوں نے ایک اور واقعہ سنایا کہ وہ ڈریالہ کہون گاؤں، جو پہاڑ کی دوسری جانب تھا، اپنی بڑی ہمشیرہ کو ملنے گئے۔ پہاڑ عبور کرنے کے بعد دیکھا کہ ایک چھوٹا سا بھیڑ کا بچہ ''بھے'' ''بھے'' کرتا راستہ میں جا رہا ہے۔ میں سمجھا کہ وہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے۔ اب یہ ''بھے'' ''بھے'' کر کے اسے تلاش کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی گیدڑ یا بھیڑیا اس کی آواز سن کر آجائے اور اسے شکار کر لے۔ بھیڑ کا دو روز کا چھوٹا سا بچہ تھا، جو آسانی سے چل بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ لیکن چند قدم آگے گیا تو دیکھا کہ وہ بھیڑ کا بچہ لمبا ہو کر میرے پاوں تک پہنچ چکا ہے۔ کبھی وہ عقب میں ایڑی سے تو کبھی سامنے گھٹنے سے ٹکرا رہا تھا میں سمجھ گیا کہ یہ بھیڑ کا بچہ نہیں کوئی جن یا بھوت ہے۔ میں نے اُسے کندھے سے اٹھا کر زمین پر دے مارا اور اپنے ہاتھوں میں پکڑی کلہاڑی سیدھی کی کہ اِسے تو آج یہیں ختم کرتا ہوں۔ کلہاڑی سے وار کیا۔ کلہاڑی ایک پتھر پر لگی، لیلا غائب تھا۔ دور سے ایک آواز آئی۔

''شیخ صاحب کی سواری لینی تھی وہ لے لی ہے۔''

جوانی میں ہم شکل ہونے کی وجہ سے کئی ناجائز فائدے اُٹھانے کے قصے بھی سنائے۔ ایک بار کہنے لگے کہ بھائیا جی کوڈی کے اچھے کھلاڑی تھے گو میں تو کوڈی کا اچھا کھیلنے والا نہ تھا، لیکن میں بھائیا جی کا قابل اعتماد ساتھی ضرور تھا۔ ایک بار میں اور بھائیا جی کوڈی کھیلنے چوہا سیدن شاہ کے میلے پر گئے۔ کوڈی کے بعد میں تو ڈیرے پر آ گیا بھائیا جی بازار چلے گئے۔ انہیں بھوک نے ستا رکھا تھا۔ بازار میں دودھ کی دکان سے گزرے۔ دکاندار کڑاہ میں دودھ ڈالے اسے اُبال رہا تھا۔ بھائیا

جی نے اس کو کہا کہ اگر میں تمہارا یہ تمام دودھ پی لوں تو کیا دو گے۔ دکاندار جانتا تھا کہ وہ کبڈی کا اچھا کھلاڑی ہے لیکن یہ نہ جانتا تھا ہم دو جڑواں بھائی ہم شکل بھی ہیں بولا۔

''شیخ صاحب جتنا دودھ پینا ہے پی لیں۔ پیسے نہ دینا میں تقاضہ نہیں کروں گا۔ میں دکاندار ہوں، جواری نہیں شرط نہیں لگاتا۔''

بھائیا جی کے بہت اصرار پر وہ شرط لگانے پر تیار ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک آدمی ایک سیر دودھ مشکل سے پی سکتا ہے، کڑاہ میں سات سیر دودھ ہے نہ پی سکے گا۔ دکاندار لالچ میں آ گیا۔ کہ سات سیر کی بجائے چودہ سیر کے پیسے ملیں گے۔ وہ شرط لگانے پر تیار ہو گیا۔ دونوں کے درمیان یہ طے پایا۔ کہ عشاء کی آذان سے پہلے تمام دودھ جو سات سیر ہے۔ اگر بھائیا جی نے پی لیا تو دکاندار کوئی پیسہ نہ لے گا۔ اگر نہ پی سکے تو چودہ سیر دودھ کے پیسے دینا ہوں گے۔ ان دنوں مغلیہ عہد کے ناپ اور تول سیر اور چھٹانک استعمال ہوتے تھے۔ سیر کا پیمانہ لیٹر سے کچھ کم تھا۔ سیر کا وزن کلو سے کم تھا۔ چھوٹے چاچا جی نے بتایا۔ کہ پہلے تو بھائیا جی نے تین کٹورے تقریباً ڈیڑھ سیر دودھ پی لیا۔ پھر دکاندار سے کہا، کہ ظہر کی نماز پڑھ کے آتا ہوں اور باقی ماندہ دودھ آ کے پیتا ہوں۔ بھائیا جی گھر آئے تو مجھے سارا قصہ اور شرائط سے آگاہ کیا اور کہا کہ فلاں دکاندار سے یہ کہہ کے آیا ہوں، کہ نماز پڑھ کے آتا ہوں۔ تم جاؤ اور کچھ دودھ ختم کر آؤ۔ چاچا جی نے کہا کہ میں اسی دکاندار کے پاس چلا گیا۔ اُسے کہا اگلا تو ہضم ہو گیا۔ باقی کا لاؤ اسے بھی ختم کرتا ہوں۔ وہ حیران ہو کر میرے منہ کی جانب دیکھنے لگا اور بولا۔

''کیا اگلا ہضم کر آئے ہو''

میں نے بتایا۔

''وہ تو نماز سے پیشتر ہضم ہو گیا تھا، لاؤ دو اور کٹورے''

وہ میری بات سن کر پریشان ہو گیا۔ وہ مجھے پہچان نہ سکا تھا۔ میں دو کٹورے دودھ غٹا غٹ پی گیا۔ وہ پریشان میری جانب پھٹی نگاہوں سے دیکھ کر شرمندگی کی تھوک نگل رہا تھا۔ میں عصر کی نماز کا بہانہ کر کے آ گیا۔ اور اسے کہہ آیا کہ باقی ماندہ دودھ آ کر پیتا ہوں۔ میں نے بھائیا جی کو بتا دیا کہ اب میرے پیٹ میں مزید کسی چیز کی گنجائش نہ ہے۔ اب کی بار بھائیا جی گئے اور تین کٹورے دودھ اور پی کے آئے اور مغرب کی نماز کا بہانہ کر کے آ گئے۔ ابھی کڑاہ میں بہت سا دودھ بقایا تھا

بھائیا جی میری منت کرنے لگ گئے ''یار میں تو یہ سب نہ پی سکوں گا۔ شرط ہار گیا تو چودہ سیر کے پیسے دینے پڑ جائیں گے، جاؤ اور جتنا ہو سکے پی آو۔ باقی کا میں پی لونگا۔ چاچا جی نے بتایا کہ وہ سارا دودھ ہم دونوں بھائیوں نے باری باری عشاء سے پیشتر ہی ختم کر دیا۔

چاچا جی ہمیں اپنے بچپن کے قصے روزانہ رات کو سناتے۔ اپنے اسی قسم کا ایک اور واقعہ انہوں نے گھی پینے کا سنایا۔ ایک تمبالو (لمبے منہ والی گڑوی) جس میں تقریباً تین پاؤ گھی آتا تھا۔ دونوں نے مل کر پیا اور دونوں کو اسہال کی شکایت ہوگئی حکیم صاحب ہمارے جلاب بڑی مشکل سے قابو کر سکے تھے۔ ہمارے چاچا جی یعنی والد صاحب نے ہم دونوں کو سختی سے منع کر دیا۔ کہ شرط لگانے کا سلسلہ بند کرو۔ اس میں تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔ اپنے لیے نوکریاں تلاش کرو۔ تا کہ میں تم دونوں کی شادی کا بندوبست کروں۔ لیکن ہم دونوں کو اب شرط لگانے کا چسکا ہو گیا تھا، روزانہ ہی کسی نہ کسی سے شرط ضرور لگاتے۔

آخر ایک روز شرط ہار گئے۔ وہ شرط ایک ہوٹل والے سے تھی وہ جانتا تھا کہ ہم جڑواں ہم شکل ہیں۔ صرف میں قد میں بھائیا جی سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ وہ بولا۔

''بڑے بھائی کو بلاو، وہ آ کے کھائے گا۔''

اُس دن پہلی بار ہم شرط ہارے دوسری بار ہم سکول کینٹین سے آلو چھولے لیکر کھا رہے تھے کہ پکڑے گئے۔ اب بازار کے ہر دکاندار کو ہماری اس حرکت کا علم ہو گیا۔ کوئی دکاندار ہم سے بات کرنے کو بھی تیار نہ ہوتا اور شرط لگانے کا سلسلہ بند ہو گیا۔

سکول میں تو ہم دونوں بھائی روزانہ ہی کسی نہ کسی کو ہم شکل ہونے کی بنا پر بیوقوف بنا رہے ہوتے۔ خود ہی شرارت کرتے اور وہیں انکار بھی کر دیتے۔ ابتدا میں تو ہم اساتذہ کے احترام میں ہمیشہ سچ بولتے۔ ساتویں جماعت تک تو اساتذہ کا احترام قائم رہا۔ اپنی غلطی مان کر سزا بھی قبول کر لیتے۔ لیکن بعد میں بھائیا جی کلاس میں بدتمیزیاں کر رہے ہوتے اور جواب میں اکثر مجھے مورد الزام ٹھہراتے۔ کبھی کبھی اساتذہ بھی دھوکا کھا جاتے اور بھائیا جی کی بات مان لیتے۔ میں پڑھائی میں سنجیدہ تھا اور بھائیا جی کھیلوں میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ البتہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے انوکھا طریقہ نکالا، انہوں نے دونوں کو اکھٹا بلا لینا اور دونوں کو کان پکڑا کر دونوں کو جوتے مارنے۔ غلطی ایک نے کرنی اور سزا دونوں کو ملنے لگی۔ ان کا سلیپر یا کھسہ تو اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا کھسہ کا جسم پر

لگنے سے شور بہت ہوتا۔ میں جھوٹ موٹ کا ہائے ہائے کرتا، کان چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ جب یہ سلسلہ روزانہ کا چل پڑا۔ تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے سوٹی سے ہماری پٹائی شروع کر دی۔ سوٹی وہ ٹانگوں پر مارتے۔ یہ سلسلہ بھی روزانہ کا ہو گیا۔ اب ہیڈ ماسٹر صاحب کی سزا سے بچنے کے لیے روزانہ دو شلوار پہن کر یا شلوار پر دھوتی باندھ لینی یا شلوار کے نیچے کا چھا مزید پہن لینا۔ تنگ آ کر ہیڈ ماسٹر صاحب نے چاچا جی (والد صاحب) کو دفتر بلایا اور سب کچھ بتا دیا۔ کہ میں اس وجہ سے ایک کو نکال رہا ہوں اور بڑے بھائی کو سکول سے نکال دیا۔ بڑے بھائی جان کی تعلیم کا سلسلہ وہیں رک گیا۔ اور اب کلاس میں سکون تھا۔ میں اکیلا کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔

شیخ صدرالدین عرف نورالدین

میرے دادا کا نام صدر دین تھا۔ جسے ایک واقعہ کے بعد میں انہوں نے تبدیل کر کے نورالدین رکھ لیا۔ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے ماموں سے حاصل کی۔ ان کے ماموں قرآن پاک کے جید عالم تھے۔ شیخ صدرالدین عرف نورالدین نے عربی زبان میں قرآن پاک کی ترتیل کے علاوہ تفسیر اور فارسی زبان میں گلستان، بوستان، اخلاق جمالی اور اخلاق جلالی پر بھی عبور حاصل کیا۔ ان کے ماموں کا مزار مبارک ڈھڈیاں میں واقع ہے۔ جہاں پر ان کا عرس مبارک ہر سال منایا جاتا ہے۔

شیخ نورالدین نثر نگاری میں بھی یکتا تھے۔ انہوں نے فارسی زبان میں تاریخ کی کتاب ''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان' بڑی محنت اور مطالعہ کے بعد تحریر کی۔ اس کتاب میں انہوں نے 'گڈھوک شیخان' کی بیکانیر سے ملوٹ تک کی ہجرت اور اس کی وجوہات کی مکمل داستان تحریر کی۔ اس تحقیقی مقالہ میں انہوں نے مغل بادشاہ ظہیرالدین بابر سے کالیداس کی ملاقات کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کا تلخیص وار دو ترجمہ انور بیگ اعوان نے اپنی کتاب ''دھن ملوکی' میں تحریر کیا ہے۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس کی اصل نسخہ کو بھی نقل کر دیا تا کہ کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ انہوں نے ظہیرالدین بابر سے کالیداس کی گفتگو کا متن تحریر کیا ہے۔

''چیزے رسوم برائے بندہ تعین شود تا بر صفحہ روزیادگار بماند و پسماندگان من رابکار آید''

’’گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان‘‘ قلمی نسخہ ہے۔گڈھوک خاندان کے اکثر افراد اس کتاب کا ذکر ریفرنس کے طور پیش کرتے ہیں۔

شیخ نورالدین کے بیٹے اور بیٹیوں کا شمار بھی ادیبوں میں ہوتا تھا۔ان کے ایک بیٹے امام دین کے گھر پر ہر جمعہ کی شب ایک ادبی بیٹھک منعقد ہوتی، جس میں وہ اپنا تحریر کردہ مکالہ یا نظم تنقید کے لیے پیش کرتے۔اُن کو ملکہ وکٹوریہ کی رسم تاج پوشی میں خاص طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا۔ جہاں انہوں نے ملکہ وکٹوریہ کی مدح میں ایک نظم پڑھی۔انہیں ایک سند کے علاوہ ایک پگڑی اور ایک ہزار روپیہ انعام دیا گیا۔

شیخ نورالدین کا قد درمیانہ، رنگ گندمی، پھرتیلا بدن اور فراخ پیشانی تھی۔تعلیم یافتہ اور امیر ہونے کی بنا پر گاؤں والے ان کی بڑی عزت کرتے۔سر پر ململ کی بڑی پگڑی باندھتے، گرمیوں میں سادہ سفید ململ کی ڈبل کاج والی قمیص میں سونے کے بٹن لگاتے اور قمیص پر ایک پانچ چھ سفید بٹنوں والی واسکٹ کے علاوہ انگرکھا ضرور پہنتے۔

شیخ صاحب پانچ وقت کے نمازی اور پرہیز گار تھے۔ہر نماز مسجد میں جا کر ادا کرتے۔ راستہ چلتے تسبیح اونچی آواز میں پڑھتے جس سے ان کی مسجد میں آنے اور جانے کی اطلاع دور سے ہی ہو جاتی۔لوگ پہچان لیتے کہ شیخ صاحب نماز پڑھ کر مسجد سے آ رہے ہیں۔کبھی کبھی جمعہ کی نماز کے بعد مسجد میں لوگوں کو درس قران دیتے۔

شیخ صاحب شیخ نورالدین نے چار شادیاں کیں۔ان کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ وہ خوش خوراک اور بڑے فراخ دل تھے۔ سردیوں کے موسم میں ایک بڑے کڑاہ میں ملتان کا مخصوص سوہن حلوہ تیار کرواتے اور تمام جاننے والوں میں تقسیم کرتے۔ ہر فصل کی آمد پر گاؤں کی تمام بیواؤں کو ان کی ضرورت کے مطابق گندم اور چنے تقسیم کرتے۔کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بھی ان کی دیگر ضروریات کا خیال رکھتے۔ان کی ہر ضرورت کو ایک کاپی پر تحریر کرتے رہتے۔جب پینشن لینے شہر جاتے تو ہر بیوہ کی ضرورت کی دیگر اشیاء بھی خرید کر لا دیتے۔

شیخ نورالدین، دلیپ سنگھ ولد رنجیت سنگھ (مہاراجہ رنجیت سنگھ) کے وزیر، ہیرا سنگھ کے ذاتی دوستوں میں شمار ہوتے۔ وہ ہیرا سنگھ سے ملنے اکثر لاہور جاتے۔شیخ صاحب کے دو بھائی خالصہ فوج کی جانب سے انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ان کا ایک بھائی

فسادات کی نذر ہو گیا۔

شیخ صاحب اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔شیخ نورالدین اپنے والد کی جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کے واحد وارث رہ گئے۔ ہیرا سنگھ وزیر کی دوستی اور اعتماد کی بنا پر شیخ نورالدین صاحب سکھ حکومت کی جانب سے اٹک میں منتظم اعلیٰ ’امیر پرگنہ‘ کاردار کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔اور انتظامی امور کی اہمیت کے پیش نظر اٹک میں ہی رہائش پذیر رہے۔ایک شادی اٹک میں کر لی۔ یہ شادی ایک انتظامی معاملہ کو نپٹانے کے باعث ہوئی۔

ایک مداری کہیں سے آیا اور اٹک شہر کے باہر خیمے ڈال دیے۔ وہ شہر ہر گلی محلے ڈگڈگی، بانسری بجا کر بچوں کو ریچھ اور بندر کے کرتب دکھاتا۔اسے نہ تو ٹھیک سے ڈگڈگی بجانی آتی نہ ہی بانسری، اس کا سانس جلد پھول جاتا اور کھانسنے لگ پڑتا۔ بندر اگلے ہاتھوں پر چل کر مجمع کا پورا چکر لگاتا ریچھ بھی بندر کے پیچھے پیچھے دونوں ہاتھوں پاوں کو زمین پر باری باری پٹخ کر ڈانس کرتا۔ مداری دونوں جانوروں کے کرتب دیکھاتا، بندر کو کہتا کہ شادی کی خوشی کس طرح مناؤ گے۔شادی کا سنتے ہی وہ الٹی سیدھی چھلانگیں لگاتا۔ بچے اسے چھلانگیں لگاتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ مداری بندر کو کہتا کہ سسرال کس طرح سے جاؤ گے ذرا چل کے دکھاو۔ بندر سر پر ٹوپی رکھ کر، دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر باندھ لیتا اور اچھلتا ہوا، ٹھہر ٹھہر کر قدم زمین پر رکھ کر چلتا۔وہ ریچھ کو کہتا گانے کی دھن بجائے، ریچھ دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو کر سینہ کو ایک ہاتھ سے تھپتھپاتا اور دوسرے ہاتھ کو سیدھا سامنے رکھ لیتا گویا وہ دُھن بجا رہا ہے۔کرتب دکھانے کے بعد مداری زمین پر چادر بچھا کر لوگوں سے مانگتا، جو کچھ بھی خیرات میں ملتا لیکر دوسرے محلے میں چلا جاتا اور وہاں پر بھی یہی تماشہ دہراتا۔اور سر شام خیمے میں واپس لوٹتا۔

ایک روز شہر کا منچلا نوجوان، اُن خیموں کے پاس گھوڑے پر سوار گزرا۔ مداری کی بیٹی کو اکیلا پا کر اس کی جانب آیا۔لیکن کتے نے اسے خیمے کے نزدیک پھٹکنے نہ دیا۔نوجوان کی زمینیں خیمے کے نزدیک تھیں۔اُس نے خفت میں اہل دیہہ کی جانب سے منتظم اعلیٰ ’امیر پرگنہ‘، اٹک شیخ نورالدین کو شکایت کی۔ کہ مداری کے پالتو جانور آے دن، ان کی فصلوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔اور ان کے جنگلی جانور راہ گیروں کے لیے مصیبت کا باعث ہیں، ان کو وہاں سے ہٹایا جائے۔شیخ نورالدین نے کوتوال شہر کو ساتھ لیا اور بذات خود شہر سے باہر ان کے خیموں کی جانب چلے گئے۔

مداری کی بیٹی شہر گھگو گھوڑے بیچنے نہ گئی تھی، کیونکہ اسکا باپ مسلسل سفر کی تھکان سے بیمار پڑ گیا تھا۔ وہ تیمار داری میں مصروف وہم و خیالات میں گم بیٹھی تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی میدان میں کھیل رہے تھے۔ کہ کتے کے بھونکنے نے اسے باہر کی جانب متوجہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک چوبدار سرکاری وردی پہنے خیمہ سے دور کھڑا ہے۔ مداری کی بیٹی نے کتے کو خاموش کروانے کے بعد، خیمہ کے اندر سے ہی سوال کیا۔

''کیوں کھڑے ہو۔۔۔۔۔کسے ملنا ہے ؟''

''امیر پرگنہ کاردار صاحب تشریف لائے ہیں۔ ریچھ والے مداری کو بُلاتے ہیں۔''

''وہ نہیں آ سکتے۔ ان کی طبیعت ناساز ہے۔۔۔ کاردار صاحب کو ان سے کیا کام ہے؟''

اس نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''امیر پرگنہ کاردار صاحب بات کرنا چاہتے ہیں، کسی کو بھیجو''

چوبدار نے وہیں سے کھڑے کھڑے جواب دیا۔

گھگو گھوڑے بیچنے والی لڑکی چادر میں لپٹی امیر پرگنہ کاردار کے سامنے آئی۔

لڑکی کورنش بجالاتے ہوئے بولی۔

''سلام حضور۔''

''مداری کو بھیجو، اُس سے بات کرنی ہے۔'' امیر پرگنہ نے اس سے کہا۔

''پچھلے چند روز سے ان کی طبیعت ناساز ہے۔ حکیم صاحب نے انہیں آرام کا مشورہ دیا ہے۔''

''اچھا والدہ کو بلاو۔''

''وہ حکیم سے دوائی لینے شہر گئی ہے۔''

وہ بغیر گھبرائے بڑے اعتماد کے ساتھ امیر پرگنہ سے بات کر رہی تھی۔ ایک وقفہ کے بعد بولی۔

''فرمایئے، شاید میں ہی آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔''

''اہل دیہہ نے شکایت کی ہے کہ تمہارے جانور فصلوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ راہگیروں کے لیئے مصیبت ہیں۔ اور مطالبہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو یہاں سے ہٹایا جائے۔''

''۔۔جی ی ی۔۔جی۔۔۔''

حیرانگی سے اس کے منہ سے ایک لمبی جی نکلی۔ شکایت کا سن کر وہ پریشان ہوگئی۔ اس نے اپنے

جانوروں کی جانب دیکھا۔ وہ سکون سے بیٹھے جگالی کر رہے تھے، ریچھ اور بندر خاموش سو رہے تھے۔ کتا اس کے پاس خاموش بیٹھا تھا۔

''ہم تو شہر سے دور جنگل میں بیٹھے ہیں۔ کسی کے لیئے رکاوٹ کا باعث نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ہمارے جانور پانچ ہی تو ہیں۔ بکری اور گدھا بندھے ہیں۔ ریچھ اور بندر سو رہے ہیں کتا خاموش میرے پاس بیٹھا ہے، کسی کو بھی تنگ نہیں کر رہے۔ ہمارے جانور نہ تو کسی کو خوف زدہ کرتے ہیں نہ کسی کی فصل کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ خیمے کھیتوں سے دور ہٹ کر ہیں۔ ہم کسی کے لیئے رکاوٹ کا باعث نہ ہیں''

امیر پرگنہ کاردار گھوڑے سے اتر آئے۔ اور درخواست اسکی جانب بڑھائی۔

''یہ درخواست تم خود پڑھ لو!''

اب امیر پرگنہ کا انداز تکلم بدل گیا تھا۔ لڑکی انہیں بھا گئی تھی۔ وہ اس سے کسی بہانہ مزید گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ رُعب دار لہجے کی بجائے انہوں نے ایک نرم گفتار شہری کا انداز اپنا لیا تھا۔

''معاف فرمایئے میں پڑھ نہیں سکتی۔۔ آپ ابا حضور سے ان کے خیمہ میں آ کر بات کر لیں۔ وہ آپکو مزید مطمئن کر دیں گے۔''

شیخ صاحب نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

''آپ کون لوگ ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔''

یہ سوال سن کر وہ گھبرا گئی۔ اس کا منہ خشک ہوگیا۔ اس کی رنگت بدل گئی۔ وہ اس سوال کا جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ لیکن ہمت کر کے بولی۔

''آپ خیمے میں تشریف لے چلیں میرے بابا حضور وہیں چارپائی پر آرام فرما رہے ہیں۔ میرے بابا آپ کو مطمئن کر دیں گے۔''

اس کی آواز اب دور سے آ رہی تھی۔ شیخ صاحب امیر پرگنہ نے گھوڑا چوبدار کے حوالہ کیا۔ کوتوال کو لیے لڑکی کے ساتھ ہو لیے۔ یہ ایک کم اونچائی والا چھوٹا سا گول خیمہ تھا۔ وہ جھک کر اندر جا سکے۔ ایک بوڑھا لاغر شخص چارپائی پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ ایک اجنبی کو خیمہ میں آتا دیکھ کر اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر شیخ صاحب نے اسے اُٹھنے سے روک دیا۔ اور خود ساتھ بچھی دوسری چارپائی پر بیٹھ گیئے، کوتوال بھی ان کے ساتھ اسی چارپائی پر بیٹھ گیا، امیر پرگنہ نے اسے کہا۔

’’اہل دیہہ کی جانب سے انہیں درخواست موصول ہوئی ہے، کہ تمہارے جانوران کی فصلوں کو اُجاڑ رہے ہیں اور جنگلی جانور لوگوں کو ہراساں کر رہے ہیں۔‘‘

مداری نے ایک اچٹتی نگاہ درخواست پر دوڑائی، اس نے درخواست امیر پرگنہ کی جانب واپس بڑھاتے ہوئے کہا۔

’’حضور یہ درخواست! یہ ایک جھوٹ کا پلندہ ہے۔‘‘

اور اس کے ساتھ ہی وہ خاموش ہو گیا۔

’’تم بات کرو خاموش کیوں ہو گئے ہو‘‘۔

اس نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر پرگنہ کی توجہ دلائی۔

’’حضور ملاحظہ فرمائیں، زمیندار اپنے ریوڑ اور جانور لیئے دور سڑک سے گزر رہے ہیں۔ یہ اعلیٰ نسل کا کتا ہے ابھی تک کسی راہ گزرتے جانور پر غرایا تک نہیں۔ خیمہ کے سامنے خاموش بیٹھا چوکیدار کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ بس کسی جانور یا غیر متعلقہ شخص کو خیموں کی جانب بڑھنے نہیں دیتا۔ جس کے لیے اس کا کھلا رہنا ضروری ہے۔‘‘

شیخ صاحب نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔

’’اچھا، میں نے مان لیا کہ یہ درخواست کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے لیکن یہ بتائیں آپ کون لوگ ہیں؟ اور یہاں پر کیسے آئے؟‘‘

شیخ صاحب نے اپنا اور کوتوال کا مختصر تعارف دوبارہ کروانے کے بعد اپنا سوال دہرایا۔

’’میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کون لوگ ہیں۔ اور یہاں پر کیسے آئے۔‘‘

لاغر شخص نے بڑے اعتماد کے ساتھ شیخ صاحب سے بات کرتے ہوئے کہا۔

’’میں ایک غریب آدمی ہوں۔ میرا کوئی وطن نہیں اب محنت مزدوی کرنے سے قاصر ہوں شہر بہ شہر جا کر جانوروں کے کرتب دکھا کر روزی کماتا ہوں۔ پچھلے دو روز سے جسم میں اینٹھن اور نقاہت کی وجہ سے کچھ کما کر نہ لا سکا ہوں اور کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہے۔ بیٹی بھی گھگو بیچنے نہیں جا سکی۔۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی کہ کیا کیا جائے۔‘‘

کوتوال نے غصہ کے عالم میں کھا جانے والی نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور گرجدار آواز میں غرا کر بولا۔

’’تم دروغ گوئی سے کام لے رہے ہو۔ سچ بتاؤ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو اور کہاں جا رہے ہو۔‘‘

’’میں درست کہہ رہا ہوں۔ یہ جنگلی جانور ایک روز میں سدھائے نہیں جا سکتے۔ میرے والد بھی یہ کام کرتے تھے‘‘۔

’’میں کوتوال شہر ہوں اور آپ امیر پرگنہ ہیں۔ تم پھر دروغ گوئی سے کام لے رہے ہو مجھے سچ اگلوانا آتا ہے‘‘۔

’’جی میں جانتا ہوں مجھے دختر نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔‘‘

’’سچ بتاؤ تم کون ہو اور کدھر سے آ رہے ہو، اور کہاں کا ارادہ ہے‘‘۔

اب کی بار مداری سوچ میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد رازدارانہ انداز سے شیخ صاحب سے مخاطب ہوا۔

’’میرا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ میں شہنشاہ جہانگیر مرزا نورالدین بیگ محمد خان سلیم کی ساتویں پشت پڑپوتا ہوں۔ ہماری رہایش لال قلعہ دہلی میں تھی کہ فرنگی افواج نے قلعہ کے مکینوں کو بلا امتیاز قتل کرنا شروع کر دیا۔ ہم جان بچا کر راہ فرار اختیار کر آئے ہیں۔ میں نے یہ جانور اور ساز و سامان، ڈگڈگی وغیرہ ایک مداری سے خریدے ہیں۔ اب شہر بہ شہر دو چار روز رک کر آگے بڑھ جاتا ہوں۔ اور کابل کا ارادہ کیئے ہوا ہوں۔‘‘

امیر پرگنہ شیخ نورالدین حالات کا جائزہ لیکر واپس چلے گئے اور درخواست کو ’مبنی بر دروغ‘ لکھ کر داخل دفتر کر دیا۔

یہ ان کی اُٹھتی جوانی کا زمانہ تھا۔ زُورِ شباب اور رومانوی طبعیت کے ساتھ انہیں لڑکی اور اسکے باپ کی باتیں بھلی لگیں۔ دوسرے روز پھر آئے اور ہمراہ تازہ پھلوں کا ٹوکرا لائے اور مغل شہزادہ سے بچی کا رشتہ مانگ لیا۔ مغل شہزادہ نے ٹوکرا واپس کر دیا اور رشتہ دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

’’بیٹا ہم اپنے بچوں کے رشتے مغل خاندان میں ہی کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ہاں نہیں کر سکتا‘‘۔

شیخ نورالدین یوں شکست کھانے والوں میں سے نہ تھے۔ وہ مداری سے رشتہ لینے پر اصرار کرنے لگے۔ اور روزانہ مغرب کے بعد خیمے پر پہنچ جاتے۔ مداری نے ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے

سوچنے کی مہلت مانگ لی اور رات کی تاریکی میں اٹک شہر کی بجائے میانوالی کی جانب بڑھ گیا۔

دوسرے روز شیخ نورالدین آئے تو دیکھا کہ مداری مغل شہزادہ وہاں سے خیمے اُکھاڑ کر رات کی تاریکی میں کسی جانب نکل گیا ہے۔ نورالدین گھوڑے پر سوار اُن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہر سو تلاش کرتے انہیں پنڈی گھیب میں جالیا۔ اور لڑکی کے والد سے پھر رشتہ دینے پر اصرار کیا۔ شیخ نورالدین اُس کی منت سماجت کرتے میانوالی تک گئے۔ جہاں دریائے سندھ عبور کرنے سے پیشتر مغل زادے نے بچی کے نقد شرعی حق مہر کے عوض رخصتی پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ وہیں پر جامع مسجد کے امام کے سامنے نکاح پڑھایا اور نقد حق مہر ادا کر کے لڑکی کو ہمراہ لیے واپس اٹک آگئے۔ اُس مغلانی کے بطن سے ایک بیٹا امام دین اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ دوسری بچی کی پیدائش کے دوران ماں اور بیٹی دونوں فوت ہو گئیں۔

خالصہ فوج کی فرنگی فوج سے شکست کے بعد ریاست پنجاب کا انتظام خالصہ حکومت کے ہاتھوں میں نہ رہا۔ انگریزی حکومت کی عملداری بھی مضبوط نہ ہوئی تھی، خالصہ نظام حکومت ختم ہو گیا۔ ہر جانب افراتفری اور لاقانونیت پھیل گئی۔ خالصہ پولیس اور عدالتوں کے منصف روپوش ہو گئے یا قتل کر دیے گئے۔ ہر شخص اب اپنی جان بچانے کی فکر میں لگ گیا۔ عوام نے لگان، اور محصولات دینے بند کر دیئے۔ ایک شب باغیوں نے حملہ کر کے خزانہ لوٹ لیا۔ حالات روزانہ کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے گئے۔ سکھ انگریز سپاہیوں کو تلاش کر کے قتل کرتے، اور ان کے سر کو تن سے جدا کر کے ایک طشتری میں سجا کر انگریز حکمرانوں کو پیش کر دیتے۔ جواب میں انگریزی فوج نے بھی خالصہ فوجیوں کے سر قلم کر کے دلیپ سنگھ کو پیش کرنے شروع کر دیئے۔ انجام کار فرنگی فوج سے ایک جھڑپ کے دوران شیخ صاحب کا مہربان دوست ہیرا سنگھ وزیر بھی مارا گیا۔ خزانہ پہلے ہی لوٹ لیا گیا تھا۔ مجبوراً شیخ نورالدین تین رات کے سفر کے بعد گاؤں آگئے۔

شیخ صاحب نے اپنا پیدائشی نام صدرالدین سے بدل کر نورالدین رکھ لیا۔ جب کوئی پولیس کا سپاہی یا کوئی انگریز فوجی صدرالدین کو تلاش کرتا گاؤں پہنچتا۔ تو اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا جاتا کہ یہاں صدرالدین نامی کوئی شخص نہیں رہتا۔ نورالدین صاحب نے اپنی پہلی بیوی کو پرانے مکان میں ہی رہنے دیا۔ اور جانوروں کے کمرے کی خوراک بھوسہ اور خشک ٹانڈے وغیرہ دوسری جگہ منتقل کر کے اپنی رہائش مغلانی کے ہمراہ اُس کمرہ میں رکھ لی۔

بعض روایات کے مطابق جو خزانہ لٹیروں سے بچ گیا وہ تین لوہے کی پیٹیوں میں بھر کر اپنے ہمراہ لائے۔ لیکن اس خزانہ کا علم نہ ہو سکا کہ وہ کس طرح استعمال ہوا۔ مغل شہزادی نے گاؤں پہنچ کر شیخ برادری کے تمام بچوں کو اکٹھا کیا اور انہیں تعلیم کی جانب راغب کرنے کے لیے بچوں کو روزانہ پڑھائی کے بعد گڑ کی ایک ڈلی دیتی۔ بچے گڑ کی لالچ میں روزانہ آجاتے۔ مغلانی انہیں فارسی اور عربی کا سبق دیتی۔ کبھی کبھی وہ شیخ صاحب کو بھی مجبور کرتی کہ وہ بچوں کو پہاڑے یاد کروائیں۔ ایک سال کی محنت کے بعد تمام بچے پانچ تک کا پہاڑہ یاد کر چکے تھے۔ اور انہیں فارسی کے حروف تہجی اور الفاظ کو جوڑنا آگیا۔ اگلے سال مغل شہزادی نے چھوٹے بچوں کو کھانا کھانے کے آداب سکھائے اور قران پاک پڑھانا شروع کر دیا۔

شیخ نورالدین صاحب اپنے ایک عزیز غلام حسین، ہیڈ ماسٹر، ایم۔ بی۔ ہائی سکول دولت گیٹ ملتان کے پاس چلے گئے۔ غلام حسین صاحب نے انہیں سکول میں ٹیچر ملازم رکھ لیا۔ ملتان میں انہوں نے غلام حسین کی بیٹی سے تیسری شادی کی جس سے ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں شیخ غلام حسین کی ریٹائیرمنٹ پر اسی سکول میں ہیڈ ماسٹر تعینات کر دیا گیا۔ شیخ نورالدین برادری کے تمام بچوں، کریم بخش، فتح محمد اور فتح دین اور فیروز دین کو اپنے ہمراہ ملتان لے گئے۔ جہاں سب کو انٹرنس کا امتحان پاس کروا کر اپنی بیٹیوں کو ان کے عقد میں دیا۔ اس طرح تعلیم کا رواج خاندان میں آگیا۔ پچاس سال کی عمر میں پینشن پا کر واپس گاؤں آگئے۔ انہیں آٹھ روپے چھ آنہ سات پائی پینشن تاحیات منظور ہوئی۔

گاؤں آ کر غلام حیدر کی بیٹی سے چوتھی شادی کر لی میرے والد نور احمد، شیخ نورالدین کی چوتھی بیوی کے بیٹے تھے۔ چوتھی بیوی سے شیخ صاحب کے دو ہی بچے ہوئے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹی دس سال کی عمر میں میعادی بخار میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی۔

نورالدین کے تمام داماد اور بیٹوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ اور سب نے اپنے بھائیوں اور بچوں کو انٹرنس تک تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ اُن کے بڑے داماد فیروز دین کے چھوٹے بیٹے محمد دین نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد قانون میں ڈپلومہ حاصل کیا اور اسی پیشہ سے منسلک ہو گئے۔ وہ ایک کامیاب وکیل بنے۔

ان دنوں انٹرنس کا امتحان دینے والے امیدواروں کی تعداد بڑی محدود ہوتی۔ پنجاب

یونیورسٹی ہال ہی امتحانی سنٹر مقرر ہوتا۔ فیروز الدین کے بڑے بیٹے محمد منور الدین انٹرنس کا امتحان دینے اپنے دیگر ہم جماعت لڑکوں کے ہمراہ لاہور آئے۔ ایک روز وہ پنجاب یونیورسٹی ہال کے سامنے اپنے کسی ہم جماعت کے ساتھ بیٹھے پرچہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ کہ ایک صاحب بگھی میں سوار مال روڈ سے گزرے۔ بگھی میں کوچوان کے پیچھے شیروانی کی طرز میں سلا کالا کوٹ پہنے، سر پر ایک اونچا کالا ہیٹ رکھے ایک صاحب کتاب پڑھ رہے تھے۔ محمد منور نے ایک راہگیر سے دریافت کیا کہ یہ کون ہے جو اتنی شان سے جا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ لاہور کے مشہور وکیل جناب سیتا رام جی ہیں، جو کسی مقدمہ کی پیروی کے سلسلہ میں کچہری جا رہے ہیں۔ انہوں نے لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کی ہے۔ محمد منور دین صاحب نے وہیں بیٹھے اعلان کیا۔

''میں بھی بیرسٹر بنوں گا۔''

محمد منور صاحب نے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اپنے والد فیروز دین اور نانا نورالدین سے لندن جا کر قانون کی ڈگری حاصل کرنے کی اجازت چاہی۔ بچے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے، والد اور نانا نے مل کر اُنہیں بار ایٹ لاء کی تعلیم کے لیے لندن بھیج دیا۔ قسمت کی ستم ظریفی محمد منور اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس آئے، مگر کچھ عرصہ ہی قانون کی پریکٹس کر سکے۔ ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو کر انیس سو پانچ عیسوی میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ فیروز دین کے بھائی محمد دین نے اپنے بڑے بھائی کی پیروی میں، اپنے شادی شدہ بیٹے محمد حمید کو لندن بار ایٹ لاء کی تعلیم حاصل کرنے کے لیئے روانہ کیا۔ شومئی قسمت وہ بھی معیادی بخار میں مبتلا ہو کر لندن میں انتقال کر گئے۔

شیخ نورالدین نے انیس سو سات میں پچھتر سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور اپنے گاؤں میں ہی دفن ہوئے۔

شیخ غلام حیدر

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت وہ چکوال میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے ایک ہی شادی کی جس سے ان تین بیٹے اللہ بخش، قادر بخش، محمد بخش اور تین بیٹیاں بھولی، ست بھرائی اور نیک بخت پیدا ہوئیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں کچھ عرصہ ملازمت کی اور ریٹائر ہو کر چکوال آ گئے اور عرائض نویس کی حیثیت سے چکوال کچہری پر پریکٹس شروع کر دی۔

ان کی تاریخ پیدائش اور وفات کا تو علم نہ ہو سکا۔ انہوں نے دینی اور دنیاوی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور قران پاک کے عالم اور مفتی کہلوائے۔ قران پاک کی رو سے فتوا بھی دیتے تھے۔

وہ جلد ہی ادھیڑ عمری میں وفات پا کر گاؤں میں دفن ہوئے۔ اکثر بزرگ ان کا نام ادب سے لیتے ہوئے کھوکھر زیر کے پرانے قبرستان کی جانب اشارہ کرتے کہ ان کا جسد خاکی یہاں دفن ہے۔ لیکن ان کی قبر کی نشان دہی کوئی نہ کر سکتا ہے۔

بھائیا جی عبدالغفور

بھائیا جی عبدالغفور مجھ سے عمر میں دس بارہ سال بڑے تھے۔ وہ والد صاحب کی پہلی بیوی سے تھے۔ بچپن سے ہی ننہال میں رہنا زیادہ پسند کرتے۔ وہاں انکا ہم عمر کوئی بچہ نہ تھا۔ سب ہی ان سے پیار کرتے۔ نانا جان کی تقلید میں پانچ وقت نماز پڑھتے۔ انہیں نعت خوانی کا بڑا شوق تھا۔ اکثر گلی میں چلتے ہوئے نعت پڑھتے رہتے ان کی پسندیدہ نعت تھی۔

''کنی کلمے دیا مندراں پالیئے۔''

نعت کو وہ اونچی آواز میں ہر وقت پڑھتے۔ گلی میں نعت پڑھنے سے انہیں روزانہ ہی منع کیا جاتا لیکن انہیں یاد ہی نہ رہتا کہ وہ گلی سے گزر رہے ہیں یا کہ گھر میں بیٹھے ہیں۔ وہ خاموش نہ بیٹھ سکتے۔ نعت آہستہ یا اونچی آواز میں گاتے یا گنگناتے ہی رہتے۔ جہاں کہیں بھی ہوتے وقت کے اندازہ سے نماز ضرور پڑھتے۔ انہیں مسجد کے امام قاضی عبدالرسول نے چند ایک چلے پورے کروائے، اور نماز کے اوقات کے تعین کا طریقہ بتایا کہ ہاتھ کو پھیلا کر سایہ کو ماپ لو اگر وہ دو بالشت سے کم ہے۔ تو ظہر کی نماز کا وقت ہے۔ اور اگر سایہ دو بالشت ہے، تو عصر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ ہر وقت وہ ہاتھ کے سایہ کو ماپتے ہی رہتے۔ کہ اب کونسی نماز کا وقت ہے۔ ان کا لباس صاف ہو یا نہ ہو پاک ضرور ہوتا تھا۔ پسندیدہ لباس تہمد اور کرتا تھا وہ ہمہ وقت سر پر پگڑی باندھتے۔

ایک بار وہ مسجد کی جانب نعت پڑھتے جا رہے تھے۔ کہ دوسرے محلّہ کے لڑکوں نے انہیں گھیر لیا۔ اور نعت پڑھنے سے منع کیا۔ وہ ایک منٹ کے لیئے خاموش ہو گئے۔ جب لڑکے چلے گئے۔ تو وہی نعت دوبارہ پڑھتے مسجد کی جانب چل دیئے۔ چار پانچ لڑکے پھر لوٹ آئے اور انہیں

گھیرنے کی کوشش کی۔انہوں نے دوڑ کر گلی میں حوض پر پاوں رکھا اور ہمسایوں کے گھر کود گئے۔
اور پتھر اٹھا کر حملہ آوروں کو مارا، پتھر ان میں سے ایک کو لگا۔لڑکا زخمی ہو کر چلانے لگ گیا اور باقی
بھاگ گئے۔اس چھوٹی سی جھڑپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ان کو دلیر نڈر اور بہادر سمجھنے لگ گے۔
پانچویں جماعت کے بعد انہوں نے دسویں تک تعلیم ماموں کے پاس لاہور میں رہ کر حاصل کی۔
دسویں جماعت میں والد صاحب نے انہیں لاہور سے واپس سیالکوٹ بلا لیا۔

بھائیا جی روزانہ الٰہی بخش پہلوان کے اکھاڑے میں کشتی کرنے جاتے دیر تک ڈنڈ پیلتے اور
اُٹھک بیٹھک کرتے۔الٰہی بخش رستم ہند بوڑھا ہونے کے باوجود روزانہ اکھاڑہ آتا۔وہ اب
ورزش بھی نہ کر سکتا تھا۔البتہ اپنے شاگردوں کو داو پیچ سکھاتا۔اور انہیں اپنی جوانی کے قصے لہک
لہک کر سناتا۔اُس کی تمام زندگی اکھاڑہ میں ہی گزری تھی۔وہ، ہر نئے شاگرد کو اپنے اکھاڑے کے
تجربے سناتا۔اکھاڑے سے باہر کی دنیا سے تو وہ واقف نہ تھا۔وہ تیزی سے 'کڑنگڑی' اور 'شکنجہ
ڈالنے، 'ڈھمی'، 'کینچی'، 'دھوبی پٹڑا' اور 'دھول' مارنے اور ان سب کا 'توڑ' جاننے پر بڑا فخر کرتا
اور شاگردوں کو بڑی محنت اور مہارت سے سکھاتا۔ورزش کرنے کے بعد شاگردوں کو نصیحت کرتا
کہ بیٹا گھر جا کر ایک سیر دودھ میں کالی مصری طباشیر اور چھوٹی الائچی ڈال کر ضرور پینا۔اس سے
جگر میں ورزش کی گرمی کا اثر نہیں ہوگا۔

رستم ہند کی کشتی اس نے 'کڑنگڑی' بائیں کی بجائے دائیں بغل میں ڈال کر جیتی تھی۔
شاگردوں کو بتاتا کہ کس طرح سے 'کرنگڑی' ڈال کر دوسرے ہاتھ سے مدمقابل کو اُٹھاتے ہیں۔
اپنی تمام یادگار کشتیاں لمحہ بہ لمحہ اپنے شاگردوں کو روزانہ سناتا۔فلاں جگہ فلاں سکھ سے فلاں ہندو،
اور فلاں پہلوان سے کیسے جیتا تھا۔وہ بڑے فخر سے آخری 'فینل' کی کشتی جو اسے لمحہ بالمحہ ازبر تھی
ہر نئے آنے والے کو روز ہی سناتا۔

''کشتی دیکھنے کے لیئے نواب آف پٹیالہ بذات خود آئے تھے۔اور رستم ہند کے خطاب سے نوازا
تھا۔شاید آپ کو معلوم نہ ہو مجھے ایک فارسی میں لکھا 'سرٹیفکیٹ'، چاندی کا 'گرج' اور پنج ہزار روپیہ
نقد انعام ملا تھا۔''

وہ نواب آف پٹیالہ کا بڑا مداح تھا۔اپنے پٹھے ناصر پہلوان پر بھی بڑا فخر کرتا۔اس کا یہ شاگرد کچھ
عرصہ پیشتر رستم پنجاب کی کشتی جیتا تھا۔

بھائیا جی دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد بھی روزانہ بلا ناغہ الٰہی بخش کے اکھاڑہ میں
ورزش اور کشتی کرنے جاتے۔ بھائیا جی روزانہ مغرب سے پیشتر گھر آجاتے، ایک روز وہ دیر سے
گھر آئے تو والد صاحب نے اس کی وجہ پوچھی، انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ فوج میں لیفٹیننٹ
کے اگلے مرحلہ کے لیے منتخب ہو گئے ہیں۔اس سلسلہ میں وہ دوستوں سے کامیابی کے لیے دعا
کروانے اور ملنے گئے تھے۔اگلے روز وہ ڈیرہ دون چلے گئے۔وہاں سے ساتویں روز واپس
لوٹے۔وہ لیفٹیننٹ منتخب نہ ہو سکے تھے۔

بعد میں وہ فوج میں حوالدار کلرک بھرتی ہو گئے۔ان کا پریڈ گراونڈ سکول کے پاس ہی تھا۔
ہم دونوں بھائی ان کی پریڈ دیکھنے چلے جاتے۔بھائیا جی کو ایک مختصر ٹریننگ کے بعد فیروز پور روانہ
کر دیا گیا۔چھ ماہ کی مزید ٹریننگ کے بعد اُنہیں پونا یونٹ میں رپورٹ کرنے کا حکم دیا گیا۔پونا
میں وہ پہنچے ہی تھے۔کہ ان کو یونٹ کے ہمراہ لندن بھیج دیا گیا۔لندن جانے سے پیشتر بھائیا جی نے
والد صاحب کو جو ان دنوں دہلی میں بطور پوسٹ ماسٹر تعینات تھے، خط تحریر کیا کہ، ان کی یونٹ
فلاں تاریخ کو لندن کے لیئے روانہ ہو رہی ہے۔ والد صاحب خط ملتے ہی پونا چلے گئے وہ ان کے
پاس دو گھنٹے ہی رک سکے۔بھائیا جی کو تین سو اسی روپے سفر خرچ ملے تھے، جو انہوں نے والد
صاحب کو دے دیے۔والد صاحب نے تمام روپے روتے ہوئے لیے، اور دہلی واپس جاتے
ہوئے سب روپے ریلوے سٹیشن پر فقیروں میں تقسیم کر دیے۔دوسرے روز وہ پا پیادہ ننگے پاوں
دہلی سے مہرولی گئے اور حضرت نظام الدین اولیا کے مزار پر حاضری دے کر بھائیا جی کی جلد
بخیریت واپسی کی دعا کی۔واپسی پر ان کے پاوں کے چھالے پھٹ گئے تھے۔لیکن وہ پیدل ہی گھر
آئے۔

بھائیا جی اکثر پڑھائی کم کرنے یا اُنکا حکم نہ ماننے کا بہانہ کر کے میری روزانہ پٹائی
کرتے۔ایک بار فیروز پور سے پونا جانے سے پیشتر چھٹی پر آئے، اُن کی چھٹی کا آخری روز
تھا۔تمام گھر والے ان کے ساتھ بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔میں علیحدہ بیٹھا ہوم ورک کر رہا
تھا، کہ میں خاموشی سے اُٹھ کر باہر چلا گیا۔اس روز کسی بھی بہانہ میری پٹائی نہ کر پائے تھے۔
بھائیا جی میرے یوں خاموشی سے اٹھ کر باہر چلے جانے پر بڑے غصہ میں آ گئے۔والد صاحب
سے کہا۔

''دیکھیں یہ پھر ہوم ورک چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ نالائق ہو جائے گا۔''
والد صاحب تو جانتے تھے کہ میں تو انکی مار سے بچنے کے لیے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ''اچھا''، کہہ کر خاموش ہو گئے۔

عمر کے آخری حصہ میں وہ ایک دربار کے روح رواں تھے۔ وہ ہر جمعہ کی شب اور خاص طور پر بارہ ربیع الاول کو اپنے گھر پر ختم قران اور محفل میلاد منعقد کرواتے۔

غلام فاروق

میں نے ۱۹۳۲ء، جولائی کی ۲۲ تاریخ کو آنکھ کھولی۔ والد صاحب نے میرا نام غلام فاروق رکھا۔ بھائی غلام صدیق بڑا خوش تھا کہ اسے بھی ایک چھوٹا بھائی کھیلنے کے لیے مل گیا۔ وہ مجھ سے دو سال ہی بڑا تھا۔ ہر وقت میری جانب دیکھتا رہتا اور والدہ سے میری ہر نئی حرکت کی ترجمانی کرتا۔
''بے جی دیکھو اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا ہے اور میری جانب دیکھ رہا ہے۔''
والدہ اسے کہتی۔
''یہ تم سے کہہ رہا ہے، مجھے تنگ نہ کرو پیچھے ہٹ جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔ اب تم اسے سونے دو''
وہ کبھی کبھی مجھ سے ناراض ہو جاتا اور اپنا ہاتھ میرے کان پر رکھ کر کہتا۔
''تم میرا کہنا نہیں مانتے بتاؤ میں تمہارا کان پٹوں کہ نہ پٹوں۔''
اسی طرح وہ سارا دن میرے پاس بیٹھا رہتا۔ خود بھی بوتل سے دودھ پیتا اور مجھے بھی پلاتا کبھی کبھی وہ میری بوتل بھی میرے منہ سے نکال کر سارا دودھ خود پی جاتا۔ میں ابھی ایک سال کا ہوا تھا کہ میں نے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر زندگی کی دوڑ میں قدم رکھ دیا۔ اس روز والدہ نے میرے قد کے برابر گڑ سے بنی میٹھی گوگیاں محلے کے بچوں میں تقسیم کیں۔ میرا ماموں جو پٹواری کی حیثیت سے ڈھڈیال میں ملازم تھا۔ میرے چلنے کے لیے ایک رنگین ریڑھا (Walker) لے آیا۔ جس پر ہاتھ رکھ کر چلتا رہتا اور دن رات گزرتے گئے۔
۱۹۳۶ میں میرے شعور کی آنکھ کھلی، تو مجھے اور بھائی غلام صدیق دونوں کو محلے کے ایک پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ تاکہ ہم میں گھر سے باہر رہنے کا اعتماد پیدا ہو جائے۔ میرے پاس مٹی کی دوات قلم اور تختی ہی ہوتی۔ ۱۹۳۹ میں ابھی میں تیسری جماعت میں پڑھ رہا تھا

کہ سکول کی اس برانچ کو ہائی سیکشن میں ضم کر دیا گیا۔ سکول کا ہائی سیکشن سیالکوٹ کنٹونمنٹ کے رہائشی علاقہ سے باہر تھا۔

بھائیا جی اسی ہائی سکول میں پڑھتے تھے۔ وہ ہم دونوں بھائیوں کو سائیکل پر بٹھا کر سکول لے جاتے۔ ایک روز بھائیا جی سکول نہ گئے، اُنہوں نے ہمیں سکول کی نکر پر ہی سائیکل سے اتار دیا۔ ہم دونوں بھائی ٹہلتے ہوئے چل دیئے۔ میں چل تو سیدھا رہا تھا، مگر ٹریفک سپاہی کے گھومتے مڑتے ہاتھوں کی جانب دیکھ رہا تھا، کہ فٹ پاتھ پر بنی لوہے کی رکاوٹ سے ٹکرا کر گرا۔ میں نے پیشانی پر درد اور گیلا پن محسوس کیا۔ پیشانی کو صاف کیا، ہاتھ کو دیکھا، اس پر سرخ سرخ لگا تھا۔ میں نے بھائی کو آواز دے کر بلایا۔
''بھائی دیکھو یہ لہو تو نہیں۔''
بھائی غلام صدیق نے مڑ کر پوچھا ''کہاں فاروق۔''
میں نے پیشانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا ''ادھر بھائی۔''
غلام صدیق نے میری پیشانی کی جانب دیکھا۔ وہاں سے خون رس رہا تھا۔
گھبرا کر بولا۔
''ہاں فاروق، یہ لہو ہے۔''
لہو کا سننا تھا۔ کہ میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔
بڑا بھائی غفور، میرے اس طرح چلنے کو پہلے ہی غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے فٹ پاتھ پر گرتے دیکھ کر سائیکل پر سوار واپس آ گیا۔ اس نے ہم دونوں کو دوبارہ سائیکل پر بٹھایا اور ہسپتال لے گیا۔ وہاں ایمرجنسی میں ڈاکٹر نے میرے زخم کو ٹانکے لگا کر سی دیا۔ ہم دونوں بھائیوں کو چند روز کے لیے گھر میں روک لیا گیا۔ زخم کے مندمل ہونے کے بعد ہم دونوں ہی سکول جانے سے کترا رہے تھے۔ ہمیں سکول جانے کی عادت ختم ہو گئی تھی۔ لیکن سکول جانا پڑا۔
۱۹۴۰ میں چوتھی میں پڑھ رہا تھا کہ بھنگیوں کا ایک تہوار ڈھیرنی آ گیا۔ اس تہوار کی رسم کے مطابق چھوٹے بچے بھنگیوں کے گھروں پر جاتے اور ڈھیرنی خریدنے کے لیے پیسوں کا مطالبہ کرتے۔ ہر گھر سے انہیں ایک پیسہ دو پیسے ڈھیرنی خریدنے کے لیے مل جاتے۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ تہوار شادی کا ہے یا غمی کا، اور کس واقعہ کی یاد میں منایا جاتا ہے اور ڈھیرنی کیا ہوتی ہے۔ میں بس

اتنا ہی جانتا تھا کہ ہر بھنگی کے گھر سے پیسے ملتے ہیں۔ مجھے محلّہ کے چند لڑکوں کا ایک گروپ اپنے
ساتھ لے گیا۔ ہم سب مل کر ہر بھنگی کے گھر پر کھڑے ہو کر ڈھیرنی مانگنے لگے۔
میرے لیڈر نے آواز لگائی۔
''ڈھیرنی والے آئے نے۔''
''نوسو تیر لیائے نے۔''
ابھی پہلے گھر کے سامنے اپنا مطالبہ شروع ہی کیا تھا کہ ساتھ والے گھر سے جھگڑنے کی آوازیں آنی
شروع ہوئیں۔ آوازیں سن کر سب خاموش ہو گیے۔ پہلے اونچا بولنے کی آوازیں آئیں۔ پھر تلخ
جملوں کے بعد دھنگا مشتی، گالم گلوچ اور تھپڑوں کے استعمال کی آوازیں آئیں۔ گھر کے پٹ زور
سے کھلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی دو موٹے بدرنگ بھنگی صحن میں آ کر گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں
کے گریبان چاک تھے اور دونوں کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ کمرہ کی نسبت اب میدان جنگ وسیع
ہو گیا تھا۔ جلد صحن بھی انہیں لڑنے کے لیئے ناکافی ہو گیا۔ پہلے ایک مرد گلی میں آ کر کھڑا ہو گیا اور
چلا کر بولا۔
''مرد ہو تو باہر آو۔''
دوسرے نے اندر سے آواز لگائی۔
''میں آیا۔''
باہر آنے کی بجائے پہلے اندر کمرہ میں گیا، واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس دوران اس
کی بیوی نے بڑھ کر بیرونی دروازہ کو تالہ لگا دیا۔ بھنگی نے دروازہ پر تالہ لگا دیکھ کر لاٹھی کی ٹیک لگائی
اور صحن کی بیرونی دیوار پر چڑھ گیا۔ جب وہ لاٹھی کو اوپر کھینچنے لگا تو لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔
اس کی بیوی لاٹھی کے ساتھ لٹک گئی تھی۔ اس کی بیوی نے لاٹھی کو کمرہ میں پھینک دیا۔ موٹا کالا بھنگی
بیوی سے غصہ کے عالم میں چلایا مجھے لاٹھی پکڑو، بیوی نے کوئی جواب نہ دیا، جیسے اس نے سنا ہی
نہیں۔ وہ اس دوران کمرہ کے اندر چلی گئی اور اندر سے کنڈی لگا لی۔
''میں کیا کہہ رہا ہوں، مجھے لاٹھی پکڑاو۔''
اس کی بیوی نے کوئی جواب نہ دیا۔
دوبار کی تکرار کے بعد موٹے بھنگی نے لاٹھی کے بغیر ہی باہر گلی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ دونوں اب

دوبارہ گتھم گتھا ہو گئے۔ مار کٹائی کم اور کشتی زیادہ ہو گئی۔ بن مانس کے جثّے والے میزبان نے
دوسرے مدمقابل کو دو تین بار قابو کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار وہ اس کے شکنجے سے نکل جاتا۔
مہمان بھنگی نے ایک داو ایسا لگایا کہ میزبان بھنگی زمین پر آ رہا۔ موٹے بھنگی کا مہمان داو پیچ میں
زیادہ ماہر تھا۔ اس نے دوبارا سے زمین پر پٹخا دوسری دفعہ موٹا بھنگی اینٹ کے نوک دار ٹکڑے پر گرا،
وہ درد سے بلبلا اٹھا، ہائے میری پسلی۔ وہ اٹھ نہ سکتا تھا۔ اس کا مدمقابل اسے فٹ بال بنائے
ٹھڈے مارنا شروع ہو گیا۔ اتنے میں صحن کا دروازہ کھلا اور موٹے بھنگی کی بیوی لاٹھی اُٹھائے گلی میں
آ گئی۔ اپنے خاوند کے مدمقابل کو، جو اسے لاتوں اور مکوں سے مار رہا تھا، لٹھ کی ضرب لگائی۔
دوسری بار اُسنے لاٹھی عورت سے چھین لی اور عورت کی کمر پر ضرب لگائی۔ وہ ہائے ہائے کرتی گھر
کے اندر چلی گئی۔ اور اُسے ننگی گالیاں اور بد دعائیں دینے لگی۔ اسی لاٹھی سے اس نے مدمقابل
میزبان بھنگی کی دھنائی شروع کر دی۔ زوردار لاٹھیاں مارنے کے بعد اس نے لاٹھی اپنے میزبان
پر پھینکی اور چلا گیا۔ ہم سب ڈھیرنی اکٹھی کرنا چھوڑ، دور دیوار سے لگے کھڑے تھے کہ اس کی بیوی
نے لاٹھی پکڑی اور بچوں کو للکار کر بھاگنے کا کہا۔ ہم سب ڈھیرنی چھوڑ بھاگ اُٹھے۔
مارچ ۱۹۴۱ء میں پرائمری کی چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ کہ بڑی بہن کی شادی طے ہو
گئی۔ گھر کی رونق میں اضافہ ہو گیا۔ مجھے چند دنوں کے لیے سکول جانے سے روک دیا گیا۔ میں
بہت خوش تھا۔ تمام رشتہ دار بھائی بہنیں ہمارے گھر پہنچ گئے تھے۔ میں لیڈر بنا اپنے ہم عمر رشتہ دار
بھائیوں کو لے کر سارا دن گراونڈ میں کھیلتا۔ مجھے روزانہ والدہ پہلے سے زیادہ پیسے بھائیوں کی خاطر
تواضع کے لیے دیتی۔ میں محلے کی دکان سے ٹافیاں خرید کر ان میں تقسیم کرتا۔ ایک روز بے جی نے
مجھے نئے کپڑے پہننے کو دیئے کہ نہا کر پہن لو، آج بارات آئے گی۔ نائی نے گھر کے باہر اینٹوں
سے عارضی چولہا بنا کر مٹی کی بڑی ہانڈیوں میں سالن بنایا۔ ایک بڑے کڑاہ میں گڑ کا حلوہ بھی تیار
کیا۔ سرخ کُرتی پر سفید پھولوں کے ساتھ کالی پتلونیں پہنے بینڈ نے بارات کو گھر تک پہنچایا۔ دولہا
میاں سر پر سہرا باندھے گھوڑے پر سوار آئے۔ نکاح کے بعد بارات کی کھانے سے تواضع کی گئی اور
دولہا میاں کو گھر کے اندر بلایا اور اسے کرسی پر بیٹھا دیا۔ ہمشیرہ کو کمرہ سے لا کر دوسری کرسی پر بٹھا دیا
گیا۔ رشتہ دار خواتین نے انہیں سلام کرائی پیش کی۔
رخصتی کے وقت دیکھا کہ میری دالدہ خالہ اور عزیز و اکارب عورتیں میری بہن کو گلے لگا

کررورہی تھی۔ بہن بھی رورہی تھی۔ میں بڑا پریشان ہوگیا۔ میں نے بڑے بھائی غلام صدیق سے تجسس کے عالم میں دریافت کیا کہ بے جی کیوں رورہی ہیں۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ بھائیا جی عبدالغفور نے بتایا کہ میرا خالہ زاد بھائی عبدالعزیز جوسہرا باندھے کرسی پر بیٹھا ہے۔ میری بہن سے شادی کر کے اسے ساتھ لیے جارہا ہے۔ میں شادی کوتو نہ جانتا تھا۔ مجھے اتنا سمجھ آیا کہ بھائی عبدالعزیز میری بہن کوساتھ لیے جارہا ہے، شاید بہن اسکے ساتھ جانانہیں چاہتی اس لیے رو رہی ہے، میں سخت پریشان ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ بھائیا جی عبدالغفورخود ہی بہن کے کندھوں پر ہاتھ رکھے رخصتی کے لیے اسے ڈولی کے پاس لایااور ڈولی میں بٹھادیا۔ میں بڑے غصے میں آ گیا۔ بھائیا جی عبدالغفور بے غیرت اور بزدل تو نہ تھا اب کیوں ہوگیا ہے۔ سمجھ نہ آیا، یہ کیا ماجرا ہے۔

''ہوں۔۔پتہ چل گیا''۔

میں نے دل میں سوچا۔ بھائیا ڈرپوک کہیں کا بڑا بہادر بنتا ہے۔ آئندہ میں اسے بھائیا جی ڈرپوک کے نام سے ہی پکاروں گا۔ میری آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔ میں نے جیب سے ڈیڑھ انچ کا ایک چاقو جو مجھے ایک دوست نے تحفہ میں دیا تھا، نکالا کھولا اور سیدھا کر کے کرسی پر بیٹھے دولہا سے جاٹکرایا۔ غصے سے بولا۔

''تمہیں نہیں چھوڑوں گا تم میری بہن کوکہاں لے جارہے ہو۔ ٹھہرو، میں تمہیں مزا چکھاتا ہوں۔''

چاقو والے ہاتھ کو ہوا میں لہرایا کہ میں دولہا کو اپنے چھوٹے سے چاقو سے زخمی کر دوں۔ والد صاحب جو دولہا کے پاس ہی کھڑے تھے، نے جلدی سے میرے چاقو والے ہاتھ کو پکڑلیا۔ غصہ کے عالم میں بولے۔

''فاروق تمہیں کیا ہوگیا ہے، یہ کیا کررہے ہو۔''

اس کے ساتھ ہی بھائیا جی غفور نے مجھے جپھا ڈال کر اٹھالیا۔ میں شور کیے جارہا تھا میں تمہیں نہیں چھوڑونگا۔ میں بہادر راجپوت ہوں۔ مجھے چھوڑ دو۔ کہاروں نے ڈولی اُٹھائی اور بارات چلی گئی۔

شیخ غلام حسین

میرے نانا چاچا جی شیخ ہدائیت اللہ کے دادا، شیخ غلام حسین ملتان میں ایم۔بی۔ہائی سکول

دولت گیٹ کے ہیڈ ماسٹر تعینات تھے۔ ان کے دو بیٹے کرم دین اور شمس الدین اور دو بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے میرے دادا شیخ نورالدین جو خالصہ فوج کی شکست کے بعد روپوش ہوکر گاوں آ گئے تھے، کو گاوں سے بلا کر اپنے پاس ایک ٹیچر کی حیثیت سے ملازم کرلیا۔ اور اپنی بیٹی ان کے عقد میں دی۔ انکے بڑے بیٹے شمس دین نے مڈل پاس کرنے کے بعد عرضی نویس کا امتحان پاس کیا اور عرضی نویس کی حیثیت سے وزیرآباد کچہری میں بیٹھ گئے۔ وہیں شادی کر کے وزیرآباد میں رہائش اختیار کر لی۔ شیخ کرم دین نے انٹرنس پاس کرنے کے بعد چکوال کے ایک مڈل سکول میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی۔

شیخ نور احمد

والد صاحب میاں نور احمد ایک صاحب ثروت، باحیثیت اور مالدار شخص جناب شیخ نورالدین صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ چونکہ گاوں کے سکول میں صرف پرائمری جماعت تک ہی تعلیم دی جاتی۔ مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیئے میرے دادا نے انہیں کریالہ کے مڈل سکول میں داخل کروا دیا۔ وہ ایک نوکر کے ہمراہ گھوڑے پر سوار سکول جاتے۔ اور ان کے بیشتر ساتھی کئی بار تھکاوٹ کا بہانہ کر کے ان کے ساتھ گھوڑے پر سوار سکول جاتے۔ گھوڑے پر سوار سکول جانے کا سلسلہ دادا جان کی زندگی تک ہی قائم رہ سکا۔ وہ ساتویں جماعت میں پڑھ رہے تھے، تو اُن کا انتقال ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد وہ دیگر ساتھیوں کے ہمراہ پیدل سکول جانے لگے۔ والد صاحب کے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ ان کے تینوں بھائی اور چاروں بہنیں ان کی پیدائش سے بہت پہلے کے شادی شدہ تھے۔ ان کے بچے بھی جوان اور برسرروزگار تھے ان کا ایک بھانجہ وکیل اور دوسرا تحصیلدار کے عہدہ پر فائز تھا۔ اُن کے دو بھائیوں نے ملتان میونسپل کمیٹی میں ملازمت حاصل کر کے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے تیسرے بھائی شیخ امام دین نے ریٹائیرمنٹ کے بعد گاوں میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ باپ کے انتقال پر والد صاحب کو ان کے بڑے بھائی شیخ امام دین، جن کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی، نے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ میٹرک کے بعد والد صاحب نے تعلیم کے لیے کالج میں داخل ہونے کا مطالبہ کیا۔ ان کے بڑے بھائی نے کالج میں داخل کروانے اور مزید اخراجات برداشت کرنے سے معذرت کر لی۔ اور نوکری تلاش کرنے

کا مشورہ دیا۔

والد صاحب مزید تعلیم کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ اپنے لیے کسی اور سرپرست کی تلاش میں لگ گئے۔ خوش قسمتی سے اخبار میں رئیس اعظم الہ آباد نے ہونہار مسلمان لڑکوں کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنے کا اشتہار دیا۔ والد صاحب مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے الہ آباد چلے گئے۔ جہاں چار سال گزار کر واپس آئے۔ بی۔ اے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مجبوراً نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ انہیں کوہاٹ کے ایک سکول میں سائنس ٹیچر کی ملازمت مل گئی۔ وہاں پر وہ ایک ماہ ہی کام کر سکے کہ ان کو بڑے چاچا جی نے ڈاکخانہ میں ایک کلرک کی حیثیت سے بھرتی کروا دیا۔ ساتھیوں سے زیادہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے انہیں ڈلہوزی (Dalhousie) بطور پوسٹ ماسٹر تبدیل کر دیا گیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ ڈاکخانہ شہر سے دور دوسری پہاڑی پر ایک کرایہ کے مکان میں قائم ہے۔ انھوں نے شہر کے اندر بلڈنگ کرایہ پر لیکر اپنی رہائش اور دفتر وہاں منتقل کر دیا۔ لوگوں کو مواصلات سے متعلق ہر قسم کی سہولت شہر میں ہی ملنا شروع ہو گئی۔

ڈاکخانہ کی بلڈنگ موسمی حالات کے پیش نظر مختلف ڈیزائین میں بنی تھی۔ اس کی دیوار کے بیرونی حصے میں مختلف جگہوں پر دو دو فٹ کے فاصلہ پر انگیٹھیاں بنی تھی۔ دھواں دیوار میں بنی گول چمنی کے راستہ چھت پر نکل جاتا۔ رات کے چوکیدار بیرونی دیواروں میں بنی چمنیوں میں لکڑیاں جلا کر دیواروں کو گرم کر دیتے۔ اس طرح کمرے بھی گرم رہتے اور خود بھی سردوقت گذار لیتے۔ دن کے وقت ہر شخص کمبل کے اندر ایک چھوٹے مٹی کے کٹورے کو لکڑی کے جال میں رکھ کر راکھ سے بھر لیتے۔ دہکتا کوئلہ کی تپش سے کمبل اوڑھے شخص کا دن آرام سے گزرتا۔

ڈلہوزی شہر میں بندروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ ہر وقت ہر گھر کی چھت پر بیٹھے نظر آتے۔ جب کبھی دھوپ کے لیئے کوئی کھڑکی کھولی جاتی، منٹوں میں دس پندرہ بندر کمرہ میں گھس آتے۔ اور کھانے والی تمام کچی پکی اشیا کو منہ میں بھر لیتے۔ تنگ آ کر والد صاحب نے ایک کلرک سے اس کا ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک لاعلاج مرض ہے البتہ آپ ان سے بدلہ ضرور لے سکتے ہیں۔ والد صاحب نے تجسس کے عالم میں بدلہ لینے کا طریقہ دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ بندروں کو چنے بڑے مرغوب ہیں ایک سیر بھنے چنے کچن میں ڈھیر کی صورت رکھ دیں۔ اور کوئی چھوٹی کھڑکی کھول دیں۔ ڈھیروں بندر منٹوں میں چنے کھانے آ جائیں گے۔ جب وہ چنے کھانے

لگیں تو ایک چھوٹا ڈنڈا چنوں پر پھینک دیں۔ وہ یہ سمجھیں گے کہ دوسرے نے وہ ڈنڈا مارا ہے۔ وہ اس ڈنڈا کو لیکر ایک دوسرے کو مارتے جائیں گے اور چنے بھی کھاتے رہیں گے۔ والدہ نے بتایا کہ ان کی لڑائی تو ہم نے خوب دیکھی لیکن اس کے باوجود بندر آنا کم نہ ہوئے۔ بلکہ چنے ملنے کی کے انتظار میں چھت پر بیٹھے بندروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ایک روز تنگ آ کر والد صاحب نے اپنی بارہ بور کی بندوق اُٹھائی، ایک فائیر ہوا میں کیا سب بندر بھاگ گئے۔ لیکن چند منٹوں بعد وہ سب پھر لوٹ آئے۔ والد صاحب نے بتایا کہ انہیں بندروں کے واپس لوٹنے پر بڑا غصہ آیا انہوں بندوق پھر نکالی۔ بندوق دیکھتے ہی تمام بندر بھاگ گیے۔ لیکن ایک موٹا بندر اور ایک بندریا وہیں بیٹھے رہے۔ والد صاحب نے بتایا کہ انہوں نے اس بندر کو پتھر مار کر بھگانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ مجبوراً بندوق سیدھی کی موٹے بندر کا نشانہ لیا، بندر بھاگنے کی بجائے اکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کا نشانہ لیا اور فائیر کر دیا۔ چھرے بندر کے چہرے پر لگے۔ بندریا کچھ فاصلہ پر تھی اسے کسی چھرہ نے زخمی نہ کیا۔ بندر کا چہرا تو زخمی نہ ہوا البتہ اس کی دونوں آنکھوں سے خون بہنے لگا اور درخت سے نیچے گر گیا۔ بندریا درخت سے نیچے اتری اور خاموشی سے بندر کو پکڑے چلی گئی۔ والد صاحب کو تاحیات اس موٹے بندر کو اندھا کرنے کا دکھ تھا۔ وہ موٹا بندر پھر کبھی نہ آیا۔ گو کبھی بندروں سے چھٹکارہ نہ ملا۔

ایک روز دوپہر کو ڈلہوزی شہر میں اونچے آواز والے سائرن بجائے گئے۔ سائرن کی آواز سنتے ہی تمام عملہ گھروں کی جانب دوڑا صرف ایک کلرک دفتر میں بیٹھا رہ گیا۔ باہر برآمدہ میں کھڑے لوگ ڈاکخانہ کے اندر آ گئے۔ انہوں نے دفتر کا بیرونی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ والد صاحب نے کلرک سے اس کی وجہ دریافت کی۔ تو اس نے بتایا کہ غالباً ''شیر'' یا اس کی نسل کا کوئی خونخوار جانور شہر کی جانب بڑھتا دیکھا گیا ہے۔ جس سے بچاو کرنے کے لیے سائیرن بجایا گیا ہے۔ شیر تو یہاں تک نہیں آتا، البتہ چیتا یا پاڑہ اکثر بھٹک کر کبھی کبھی شہر آ جاتا ہے۔ ڈلہوزی کے اردگرد کے دیہاتوں میں بھیڑ بکری یا کتا شکار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ جاننے کے بعد والد صاحب پریشان ہو گئے۔ والدہ اس روز گاوں سے آئے مہمانوں کو لے کر ست دھارا پہاڑ پر گئی ہوئی تھی۔ یہ پہاڑ شہر سے کچھ فاصلے پر واقع تھا۔ اس پہاڑ کے اندر ایک چٹان کی سات مختلف جگہوں سے مختلف خاصیتوں والے پانی ایک دھار کی صورت بہتے تھے۔

ان چشموں سے ایک سے گندھک ملا پانی دوسرے سے نمکین پانی بہتا۔ باقی کے تمام چشمے ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے تھے۔ والد صاحب کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے دفتر میں بیٹھے کلرک نے انہیں بتایا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، حکومت نے سیاحوں کی حفاظت کے لیے معقول انتظام کر رکھا ہے۔ اُس روز پاڑہ نے شہر کے اندر کسی جانور کو نقصان نہیں پہنچایا اور شہر کی سنسان سڑک سے ٹہلتا ہوا باہر چلا گیا۔

جون ۱۹۴۴ء میں جب ہم دونوں بھائی ابھی ساتویں میں پڑھ رہے تھے کہ والد صاحب کو نئی دہلی کے گول باغ ڈاکخانہ میں تبدیل کر دیا گیا جہاں وہ چھ ماہ رہے۔ ان چھ ماہ کے دوران والد صاحب کو کوئی چھوٹا یا بڑا مکان کرایہ پر نہ مل سکا کبھی مذہب آڑے آ جاتا تو کہیں صوبائی تعصب انکار کا موجب بن جاتا۔ ہم سب ہائی کلاسوں میں پڑھتے تھے۔ ہماری تعلیم کا سلسلہ رک گیا۔ مجبوراً والد صاحب نے تنزلی کی درخواست دے کر اپنا تبادلہ واپس پنجاب کروالیا۔

باب دوم

زمینی خداوں کے دیس میں

مئی ۱۹۴۶ء میں والد صاحب کو ریاست جموں وکشمیر کے ایک دورافتادہ شہر ہمیر پورسدھڑ پوسٹ ماسٹر تبدیل کر دیا گیا۔ یہ شہر دریائے چناب کے دائیں کنارے پر پنجاب سے نزدیک ترین اور ریاست کا آخری سرحدی شہر تھا۔ ہمیر پورسدھڑ انتظامی لحاظ سے جموں ضلع کی اکھنور تحصیل سے منسلک تھا۔ سیالکوٹ سے چارج چھوڑنے سے پہلے والد صاحب نے چھوٹے چاچا جی کو اپنے تبادلہ اور ترقی سے آگاہ کیا۔ اور ان سے درخواست کی کہ اُن کی غیر حاضری میں کچھ عرصہ کے لیے بچوں کے ساتھ رہیں۔

والد صاحب کا اندازہ تھا کہ ہندوستان کے سیاسی اکھاڑ پچھاڑ اور تنظیم نو کے سلسلہ میں انہیں واپس پنجاب بھی بھیجا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہوا تو وہ کوشش کر کے اپنا تبادلہ واپس سیالکوٹ یا پنجاب کے کسی شہر میں کروالیں گے۔ والد صاحب کا یہ خیال بھی تھا کہ ریاست جموں و کشمیر کو مُسلم اکثریت کی بناء پر پاکستان میں شامل کر دیا جائیگا۔ اس رائے کو مزید تَقوِیَت اُس وقت ملی جب حکومت ہند نے اپنے ملازمین سے ایک سوالنامہ کے ذریعہ پاکستان یا بھارت میں ملازمت کی رائے طلب کی اور حسب خواہش ریاست جموں وکشمیر سے ہندو ملازمین کے تبادلے بھارتی ہندو اکثریت والے علاقوں میں کر دیئے۔ لیکن مسلمان ملازمین کو ریاست جموں وکشمیر میں ہی رہنے دیا۔ اس کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ نے اپنی کابینہ کی سِفارش پر اِلحاق کے فیصلے تک حکومت پاکستان سے مواصلات کا اِنتظامَ سنبھالنے کی درخواست کی جسے حکومت پاکستان نے منظور کر لیا۔ ان حالات میں والد صاحب کا واپس پنجاب تبادلہ مشکل دکھائی دینے لگا۔

اس کے باوجود والد صاحب نے ریاست سے اپنا تبادلہ واپس پنجاب کروانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیا ب نہ ہو سکے۔ مجبوراً چاچا جی نے والد صاحب کو خط تحریر کیا کہ بچوں کو اب ذاتی توجہ کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنی زیرِنگرانی تعلیم دلوائیں۔ انٹرنس کے امتحان کے بعد ان کو پرنس آف ویلز کالج جموں میں مزید تعلیم کے لیئے داخل کروادیں۔ سنا ہے کہ اس کالج میں تمام اساتذہ انگریز ہیں۔ اور کالج فیس بھی برائے نام ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک چھوٹا سا مکان جموں میں خرید کر وہیں سیٹل ہو جاویں۔ چھوٹے چاچا جی کے خط کے جواب میں والد صاحب نے انہیں تحریر کیا کہ عبدالغفور اپنی یونٹ کہ ہمراہ انگلینڈ سے واپس ہندوستان پہنچ چکا ہے۔ اور اگلے ماہ کی کسی تاریخ کو ایک ماہ کی رخصت پر آپ کے پاس سیالکوٹ پہنچ رہا ہے۔ آپ بچوں کو اس کے ہمراہ ہمیر پور سدھڑ بھیج دیں۔

پنجاب سے کوئی بس جموں نہ جاتی جموں صرف ریل کے ذریعہ ہی پنجاب سے منسلک تھا۔ جموں توی کے لیے دو گاڑیاں وزیر آباد جنکشن سے چلتیں۔ ایک صبح آٹھ بجے جو سیالکوٹ سے دس بجے دن گزر کر بارہ بجے دن جموں پہنچتی، دوسری گاڑی وزیر آباد سے بعد دوپہر چار بجے چل کر سیالکوٹ سے شام چھ بجے گزرتی اور رات آٹھ بجے جموں پہنچتی۔ جموں سے ہمیر پور سدھڑ کے لیئے صرف ایک بس صبح آٹھ بجے روانہ ہوتی اور مغرب سے کچھ پہلے یا بعد ہمیر پور سدھڑ پہنچتی۔ اس طرح صبح کی گاڑی سے جاؤ یا شام کی گاڑی سے، دونوں صورتوں میں ایک رات جموں میں رکنا پڑ جاتا۔

ستمبر ۱۹۴۶ میں چاچا جی نے ہمیں بھائیا جی عبدالغفور کے ہمراہ شام چھ بجے والی گاڑی میں سوار کر دیا۔ ریل تو دو گھنٹوں میں جموں پہنچ گئی۔ جموں شہر دریائے توی کے دائیں جانب اور ریلوے سٹیشن بائیں جانب تھا۔ ریلوے سٹیشن اور جموں شہر کے درمیان صرف دریائے توی ہی حائل تھا۔ ہمارے بیشتر ہم سفر پیدل ہی شہر کو روانہ ہو گئے۔ جموں ریلوے سٹیشن پر کوئی قلی موجود نہ تھا۔ تمام سامان ہمیں گاڑی سے خود ہی اتارنا پڑ گیا۔ سامان اُتارنے اور ایک جگہ اِکٹھا کرنے تک کوئی تانگہ موجود نہ رہا، جو ہمیں جموں شہر کی کسی سرائے یا ہوٹل تک لے جاتا۔ گرمیوں کے دن تھے ریلوے پلیٹ فارم کے اندر ہی ایک پُختہ جگہ پر سامان رکھ کر سب اس کے گرد چادر بچھا کر لیٹ گئے۔

علی الصبح اَبھی اُفق پر روشنی نمودار نہ ہوئی تھی کہ ایک تانگہ سواریاں لیکر ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ یہ سواریاں صبح کی ٹرین سے پنجاب کے شہروں کی جانب جانے کے لیے آئی تھیں۔ کرایہ طے کرنے کے بعد ہم نے جلدی جلدی سامان تانگے میں رکھا۔ ہم تینوں بھائی تانگہ کی اگلی سیٹ بے جی، بھابھی، اور بہنیں تانگہ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں اور تانگہ ہمیر پور سدھڑ کے لاری اڈہ کی جانب چل دیا۔

ریلوے سٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ خاکی وردی پہنے ایک شخص نے تانگہ کو رکنے کا اشارہ کیا۔ کوچوان نے بھائیا جی کو بتایا کہ یہ ریاست کا کسٹم آفس ہے۔ اور وردی پہنے سپاہی ریاستی محکمہ کسٹم کا ملازم ہے۔ اس نے ہاتھ میں ٹارچ پکڑ رکھی تھی۔ اُس نے بھائی جان عبدالغفور کو نیچے اتر کر سامان چیک کروانے کا کہا۔ سپاہی نے ہمارے سامان کی مکمل تلاشی لینے کے بعد تانگہ کو جانے کی اجازت دی۔ سورج تو ابھی نمودار نہیں ہُوا تھا تاہم اُس وقت تک سڑک اور شہر واضح نظر آ رہے تھے۔ جموں شہر میں ہر طرف اونچے اونچے مندروں کے چمکتے کلس دور سے ہی اپنی پہچان کروا رہے تھے۔ ایک مندر تو خاص طور پر نمایاں محسوس ہوا۔ کوچوان نے بڑے بھائی جان کو دریافت کرنے پر بڑے اَدب سے نام لیتے ہوئے بتایا۔ یہ وِشنو سرکار کی دوسری اِستری باوا جی کالی ماتا کا مَندر ہے۔ ہم دونوں بھائیوں نے اِستری کے لفظ کو اردو کا لفظ سمجھا یعنی کپڑے کی سلوٹیں دُور کرنے والی لوہے کی اِستری۔ بھائی غلام صدیق نے اِستری کا لفظ دو تین بار میرے کان میں دُہرا کر اِشارہ کیا، اور مسکرا کر میری جانب دیکھا، میں بھی مسکرا دیا۔ بھائی غلام صدیق نے مَندر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے میرے کان میں کہا۔

''یہ اِستری کس کی سلوٹیں دور کرتی ہوگی۔''

''تمہاری''

میں نے جواب میں کہا۔

''تمہاری ٹیڑھی سلوٹیں سیدھی کرنے والی پہاڑی اِستری''۔

بھائیا جی نے ہمیں ڈانٹ کر خاموش ہونے کا کہا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی وہ سب کلس نظروں سے اوجھل ہو گئے کہیں کسی مسجد سے اَذان کی آواز سُنائی نہ دی البتہ مندروں میں بجائی جانے والی گھنٹیاں دُور اور نزدیک سے سُنائی دے رہی تھیں۔ کچے پکے مکانوں اور تنگ گلیوں سے ہوتے

ہوئے ہم اکھنور کے لاری اڈہ پر پہنچے۔ بہت سے لوگ بس کے انتظار میں وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ تھوڑے انتظار کے بعد بس آ گئی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ اُس کے پاس صرف دو سواریوں کی گُنجائش ہے۔ تمام ٹکٹ ایک دن پیشتر فروخت ہو چکے ہیں۔ اس نے بتایا کہ چھت پر سامان رکھنے کی کافی گُنجائش ہے۔ بھائیا جی نے وہی دو ٹکٹ خرید لیے۔ گھر کا جُملہ سامان ہم سب نے مل کر گاڑی کی چھت پر رکھ دیا۔ بھائی جان نے مجھے اور غلام صدیق کو گاڑی میں سوار ہونے کا کہا۔ بڑے بھائی عبدالغفور اُن کی بیگم، دونوں بہنیں اور والدہ سب جمّوں شہر میں ہی رُک گئے۔

جمّوں سے ہمیر پور سدھڑ تک ڈاک پُہچانے کا کام محکمہ ڈاک وتار نے اس بس کے مالک کے سپرد کر رکھا تھا۔ اس خدمت کے عوض اسے دو گیلن پٹرول روزانہ کنٹرول ریٹ پر مل جاتا۔ پٹرول بلیک میں کہیں دستیاب نہ تھا۔ دو گیلن پٹرول ساٹھ میل کے دوطرفہ سفر کے لئے بہت کم تھا۔ اِس کمی کو دُور کرنے کے لئے گاڑی کا مالک مٹی کا تیل ملا کر پٹرول کی مقدار بڑھا لیتا۔ اس کے علاوہ بس کی بغل میں ایک گیزر نما گیس پلانٹ لگوا کر بھاپ کی طاقت سے بھی مُستفید ہوتا۔ مُقررہ وقت پر گاڑی کو پٹرول اور مٹی کے تیل کے محلول سے سٹارٹ کیا اور پھر بھاپ کی مدد سے بس کو دس بارہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھایا۔

جموں سے اَکھنور تک کی سڑک بظاہر تارکول سے بنی تھی لیکن اس کی حالت کچی سڑک سے بدتر تھی۔ بارشوں کی وجہ سے جگہ جگہ گڑھے بنے تھے۔ ہم نے اَکھنور تک کا بیس میل کا سفر اِنتہائی سُست رفتاری سے دو گھنٹہ میں طے کیا۔ دوپہر کا کھانا اکھنور کے ایک ہوٹل میں کھایا۔ پانی پیا تو خواہش کے باوجود پانی کا پورا گلاس پہلی کوشش میں نہ پی سکا، وہ سیال برف تھا۔ زبان اور حلق سیال برف کی ٹھنڈک سے جل گئے۔ ہوٹل کا مالک علی الصبح پانی دریا سے لایا تھا۔ جو دوپہر تک برف ہی تھا۔ ایک کوشش میں مکمل گلاس پینا ناممکن تو نہیں مُشکل ضرور تھا۔ اکھنور سے ہمیر پور سدھڑ تک تمام راستہ کچا تھا۔ اِس بارہ میل کے سفر کے بعد مسافروں کے چہرے اور کپڑوں پر مٹی کی ایک تہہ اور گاڑی کے چھت پر رکھے سامان پر دُھول مٹی کی موٹی تہہ جم گئی۔ مغرب سے کچھ پیشتر ہم ہمیر پور سدھڑ پہنچ گئے

جموں ہمیر پور سدھڑ

والد صاحب نے اپنے لیے مکان مُسلم آبادی والے علاقہ پرانا ہمیر پور سدھڑ میں کرایہ پر لے رکھا تھا۔ یہ دس مرلہ کا کُھلے صحن والا دو کمروں پر مُشتمل کچا مکان تھا۔ کمروں کے سامنے آٹھ فٹ کُشادہ برآمدے میں ایک جانب چولہا بنا تھا۔ مکان کی چار دیواری چار فٹ اُونچی تھی۔ گھر میں داخل ہونے کے لئے مرکزی دروازہ کے لیے جگہ کو خالی چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس محلّہ کے دیگر مکانات بھی تقریباً اِسی طرز میں بنے تھے کتے اور بلیاں بغیر کسی رکاوٹ کے چولہے تک پہنچ جاتے۔ دن میں اِن کو کئی بار پتھر مار کر بھگانا پڑتا۔ کچن کا تمام سامان کتوں اور بلیوں کی دستبرد سے بچانے کے لیئے روزانہ کمروں میں لے جاتے۔ ہمیر پور سدھڑ دو محلوں کی صورت میں آباد تھا پرانا ہمیر پور سدھڑ اور نیا ہمیر پور سدھڑ۔

پرانے ہمیر پور سدھڑ میں ایک سو کے قریب مکانات تھے، نوے فیصد مسلمان آباد تھے۔ ان کے مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اکثر گلیاں تنگ تھیں۔ اس محلّہ میں کوئی قابل ذکر دکان نظر نہ آئی۔ سڑک کی دوسری جانب مسلمان قصائی نے ایک دُکان چھپر ڈال کر بنا رکھی تھی۔ وہ ایک بکرا روزانہ ذِبح کرتا جو اکثر مغرب سے پیشتر فروخت ہو جاتا۔ ہنُدو اور مُسلمان دونوں ہی اِس کے گاہک تھے۔ ہنُدو گاہک مُسلمان قصائی کے ہاتھ سے گوشت وصول نہ کرتے۔ قصائی گوشت کو ایک کاغذ کی پُڑیا میں لپیٹ کر ایک علیحدہ بچھی چٹائی پر ان کی جانب لڑھکا دیتا جسے ہنُدو قیمت ادا کرنے کے بعد اُٹھا کر لے جاتے۔

ہمیر پور سدھڑ میں اکثر مسلمانوں کی مالی حالت اچھی نظر نہ آئی۔ بعض تو انتہا کے غریب تھے۔ صرف ایک لمبا کرتا اور لنگوٹا ہی ان کا لباس ہوتا۔ جو لباس زیبِ تن ہوتا وہی ان کے پاس ہوتا۔ اکثر نیلے پیلے تہمند کُھلے موٹے کھدر کا ڈھیلا کُرتا پہنے نظر آتے۔ زیادہ سردی میں دو قمیص پہنتے، اک موٹی رسی نُما دو تین گز کی پگڑی سر پر لپیٹے ہوتے۔ ان کے چہرے پرانے تانبے کی طرح مٹیالے کالے تھے۔ دِن رات کی سخت محنت و مُشقت سے اُن کے جسم لکڑی کی طرح سُوکھے ہوتے۔ عجز وانکسار کے پیکر بڑے مِلنسار، ہمدرد اور پُرخُلوص لوگ تھے۔ زیادہ تر مُسلمان محنت مزدوری، اور زراعت سے مُنسلک تھے۔ مزدوری نہ ملنے کی صورت وہ دریا کے کنارے گھاس کاٹتے نظر آتے، جو ہندو چار چھ آنے دے کر خرید لیتے۔

صوبہ جموں ہندوٗ اکثریتی علاقہ تھا۔ ریاست کا سرکاری مذہب ہندو مت تھا۔ گائے کو ذبح کرنا ممنوع تھا۔ مسجد میں اَذان دینے کی اجازت نہ تھی لیکن نماز کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ہمیر پورسدھڑ میں رہنے والے مُسلمان اگلے اور پچھلے جنم کو تسلیم کرنے لگ گے تھے۔ وہ اَگلے جنم میں بہتری کی توقع پر اِس جنم میں بھوک پیاس اور مشکلات کو بخوشی قبول کررہے تھے۔ اُنہیں ایمان کی حد تک یقین ہو گیا تھا، کہ جتنی محنت اور تندہی سے لوگوں کی خدمت کریں گے، اُتنا ہی اُن کی روح اور مادہ کا پاکیزہ ہونے کے اِمکانات زیادہ ہوں گے۔

اکھنور تحصیل کے لوگوں کی ایک خوبی رُومانوی ہوناتھی۔ ہمیر پورسدھڑ کے لوگوں کا دعویٰ تھا کہ رومانوی داستان کے ہیرو اور ہیروئن سوہنی ماہیوال کا تعلق اَکھنور سے تھا۔ موجُودہ عہد کی کلاسیکی گائیکہ ملکہ پُکھراج کا تعلق ہمیر پورسدھڑ سے بتایا جاتا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کی رسم تاجپوشی میں اسے خاص طور پر مدعو کیا گیا۔ اس علاقہ کے ہندوٗ اور مُسلمان دونوں گانے کے دلدادہ تھے۔ اَکثر نوجوان ملکہ پکھراج کی گائی غزل کا ایک آدھ مصرع ٹُوٹی پُھوٹی اُردو میں مَلکہ کی گائی ہوئی طرز میں ونجلی (بانسری) پر بجاتے۔ وَنجلی تو ہر دوسرے شخص کے پاس دیکھی۔ ایک شوقین نے ونجلی کی ایک جوڑی خرید رکھی تھی۔ وہ چلتے ہوئے بھی دونوں کو ایک ساتھ بجاتا اور کوشش کرتا کہ وہ مَلکہ پُکھراج کی گائی ہوئی غزل کی دُھن ونجلی پر بجائے۔ وہ لڑکا ہماری گلی میں سب سے آخری مکان میں رہتا۔ ہم دونوں بھائی اِس کی دُھن سننے کے شوق میں اُس کے گلی سے گزرنے کا اِنتظار کرتے۔

پرانے ہمیر پورسدھڑ میں قبرستان کے ساتھ ایک مسجد بنی تھی جس کا دروازہ درمیان میں کھلتا۔ یہی اس کی پہچان تھی۔ مسجد کا محراب اور مِینار کی تعمیر نہ کی گئی تھی۔ کمرہ کو مسجد ظاہر کرنے کیلئے میناروں کی بجائے چھت کے دوکونوں پر ایک ایک فٹ مربع اُونچی اِینٹوں کی چُنائی کی ہوئی تھی۔ چند اینٹوں کو دوفٹ اونچا جوڑ کر وضو کے لیے جگہ مختص کر رکھی تھی۔ دومٹّی کے لوٹے اور پانی کا ایک گھڑا رکھا تھا۔ اَکثر مُسلمان بغیر اذان کے، نماز وقت یا سورج کے سایہ سے اَندازہ لگا کر پڑھتے۔ جمعہ کی نماز کا رَواج نہ تھا۔

پہلی بار جب والدصاحب نے اذان دی، تو لوگ خاص طور پر دِیکھنے کے لیے آئے کہ کون آذان دے رہا ہے۔ کسی نے ہم سے دریافت نہ کیا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔

باقاعدگی سے نماز پڑھنے کا ایک اَثر یہ ہُوا کہ ہمیں دیکھ کر چند لوگ نماز پڑھنے آجاتے۔ مسجد کا کوئی مستقل امام نہ تھا۔ جُمعہ کے روز معلوم ہُوا کہ عربی کا خُطبہ کسی کو زُبانی یاد نہیں اور نہ ہی کسی کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔ ایک نمازی نے والدصاحب کو بتایا کہ اکھنور میں جُمعہ کی نماز پڑھائی جاتی ہے۔ وہ ایک دوروز میں وہاں جا کر مولوی صاحب سے خُطبہ لکھوالائے گا۔ اگلے جُمعہ حسبِ وعدہ وہ خُطبہ لکھوا لایا۔ والدصاحب نے جُمعہ کی نماز بھی شُروع کروادی۔ وہی تین چار لوگ ہوتے۔ والدصاحب عربی میں خُطبہ پڑھ کر نماز پڑھادیتے۔ پرانے ہمیر پورسدھر میں ہم دو ماہ ہی رکے جلد ہی والدصاحب نے ایک مکان نئے ہمیر پورسدھڑ میں لے لیا۔ یہ مکان بھی کوئی اعلیٰ طرز تعمیر کا مظہر نہ تھا۔ یہ دو کمروں اور نسبتاً چُھوٹے صحن پر مُشتمل تھا۔ اِس کا بیرونی دروازہ موجودتھا۔ جس کو اندر اور باہر سے بند کیا جا سکتا تھا۔ اِس کی طرز تعمیر منفردتھی۔ پہلے اِس کی چھت کو بلیوں کے سہارے کھڑا کیا گیا بعد میں گارے کی کچی دیواریں بنائی گئیں۔ اس طرز تعمیر سے چھت اور دیواروں کے درمیان خالی جگہ رہ گئی۔ اس طرح کمرے سردیوں میں اِنتہائی سرد اور گرمیوں میں سخت گرم ہوتے۔ نیا ہمیر پورسدھڑ کا گھر زیادہ صاف سُتھرا اور والدصاحب کے دفتر کے نزدیک تھا۔ پرانے اور نئے ہمیر پورسدھڑ ایک دوسرے سے ایک کلومیٹر سے کم فاصلہ پر تھے۔ دونوں کے درمیان میں ایک باغ جس میں آم کے درختوں کا ایک بڑا جُھنڈ، ایک سرکاری ڈسپنسری اور اِن دونوں کے سامنے تھانہ کی عمارت تھی۔ یہ تینوں تکون کی صورت میں ایک دوسرے سے پچاس گز کے فاصلہ پر تھے۔ نئے ہمیر پورسدھڑ بازار میں ایک جانب چند دکانیں ابھی تک زیرِ تعمیر تھیں۔ ان دکانوں میں کسی مسلمان کی دکان نظر نہ آئی۔ بازار کی پہلی دُکان ''رام داس شا'' نامی ایک ساہُوکار کی تھی۔ وہ روزانہ صبح سویرے اپنی دکان کے برآمدے میں گوبر کا پتلا لیپ کرتا دکھائی دیتا۔ ہماری مالک مکان بھی ایک ساہوکار کی بیوہ تھی۔ جس کے خاوند نے بہت سارو پیہ سُود پردے رکھا تھا۔ وہ ہر ماہ اپنے مقروضوں (آسامیوں) سے سُود کی رقم وصول کرنے جاتی اور گھر کے اخراجات پورے کرتی۔ لوگ اس کو سُروٗ کے نام سے پہچانتے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون سے اصلی نام کا مخفف تھا۔ لوگ اسے سروشانی کے نام سے پکارتے۔

بازار کے دوسری جانب ڈاکخانہ کی بلڈنگ تھی۔ جو ایک پرانے دَھرم شالہ میں قائم تھا۔ غالبًا یہی وجہ تھی کہ اس کے گرد کافی جگہ خالی رکھی گئی۔ ابتداء میں باراتوں کو یہیں ٹھہرایا جاتا۔

دھرم شالہ کے اندر تیس فٹ لمبا اور بارہ فٹ چوڑا ایک ہی کمرہ تھا۔ جس کے سامنے بارہ فٹ چوڑا برآمدہ بنا تھا کمرہ کے تین دروازے برآمدہ میں کُھلتے۔ ایک دروازہ کے سامنے کلرک بیٹھ کر ڈِیلنگ کرتا، دوسرے کے سامنے پوسٹ ماسٹر اور درمیانی راستہ آمدورفت کے لیے کُھلا رہتا۔ برآمدہ میں ڈاکخانہ کا نوٹس بورڈ آویزاں تھا۔ ڈاکخانہ میں چھ پوسٹمین، دو پیکر، ایک کلرک، ایک ہیڈ پوسٹ مین اور ایک پوسٹ ماسٹر تعینات تھے۔ اِن میں سے پانچ پوسٹمین اور ایک کلرک ہندو تھے پیکر اور چوکیدار کا تعلق شُودر طبقہ سے تھا۔ یہ سب مرکزی حکومت کے ملازم تھے۔

ہمیر پور سدھڑ کے سکول ہسپتال اور پولیس کے ملازمین سب ریاستی حکومت کے ملازم تھے۔ ان ملازمین میں نوے فیصد ہندو تھے، ان پر مرکزی حکومت کے فیصلے کا کوئی اَثر نہ ہُوا۔ مڈل سکول ہمیر پور سدھڑ کا مکھ ماسٹر (ہیڈ ماسٹر) ایک کٹر ہندو و براہمن تھا۔ وہ ہمہ وقت اپنا مخصوص مذہبی لباس پہنے ہوتا۔ پیشانی اور سینہ پر سرخ وسفید رنگ کی لکیریں ہر وقت تازہ رکھتا۔ تھانہ کے اِنچارج کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں مرکزی حکومت ہند نے ہندو ملازمین کو غیر مسلم اکثریت والے علاقہ میں تبدیل کر دیا۔ ہندو ملازمین کا تبادلہ والد صاحب کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ ایک تو وہ اکیلے رہ گئے جس کی وجہ سے انہیں پانچ چھ لوگوں کا کام خود ہی کرنا پڑ گیا۔ اس کے علاوہ ہر ہندو جو ایک پوسٹ کارڈ بھی خریدنے آتا، اُن سے تحکمانہ انداز میں وضاحت چاہتا، کہ آپ نے ڈاکخانہ کے تمام ہندو ملازمین کو ملازمت سے کیوں فارغ کر دیا ہے۔ ہر ہندو والد صاحب کو ذمہ دار ٹھہراتا۔

نئے ہمیر پور سدھڑ میں ہندو صاف سُتھرے قیمتی لباس پہنتے۔ اکثر سفید لٹھے کا چوڑی دار پاجامہ اور کیمرک یا بوسکی کی قمیض پر ایک بہت سی جیبوں والی واسکٹ جسے وہ سلوکا کہتے زیبِ تن کرتے۔ باریک ململ کی سات گز لمبی پگڑی خاص طرز اور سلیقہ سے سر کے گرد لپیٹتے۔ اُن کا لباس ہی اُن کی امارت کا مظہر تھا۔ گلیوں میں رَام رَام نمستے، جے رَام جی کی۔ ہری اوم۔ اوم تت سَت۔ ہری ہر مہا دیو کی صدائیں ہر جانب سُنائی دیتیں۔ صبح سویرے اکثر ہندو پُجاری پیشانی اور سینہ پر مختلف گہرے رنگوں کی لکیریں اور دائرے بنائے، دریا کی جانب جاتے نظر آتے۔

دیوتاؤں کے ہمراہ تعلیم

ہم دونوں بھائی اُس وقت دسویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔ ہمیر پور سدھڑ میں سکول آٹھویں جماعت تک تھا۔ نزدیک ترین ہائی سکول اکھنور یا مناور میں تھا۔ مناور ہائی سکول کا مکھ ماسٹر (ہیڈ ماسٹر) مسلمان تھا۔ ہمیر پور سدھڑ سے نزدیکی کی بناء پر والد صاحب نے ہم دونوں بھائیوں کو اکتوبر ۱۹۴۶ء میں گورنمنٹ ہائی سکول مناور میں داخل کروا دیا۔ سکول ہوسٹل میں رہائش کی پابندیاں بہت سخت تھیں۔ ایک مُسلمان باورچی نے جو شرائط بتائیں وہ شرمناک حد تک گھٹیا اور نا قابلِ برداشت تھیں۔ اس نے بتایا، کہ آپ کو اَپنے برتنوں میں سب سے آخر میں کھانا لینا ہو گا۔ ہم کسی میز پر کسی ہندو لڑکے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے۔ نیز ہم اپنا کھانا اُس وقت تک میز پر نہ رکھیں گے جب تک میز کی دوسری جانب بیٹھا آخری ہندو لڑکا بھی کھانا کھا کر اُٹھ نہ جائے۔ جلدی ہونے کی صورت میں کھانا زمین پر رکھ کے کھا سکتے ہیں۔ گویا ہمیں پیسے دے کر ایک بھکاری کی طرح کھانا لینا اور کھانا ہوگا۔ جو ہمیں منظور نہ ہُوا۔

صُبح کی اِسمبلی میں پہلے پَر ماتما کی تعریف میں لکھی نظم پڑھی جاتی پھر تمام لڑکے اَپنی اَپنی لائن میں بیٹھ جاتے اور ایک لڑکا پنڈت کا لباس پہنے گیتا کے چند اشلوک پڑھتا۔ سب طالب علم سر جُھکا کر اُسے سُنتے۔ اس کے بعد ایک لڑکا کھڑا ہو کر نعرہ لگاتا مہاراج ہری سنگھ جی کی، ہم سب اونچی آواز میں جئے پُکارتے۔ پھر کہتا راجکمار کرن سنگھ اور لڑکے کہتے ''سلامت رہے۔'' ابتداء میں مجھے لفظ ''سلامت رہے'' کی سمجھ نہ آئی کہ لڑکے کیا کہہ رہے ہیں۔ میں سب کے ساتھ مِل کر نعرہ لگاتا راجکمار کرن سنگھ جی۔ میں زور کا نعرہ لگاتا ''سنگترے''۔ اور سمجھتا کہ یہ ہندی یا سنسکرت کا کوئی لفظ ہے جو لڑکے دُعا کے طور پُکارتے ہیں۔ بھائی جان غلام صدیق کو اُن کے ایک دوست نے بتایا کہ وہ نعرہ ''سلامت رہے'' ہے۔

ہم دونوں بھائی سیالکوٹ میں دسویں تک ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اُن سے تو ہم کو کوئی مسئلہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن یہاں تو ہم دونوں بھائی مُصیبت میں پھنس گئے۔ ہندو لڑکے ہمیں شُودر سمجھتے اور نفرت کی نِگاہ سے دیکھتے ہاتھ چُھو جانے پر بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتے۔ بات بات پر ''اپرا، اپرا'' کا شور کرتے دونوں بھائی حیران تھے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ ایک مُسلمان اُستاد سے اِس لفظ کے معنی دریافت کیے۔ اُنہوں نے بتایا کہ لفظ 'اپرا'

سنسکرت، پُرش اوراپراپرکرتی کامخفف ہے،'اپرا' کے معنی گھٹیا روح،غلیظ مادہ کے ہیں۔میں ایک بار ہندو کشتری سے مارکھاتے کھاتے بچا۔ایک براہمن لڑکے نے ہاتھ چُھو جانے کی وجہ سے ملیچھ کا خطاب عطا کیا،اورسنسکرت کے چند فقرے خاص سُر میں پڑھے۔بعد میں معلوم ہُوا کہ وہ فقرے راماین کے ہیرو رام چندر جی نے سیتا کے اغواء کرنے پر راون کے لیے بددُعا کے طور پر کہے تھے۔ایک بار بڑے بھائی غلام صدیق کے ایک ترش جواب پر ایک کشتری نے کلاس کی کھڑکی سے باہر چھلانگ لگائی اور بولا کہ، میں منہاس راجپوت ہوں باہر آؤ میں تمہاری مُسلمانی نکالتا ہوں۔

''منہاس ہوتو کیاہُوا، میں بھی چوہان راجپوت ہوں''

بھائی جان نے ترکی بہ ترکی اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''پرتھوی راج چوہان کا بیٹا ہوں کسی سے نہیں ڈرتا میں آیا''

وہ تو ہم دونوں کو ایک شودر سمجھ رہا تھا۔اسے ہم سے کسی جواب کی توقع نہ تھی۔وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ شودر میرے سامنے آکر بیٹھ جائے گا اور مجھ سے مار کھائے گا۔

ہر شودر کو اسی طرح سزا دی جاتی۔وہ اپنی غلطی پر سزا دینے والے کے سامنے بیٹھ جاتا اور مار کھاتا۔ایک دفعہ والد صاحب نے کسی بات پر پیکر کو، جس کا تعلق شودر ذات سے تھا۔سخت جھاڑ پلائی۔اس نے کوئی بڑی غلطی کی تھی جس کی وجہ سے اسے ملازمت سے فارغ بھی کیا جاسکتا تھا۔وہ والد صاحب کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

''جتنا چاہیں مجھے جوتے مارلیں اور معاف کردیں۔''

''توبہ توبہ میری توبہ''

والد صاحب اپنی کرسی سے اُٹھے اور اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا۔وہ بیٹھا رو رہا تھا۔وہ ڈر رہا تھا کہ پوسٹ ماسٹر صاحب آج اسے ملازمت سے فارغ کردیں گے۔والد صاحب نے اسے معاف کر دیا۔

جب منہاس راجپوت نے ہم دونوں بھائیوں کو اُٹھتے دیکھا،تو اس کا رنگ فق ہوگیا۔اسے تو اس بات کی توقع ہی نہ تھی کہ ہم دونوں بھائی اس سے مقابلہ کرنے آئیں گے۔یہ منہاس راجپوت وہی لڑکا تھا جو روزانہ صبح اسمبلی میں پرم آتما کی مداح پڑھتا تھا۔جب اس نے مقابلہ کے

لیئے ہم دونوں بھائیوں کو اُٹھتے دیکھا تو اس کے چہرے پر غصہ کی بجائے خوف کے آثار ظاہر ہوئے۔ہم دونوں بھائی اپنی سیٹ سے اُٹھے ہی تھے، کہ اُستاد کلاس میں آگیا۔منہاس راجپوت کی بہادری کا پردہ چاک نہ ہوا، اور لڑائی ٹل گی۔اس واقعہ کا ایک اثر یہ ضرور ہوا کہ تمام کلاس کو علم ہوگیا کہ ہم شودر نہیں بلکہ چوہان راجپوت ہیں۔

''یہ کیا شور ہے۔آپ لوگ آرام سے ایک منٹ بھی نہیں بیٹھ سکتے۔''

''مہاراج اس انگریزی علاقہ سے آئے لڑکے نے مہاراج کو بھرشٹ کردیا ہے۔''فرنٹ سیٹ پر بیٹھے کلاس مانیٹر نے ٹیچر کو بتایا۔

''شما کرو مہاراج''

ٹیچر نے منہاس کو واپس بلا کر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ دونوں بھائی انگریزی علاقہ سے آئے ہیں یہ دونوں معصوم ہیں، جان بوجھ کر کسی کا اپمان نہیں کرتے۔ان کی غلطی کو درگزر کرو''۔

ٹیچر نے کلاس کو بھائیوں کی طرح رہنے کی تلقین کی۔

بعد میں وہ ہم تینوں کو مکھ ماسٹر کے پاس لے گیا اُس نے مکھ ماسٹر صاحب کو بتایا۔

''یہ دونوں بھائی انگریزی علاقہ سے آئے ہیں۔بڑے بھائی نے اس کشتری کو چھو لیا تھا۔میرے کلاس میں آنے سے پیشتر بات بڑھ کر نوبت لڑائی تک آچکی تھی۔میں وقت پر کلاس میں پہنچ گیا اور لڑائی ٹل گئی۔''

اِس پر مکھ ماسٹر صاحب، نے کہا۔

''بیٹا انہیں چھو کر متوجہ کرنے کی بجائے نام سے پکارو۔اب جاؤ اور احتیاط کرو۔اور کہا کہ آئندہ اگر کوئی شکائیت میرے پاس آئی تو میں آپ دونوں کو سکول سے نکال دونگا۔''

اِس واقعہ کے بعد پڑھائی تو ختم ہوگئی۔ہر وقت اِس سوچ میں رہتے کہ کہیں کسی سے چُھو نہ جائیں۔اب ہم نے بھی اپنے آپ کو شودر سمجھنا شروع کردیا۔دونوں بھائی کلاس میں اکٹھے ایک بنچ پر یا کسی مسلمان لڑکے کے ساتھ بیٹھتے۔یا آخر میں کسی خالی جگہ پر اَپنی کتابیں رکھے خیالات میں گم اوقاتِ کار کے ختم ہونے کا اِنتظار کر رہے ہوتے۔اِس دوران ایک اِنسپکٹر صاحب سکول دورے پر آئے اور ہماری کلاس میں تشریف لائے۔دیگر باتوں کے علاوہ اُنہوں نے سوال کیا کہ

کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ۔تمام لڑکے خاموش رہے۔ بھائی جان نے اُٹھ کر کہا۔

''ہمیں ایک مُسلم ہوسٹل چاہیے جہاں پر ہم مُسلمان لڑکے رہ کر سُکون سے تعلیم حاصل کر سکیں ۔ہندو لڑکے ہم سے نفرت کرتے ہیں اور بات بات پر اپرا اپرا کا شور کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ہم سُکون سے پڑھائی نہیں کر سکتے۔''

اِنسپکٹر صاحب سوال تو پوچھ بیٹھے لیکن مسلہ سن کر سخت پریشان ہوئے۔ان کے پاس تو اس مسلہ کا کوئی حل نہ تھا۔انسپکڑ صاحب نے سکھ ماسٹر صاحب کی جانِب سوالیہ اَنداز میں دیکھا۔اُنہوں نے جواب میں کہا۔

''یہ دو بھائی کُچھ عرصہ پیشتر انگریزی علاقہ سے آئے ہیں، یہ لڑکے ہمارے مذہبی آداب اور رسم و رواج سے مکمل نا واقف ہیں۔غیر ارادی طور پر اِیسی حرکت کر بیٹھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو مار کھانے تک کی نوبت آجاتی ہے۔ہمارے بچے بڑے تحّمل اور برداشت سے کام لیتے ہیں۔وہ اِن کی معصُوم حرکات کو اکثر درگزر کرتے ہیں۔ چند روز پیشتر ہی میں نے اُنہیں بھائیوں کی طرح رہنے کی تلقین کی تھی اُمید ہے یہ جلد اپنا مقام پہچان لیں گے۔''

اِنسپکٹر صاحب نے ہندو مُسلم بھائی بھائی کا ایک لمبا لیکچر دیا اور واپس دفتر میں چلے گئے۔شام کے وقت سکول میں اِنسپکٹر صاحب کے اِعزاز میں ایک کیمپ فائر کا بندوبست کیا گیا۔جس کی ابتداء چار سکاؤٹ نے کی، میرا نام بھی اُن چار سکاؤٹس میں تھا۔مغرب سے پیشتر مجھے ایک تحریر شدہ پیرا گراف یاد کرنے کیلئے دیا گیا۔اپنی باری آنے پر ہاتھ میں ایک مشعل لیئے خوب دلیری اور اُونچی آواز سے کسی ہچکچاہٹ ،کوئی لفظ کو فراموش کیے بغیر دُرست تلفظ میں اِنسپکٹر صاحب کے سامنے فَر فَر سُنا دیا۔باقی تینوں سکاؤٹس کو اِنچارج ماسٹر صاحب نے کئی بار لُقمے دے کر،خود بول کر، باقی تینوں کی تقریریں کروایں، پھر بھی تینوں گھبرا کر بول رہے تھے۔

پانچ ماہ کا عرصہ بڑی مُشکل میں گُزارا ، ہروقت ذِہنی تناؤ میں رہتے ، جینا دوبھر تھا۔ پیاس ہوتی تو کسی ہندو لڑکے کی منت کرنی پڑتی ، کہ وہ گھڑے سے پانی نِکال کر میرے ہاتھوں کی اَوک میں اُنڈیل دے تا کہ میں پانی پی کر اپنی پیاس بجھا سکوں۔مُسلمان گھڑا اور گلاس سُتون کی دوسری جانِب علیحدہ رکھے تھے۔گھڑا اکثر خُشک ہوتا یا اُس میں پچھلے دو روز کا بد بودار پانی ہوتا۔ پانی لانے والا ہندو تھا۔ جو مسلمان گھڑے کو چھونے اور اس کی چھینٹوں سے بھرشٹ ہو جاتا۔ وہ

کبھی پانی ڈال دیتا اور کبھی ڈالے بغیر چلا جاتا۔

چوہان راجپوت اور براہمن، پنڈت، شا

میرے راجپوت ہونے کی اڑتی خبر ہماری مالکن مکان، سروشانی تک پہنچ گئی۔اب اس کا رویہ بھی بدل گیا۔اکثر دوسری چارپائی پر بٹھا کر باتیں کرتی رہتی۔اب میں اپنے آپ کو ایک پوتر راجپوت سمجھ رہا تھا، جوان کے گھر میں گھوم پھر سکتا تھا۔سروشانی اکثر میٹھی باتوں کے علاوہ کوئی نہ کوئی کام کہہ دیتی جو میں کر ہی دیتا۔کبھی کبھار گوشت لا کر دینے کی فرمائش کرتی۔میں بھاگا بھاگا پرانے ہمیر پور سدھڑ کے مسلمان قصاب سے خرید کر لے آتا۔گوشت ایک تھالی میں رکھ دیتا جو ہمیشہ چارپائی پر صحن میں رکھی ہوتی۔

ڈاکخانہ کی ہمسائیگی میں پکوڑے بنانے کے لیے ایک ہندو دکاندار نے مٹی کا چولہا بنا رکھا تھا۔اکثر وہ مغرب سے کُچھ پہلے اِس چولہے پر بیٹھ کر کام کرتا۔مجھے اُس سے سودا خریدنے کی کبھی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ایک روز اُس نے دوپہر کو پکوڑے بنانے شُروع کر دیئے۔سردیوں کے دن تھے تازہ گرم گرم پکوڑے بنتے دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔میں نے اس سے کچھ پکوڑے خریدے۔دکاندار نے تولنے کے بعد ایک کاغذ میں لپیٹ کر مجھے مخاطب ہو کر کہا۔

''لو پکڑو''

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو اُس نے چھ اِنچ اوپر سے ہی پڑیا کو ہوا میں چھوڑ دیا۔وہ گدی پر بیٹھا پکوڑے بنا رہا تھا۔پڑیا ہاتھ پر گری۔اِس طرح سودا لینے میں مجھے ہتک محسوس ہوئی۔میرے جی میں آیا کہ پکوڑے واپس اُس کے منہ پر دے ماروں۔میں غُصہ سے بولا۔

''یہ سودا دینے کا کونسا طریقہ ہے۔نیچے گر جاتے تو کون ذُمہ دار ہوتا۔کیا میرے ہاتھوں پر غلاظت لگی تھی، کیا میں کُتا ہوں، جو تم نے سودا میرے آگے پھینکا ہے؟''

پنڈت نے میرے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔اُس نے سنسکرت کے چند الفاظ کہے، اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اَوئے سَرشٹی ۔(کمینے) مَلیچھ (گھٹیا اِنسان)۔اَپرا۔پَرکرتی (غلیظ مادہ) تم میں اتنی جرات اَپراپُرش (بھٹکی روح) ٹھہر میں تمہیں سودا لینے کا طریقہ سمجھا تا ہوں۔''

گرم تیل سے پکوڑے نکالنے والا لوہے کا چمچہ لے کر گدی سے اُترنے کے لیے مُڑا۔ پنڈت کا خیال تھا کہ میں اس کے گدی سے اترنے سے پیشتر ہی بھاگ جاوں گا۔لیکن میں بدستور غُصہ کے عالم میں کھڑا چوہان راجپوت بنا، اُس کی جانب کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اِس سے پیشتر کہ بات بڑھے پاس کھڑے ایک ہندو گاہک نے، جو مجھے پہچانتا تھا، دکان دار کو اپنی جانب متوجہ کیا اور بولا۔

''دھیرج مہاراج، شانتی، مہاراج شما کریں۔''

لیکن وہ پنڈت اس کے باوجود میری بات پر غصہ کے عالم میں تھا، اور گدی سے نیچے اترنے کے لیئے مڑا۔ وہی شخص پھر بولا:

''دھیرج مہاراج یہ باؤ کا مُنڈا کچھ عرصہ ہوا انگریزی علاقہ سے آیا ہے۔ اس کو ریاستی آداب کا کُچھ عِلم نہیں، جلد سیکھ جائے گا۔''

پھر وہ ہندُو مجھ سے مُخاطب ہُوا

'' دِیکھو پنڈت جی مہاراج تم کو پکوڑے ہاتھ میں پکڑاتے تو وہ بھرشٹ ہو جاتے جس کی وجہ سے انہیں اگنی (آگ) پر دوبارہ کام کرنے سے پیشتر اشنان کرنا پڑتا''

''بھرشٹ کیا ہوتا ہے؟''

میں نے اُلٹا سوال کیا۔اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور بولا۔

''ہمارے مذہب کے اصول سخت ہیں۔ ہم ایک باصول زندگی گزارتے ہیں۔''

میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا، وہ کون سا اصول ہے، جس پر وہ فخر کر رہا ہے۔وہ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔

''اَگنی پر بیٹھنے سے پیشتر مہاراج پوتر ہو کر کام کرتے ہیں۔ نہ وہ خود کچھ کھا سکتے ہیں نہ کسی کو چھو سکتے ہیں۔ یہ ہماری دھرم ماننا ہے۔''

''دھرم ماننا کس کو کہتے ہیں؟''

میں نے پھر سوال کیا۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ میں تو بدستور اَکڑ کر کھڑا اِس بات کی توقع کر رہا تھا، کہ پنڈت اب مجھ سے معذرت خواہ ہو گا لیکن پنڈت نے میری معصومیت کو مدنظر رکھ کر مجھے معاف کر دیا۔ اور خاموشی سے واپس اپنی گدی پر جا کر بیٹھ گیا۔اس کے چند

پکوڑے ابلتے تیل میں جل کے سیاہ ہو گئے تھے۔ میں سخت حیران ہو گیا، میری تو کوئی غلطی نہ تھی، میں نے تو اس سے پکوڑے خریدے تھے۔ اس میں کیا غیر اخلاقی یا غیر مذہبی بات تھی۔ الٹا پنڈت غصہ کے عالم میں مجھے مارنے دوڑا تھا۔ اسی ادھیڑ بن میں گم گھر آ گیا۔ اب میں اپنے آپ کو خود ہی تسلی دے رہا تھا، کہ شاید میری ہی غلطی تھی۔ اگر وہ دوسرا شخص بیچ بچاو نہ کرتا تو مجھے لوہے کے گرم چمچہ سے مار پٹتی۔ تاہم وچولی کے مختصر جواب سے مجھے معلوم ہو گیا کہ میں ایک راجپوت ہونے کے باوجود ملیچھ ہوں۔ اگر وہ پکوڑے میرے ہاتھ میں پکڑا دیتا تو وہ بھرِشٹ ہو جاتا پھر آگ پر کام کرنے سے پیشتر اسے دوبارہ نہا کر پوتر ہونا پڑتا۔

ایک بار میں اپنے کسی کام سے سروشانی کے گھر چلا گیا۔ تمام اہل خانہ کچن میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے، کچن ڈیوڑھی کے ساتھ تھا۔ میں وہیں چلا گیا۔ کچن کے باہر جوتے اتارنے کے بعد چوکے پر کھڑا ہو کر سروشانی کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ماسی جی۔۔۔۔بے جی نے۔۔۔۔۔

میں نے ابھی اپنا جملہ مکمل نہ کیا تھا، کہ سروشانی کے اہل خانہ مجھے وہاں چوکے پر کھڑا دیکھ کر یک زبان ہو کر چیخ اُٹھے۔

''ماتا جی، ماتا جی دیکھو۔ دیکھو۔ دیکھو۔ وہ ملیچھ کہاں کھڑا ہے۔''

ان لوگوں کے دل میں میرا جو مقام تھا، وہ سامنے آ گیا۔ میں بھٹکا ہوا چوہان راجپوت نہیں بلکہ میں تو ایک غلیظ جانور تھا۔ وہ سب میرے پاؤں کی جانب اِشارہ کر رہے تھے۔ میں چوکے کے کنارے پر ان سے تقریباً دس فٹ دُور ہی کھڑا تھا۔ میں نے کسی کو چھوا تک نہ تھا۔ میں وہیں رُک گیا۔ اَپنے دونوں پاؤں باری باری اُلٹ پلٹ کر دیکھے کہ شاید کوئی گندگی اُوپر یا نیچے لگی ہو، پاؤں تو صاف تھے، جُوتے میں نے دُور ہی اُنکے جُوتوں کے ساتھ اُتار دیئے تھے۔ میں نے اُن کی جانب سوالیہ اَنداز سے دیکھا، کہ میں نے تمہارا چوکا گندہ نہیں کیا، تم سب کیوں اِتنے غُصّے میں ہو۔

اِتنے میں سروشانی بولی۔

''انگریزی علاقہ سے آیا ہے ناں۔ خیر ہے میں لیپ کر دُوں گی''

لیپ کا سنتے ہی سب خاموش ہو گئے۔

بات کرو، رک کیوں گئے ہو۔ سروشانی نے کہا۔

میں بغیر کام بتلائے واپس آ گیا اور بے جی سے کہا کہ وہ لوگ کچن میں کھانا کھا رہے تھے میں اندر نہ گیا پھر تھوڑی دیر میں جا کر کہہ آتا ہوں۔ میں ہر وقت یہ معمہ حل کرنے کی کوشش کرتا کہ کہ سروشانی کے بچوں نے ایسا رویہ کیوں اختیار کیا۔ اب میں اپنے آپ کو ایسا مجرم سمجھ رہا تھا جس کو اپنے جرم کا علم نہ ہو اور اسے سزا مل گئی ہو۔ اکثر خاموش کھڑا سوچ رہا ہوتا کہ شاید میری ہی غلطی تھی۔

'رام داس شا'، شاید اسی وجہ سے اپنی دکان میں روزانہ گوبر سے لیپ کرتا ہے کہ اس کے زیادہ تر گاہک مسلمان ہیں۔ یوں تو دُکاندار مجھ سے بہت کم مخاطب ہوتے۔ ایک روز بازار سے گزر رہا تھا کہ رام داس شا نے مجھے آواز دے کر بُلایا ۔

''فارروق پُت ذرا بات سننا''

میں وہیں رک گیا۔

''کیا آپ نے مجھے بلایا ہے۔''

میں نے رام داس سے پوچھا۔

جی آپکو۔۔رام داس نرم لہجہ میں بولا۔

رام داس کے اس پیار بھرے لہجے سے بڑا پریشان ہوا کہ اس لہجے کے پس پردہ کیا ہے۔

''کیوں کیا بات ہے'؟''

''یہاں گواہی کے دوا کھر ڈال دو''

وہ منت کے لہجے میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی رام داس شا نے اپنی ایک بڑی کاپی میری جانب بڑھائی۔ اور اس کے ایک پرَت کو سامنے کیا اور ایک مخصوص جگہ کی جانب اشارہ کر کے مجھے کہا یہاں پر اپنا نام لکھ دو۔ میں نے اِنکار کرتے ہوئے کہا میں دستخط کیوں کروں۔ میں نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''گواہی ڈال دو''

''نہ میں آپ کو اور نہ ان کو جانتا ہوں گواہی کِس بات کی دُوں''۔

''میری آسامی اور آپ دونوں مُسلمان ہیں۔''

''تو کیا ہوا''

''یہ مجھ سے بغیر ضمانت کے پیسے ادھار لے رہا ہے۔ گواہی اس بات کی کہ میں پیسے آپ کی موجودگی میں دے رہا ہوں۔''

میرے سامنے اس نے تجوری سے تیس روپے نکالے اور اپنے گاہک کو دیے۔ اس کے گاہک نے پیسے لے کر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اِشٹام پر انگوٹھا لگا دیا۔

مہاجن نے اِشٹام میری جانب بڑھایا۔

''آپ اِس پر گواہی کے اکھر ڈال دیں مہربانی، دھن آباد۔''

میں نے دیکھا کہ اُس پر تاریخ اور دن دونوں غلط درج تھے۔

''تاریخ اور دن دونوں غلط ہیں۔ آج فلاں ماہ کی یہ تاریخ اور فلاں دن ہے''

جواب میں رام داس شا نے کہا۔

''پُت تاریخ اور دن دونوں درست ہیں یہ بکرمی سَن کی تاریخ اور دن ہیں۔ اور آپ انگریزی سال کی تاریخ اور دن بتا رہے ہیں''

میں خاموش ہو گیا۔ اِشٹام اُردو میں لکھا تھا، لیکن تمام مہریں ہندی میں تھیں ۔ مہاجن نے تیس روپے دیئے تھے لیکن اِشٹام پر اِس نے 'اَسی' روپے لکھے تھے۔ اِس کے علاوہ ماہوار سُود بھی تحریر تھا۔ میں نے رام داس مہاجن سے پوچھا۔

''میرے سامنے تو آپ نے تیس روپے دیئے ہیں اور لکھے ہیں اَسی روپے یہ زیادتی ہے۔''

''جب پیسے واپس دیگا تو تیس ہی لُونگا یہ بھی جانتا ہے، اور میں بھی جانتا ہوں۔''

میں خاموش ہو گیا اور انگریزی میں دستخط کر دیے۔

ایک روز بے جی نے مجھ سے پانی لانے کا کہا میں گھڑا اور ڈول لے کر کُنویں پر چلا گیا۔ مجھ سے پہلے وہاں ایک عورت پانی بھر رہی تھی ۔ جب میں پہنچا تو اس کا گھڑا کنویں کی منڈیر سے پانچ چھ فٹ نیچے تھا کہ میں نے ڈول ایک طرف رکھ دیا اور لڑکی کی پیروی میں اپنے گھڑے کے گلے پر رسی باندھی اور گھڑے کو کُنویں میں ڈالنے کے لیے مُنڈیر پر آیا۔ عورت نے گھڑا کنویں سے نکالنا روک دیا اور چیخ کر بولی۔

''لُٹھا پر پاؤں نہ رکھنا۔''

''کیوں نہ رکھوں۔''

وہ لڑکی ہماری گلی میں ہی کپڑے کے ایک دکاندار ٹھاکر شنکرداس صاحب کی بہو تھی۔ میں نے سر کو ایک جھٹکا دیا، گویا ٹھاکر صاحب کی بہو کی دلیل کو رد کر دیا۔ اور لٹھ کے اُوپر پاؤں رکھ کر دوسری جانب سے گھڑے کو کنویں میں ڈال دیا۔ لٹھ کے دوسری جانب پانی بھرتی عورت غُصہ سے سٹپٹائی۔ اِس کا پانی اور گھڑا بھرشٹ ہوگیا تھا۔ گھڑا نکال کر پانی کو واپس کُنویں میں انڈیل دیا اور منڈیر کے پاس سے گیلی مٹی لیکر گھڑے پر اس کا لیپ کیا اور غصہ کے عالم میں لٹھ سے دور جا کر کھڑی ہوگئی۔ میں سخت پریشان ہوگیا کہ میں نے تو اس کی کسی چیز کو چھوا تک نہیں وہ بھرشٹ کیسے ہوگئی۔ میں نے زیادہ دیر تک کنویں پر کھڑا رہنا مناسب نہ جانا۔ گھڑے میں تھوڑا سا پانی آیا تھا۔ میں نے گھڑا باہر نکالنا شروع کر دیا۔ میں اس سوچ میں گم تھا کہ میں نے اسے بھرشٹ کیسے کر دیا ہے۔ کہ گھڑا کنوئیں کی دیوار سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ گھڑے کو ٹوٹتے دیکھ کر ٹھاکر کی بہو طنزیہ مسکرائی۔ غالباً یہ اُس کی کسی دیوی یا دیوتا کی کاروائی تھی۔ اس کا غصہ غائب ہوگیا۔ اب وہ لٹھ کی دوسری جانب پرسکون کھڑی تھی۔ میرے منڈیر سے اترنے کے بعد وہ پانی لینے کے لیے منڈیر پر آئی۔ گھڑے کو دو ڈبکیاں دے کر گھڑے کو پاک کیا پانی بھرا اور چلی گئی۔ میں ٹوٹے گھڑے کا گلمہ رسی میں بندھا لئے واپس گھر لوٹ آیا۔ اس واقعہ کے بعد باَمر مجبوری پانی دریا سے ہی لاتا۔ دریائے چناب گھر کے نزدیک ہی تھا اور اُس کا پانی بھی صاف شفاف ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔

ایک دفعہ ایک براہمن والد صاحب کے پاس دفتر میں آیا اور کہنے لگا۔

''جس مسجد میں آپ پرارتھنا کرتے ہیں۔ اس کی تعمیر غیر اِسلامی ہے۔ قبرستان میں مسجد نہیں ہوسکتی۔''

والد صاحب نے اُس سے سوال کیا۔

''کیا آپ مُسلمان ہیں۔''

پھر خود ہی جواب بھی دیا۔

''اگر نہیں تو میں جاؤں اور میرا پیدا کرنے والا۔ آپ اَپنی پرارتھنا جس طرح پڑھتے ہیں پڑھیں۔ مجھے آپ کی پرارتھنا پر کوئی اعتراض نہیں۔ آپ کو میری نماز پر کیوں اعتراض ہے۔ مسجد کیا، میں تو یہاں دفتر میں بھی ڈاک والا تھیلا بچھا کر نماز پڑھ لیتا ہوں۔''

یہ جواب سُن کر براہمن خاموش ہوگیا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

جولائی اُگست ۱۹۴۷ء میں ماہِ رمضان آ گیا تراویح پڑھنے کے لیے میں اور والد صاحب روزانہ ہاتھ میں لالٹین لیئے مسجد چلے جاتے۔ ایک روز سروشانی نے مجھے بُلا کر کہا۔

''اَپنے پِتا جی مہاراج سے کہنا کہ آج رات پرارتھنا کرنے پرانے شہر نہ جائیں کچھ چٹّ آپ کو نقصان پہنچانے کا اِرادہ رکھتے ہیں۔''

والد صاحب نے اُس رات تراویح گھر پر ہی پڑھ لیں اور مسجد نہ گئے۔ دوسرے دن ستائیسویں رمضان تھی ہم لالٹین کے بغیر پرانے ہمیر پور سدھڑ تراویح پڑھنے چلے گئے اور خیریت سے واپس آ گئے۔ اس رات ہمیں کسی نے نہ روکا۔ عید کی نماز کے لیے ایک سو کے قریب مُسلمان نماز پڑھنے آئے۔ کوئی صاحب نماز پڑھانے کو تیار نہ تھے۔ والد صاحب نے ہی نماز پڑھائی اور چلے آئے۔

عید کے فوراً بعد دِیوالی کا تہوار آ گیا یہ تہوار شری رام چندر کی بن باس سے واپسی کی خوشی میں ہندو کئی روز تک مناتے، نئے کپڑے پہنتے مٹھائیاں تقسیم کرتے، اور گھروں میں چراغاں کرتے۔ ہمیر پور سدھڑ میں اس خوشی کو تین روز تک منانے کے لیئے تین سٹیج ڈراموں کا اِہتمام کیا گیا۔ دیوالی کی خُوشیوں میں شریک ہونے کی اِجازت کسی ''دِلت'' (شودر) کو نہ تھی۔ اُسے دُور سے کھڑا ہو کر ڈرامہ دیکھنے یا سننے کی بھی اجازت نہ تھی۔ البتہ ہمارے ڈرامہ دیکھنے پر کسی نے اعتراض نہ کیا۔ ان ڈراموں میں مسلمان بادشاہوں کے ظلم وستم کے خلاف مہاراجوں کے مقابلہ اور ان کی بہادری کی داستانیں پیش کی گئیں۔ ڈاکخانہ کے سامنے دو دکانوں کے درمیان خالی جگہ پر سٹیج تعمیر کیا گیا۔ ایک دکان دار، والد صاحب سے ایک دفتری کرسی ڈرامہ میں استعمال کے لیئے مانگ کر لے گیا۔ اور تینوں ڈرامے ڈاک خانہ کے سامنے سٹیج کیئے گئے۔

پہلے روز پرتھوی راج چوہان سے متعلق ڈرامہ سٹیج کیا گیا کہ، وہ کس طرح ایک وفادار ساتھی چاند بروا کی مدد سے نابینا ہونے کے باوجود شہاب الدین غوری کو قتل کرتا ہے۔ چاند بردا پرتھوی راج چوہان کی خاطر ایک وفادار غلام کا بھیس بدل کر شہاب الدین غوری کے دربار تک پہنچتا ہے۔ وہ شہاب الدین غوری کو یقین دلاتا ہے کہ پرتھوی راج چوہان کو اگر اس کی اپنی تیر کمان دے دی جائے تو وہ اُڑتے پرندے کی آواز سن کر تیر سے درست نشانہ لگا سکتا ہے۔ چاند بردا نے، اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں شہاب الدین غوری کو اس کھیل کا عملی مظاہرہ

دیکھنے پر مجبور کیا۔اور اندھے پرتھوی راج چوہان کو سٹیج پر لایا جاتا ہے۔ چاند بردا، ہندی میں پرتھوی راج کو سلطان کے بیٹھے ہونے کی سمت سمجھاتا ہے۔

''چار بانس چوبیس گج انگل اشتا پرامان

تا اُپر بیٹھا ہے سلطان مت چُوک چوہان''

لٹکتی پیتل کی گھنتی کو بجا کر پرتھوی راج چوہان کو چاند بردا نے کہا۔

''تیر چلاؤ''۔

لیکن پرتھوی راج چوہان خاموش کھڑا رہتا ہے۔ چاند بردا کورنش بجا لاتے ہوئے شہاب الدین غوری سے عرض کرتا ہے۔

''حضور پرتھوی راج چوہان ایک بادشاہ ہے لہٰذا وہ ایک بادشاہ کا حکم ہی مانے گا۔آپ اسے حکم دیں کہ وہ تیر چلائے۔''

گھنٹی دوبارہ بجائی گئی اور شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو حکم دیا۔

'تیر چلاو''

پرتھوی راج چوہان نے آواز کی سمت میں تیر چلایا جو شہاب الدین غوری کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ بہت سے شور کے بعد سٹیج پر تین لاشیں دکھائی گئیں ۔ حاضرین اس دوران چاند بردا اور پرتھوی راج چوہان کی جئے جئے پکارتے رخصت ہوگئے۔

دوسرے روز رانا سنگرام المعروف رانا سانگا سے متعلق ڈرامہ پیش کیا گیا ۔ جنگ کنواہا(The Battle of Khanwa) کے دوران رانا سانگا کو ظہیر الدین بابر کا پیغام دیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت بہادروں کی قدر کرتے ہیں اور آپ سے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ رانا سانگا کو یقین دلایا جاتا ہے کہ بابر بادشاہ اُس کے استقبال کے لیے درباریوں کے ہمراہ اس کا استقبال کریں گے۔ وہ چند بہادر اور وفادار ساتھیوں کو ہمراہ لاسکتا ہے۔بادشاہ کے سپاہی رانا سانگا کے ساتھیوں کو دھوکا سے جدا کر دیتے ہیں ۔ رانا سانگا کے ہتھیار بھی چھین لیتے ہیں رانا سانگا ہتھیاروں کے بغیر سٹیج پر آتا ہے ۔ ہتھیاروں کے بغیر بابر کے سپاہیوں سے مقابلہ کرتا ہے۔ دیر تک مقابلہ کرنے کے بعد اُسے گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ظہیر الدین بابر بادشاہ رانا سانگا کو پیش کرنے کا حکم دیتا ہے ۔ بادشاہ کے سپاہی رانا سانگا کو دربار میں داخلہ کے وقت کورنش بجا

لانے کا کہتے ہیں لیکن رانا سانگا بابر بادشاہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ مجبوراً بادشاہ کے سپاہی رانا سانگا کو ایک چھوٹی کھڑکی کے راستہ دربار میں داخل ہونے کا کہتے ہیں ۔اس کھڑکی کے سامنے بادشاہ سلامت بیٹھے نظر آتے ہیں ۔رانا سانگا جھک کر گذرنے کی بجائے ، جوتے پہنے اپنے دونوں پاؤں کھڑکی سے بادشاہ کے سامنے کرتا ہے بادشاہ کے فوجی رانا سانگا کی اِس حرکت کو ناپسند کرتے ہوئے اُس کا سر تن سے جُدا کر دیتے ہیں ۔ڈرامہ دیکھنے والے ناظرین رانا سانگا کی جئے جئے پکارتے ہیں ۔

تیسرے روز رام لیلا کا پروگرام تھا۔ رام چندر جی کے بن باس کے دوران ہونے والے واقعہ کو ڈرامائی انداز میں دکھایا گیا ۔ راون کی بدصورت بہن لکشمن کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتی ہے ۔اور اس سے محبت کی طلب گار ہوتی ہے۔لکشمن اس کو دھتکار دیتا ہے ۔اور سزا کے طور، اسکی ناک کاٹ دیتا ہے ۔ راون کی بہن اپنے بھائی کو بدلہ لینے پر مجبور کرتی ہے ۔ راون اپنے ایک ساتھی راکھشس کی مدد سے ایک خوب صورت ہرن کی صورت میں رام چندر جی کے خیمہ کے پاس سے گذرتا ہے ۔ سیتا جی رام چندر جی کو اس ہرن کے شکار کی خواہش کرتی ہے ۔ رام چندر جی شریمتی سیتا جی کی خواہش پر اس ہرن کو شکار کرنے جاتے ہیں ۔ ان کی غیر حاضری میں وہی راکھشس رام چندر کی آواز میں سیتا کو مدد کے لیئے پکارتا ہے ۔ یہ آواز سن کر سیتا لکشمن کو بھائی کی مدد کے لیئے روانہ کر دیتی ہے۔لکشمن جانے سے پیشتر خیمہ کے گرد ایک جادو کی ریکھا (لکیر) کھینچ دیتا ہے ۔ دونوں بھائیوں کی غیر حاضری میں راون خیمہ میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے ۔لیکن ریکھا پار کرنے سے پیشتر آگ کا ایک دریا اس کا راستہ روک لیتا ہے ۔ مجبوراً راون ایک اپاہج فقیر کا روپ دھار کر خیمہ کے باہر بھیک مانگنے آتا ہے ۔اور خیرات لینے کے لیئے خیمہ میں اندر آنے سے سیتا سے مجبوری کا اظہار کرتا ہے ۔ سیتا خیرات دینے کے لیئے جونہی دائرہ سے باہر آتی ہیں ۔ اَپاہج فقیر پاؤں پر کھڑا ہو کر سیتا جی کو اغوا کر لیتا ہے ۔ رَام چندر جی خیمہ میں واپس آئے تو سیتا جی کو خیمہ میں نہ پا کر پریشان ہو جاتے ہیں ۔ ہنومان بندر کی مدد سے سیتا جی کو راون کی قید سے چُھڑا لاتے ہیں ۔ رام چندر جی سیتا سے ناراض ہو کر اسے آشرم میں بھیج دیتے ہیں ۔ جہاں سیتا کے دو جڑواں بیٹے لو اور کسو پیدا ہوتے ہیں ۔ اس دوران لکشمن رام چندر جی کو منانے کی بہت کوشش کرتا ہے ۔لیکن رَام چندر جی ، سیتا کو معاف کرنے کو تیار نہیں ہوتے آخر ان کے جُڑواں بیٹے لو اور کسو جنہیں رام چندر

جی نے دیکھا تک نہ تھا۔ اَپنے باپ کے سامنے گا کر ماں کی مجبوری اور اسکی بے گناہی کی دلیل پیش کرتے ہیں۔ کہ اس اغوا کیے جانے میں ان کی ماں کا کیا قصور تھا جس کی سزا میں اس کو آشرم میں بھیجا گیا۔ رام چندر جی بیٹوں کی بات سن کر سیتا کی غلطی معاف کر دیتے ہیں۔ اور وہ گھرانہ دوبارہ ہنسی خُوشی رہنے لگ جاتا ہے۔

پنڈال سے لوگ رَام چندر جی کی جے کے نعرے لگاتے ہیں۔ یہ آخری ڈرامہ تھا۔ امیر لوگ ڈرامہ میں حصہ لینے والوں کی حوصلہ افزائی اور اَپنی فراخدلی کی نمائش کے لیے چار آنہ، آٹھ آنہ، ایک روپیہ بطور اِنعام میراثی کو دیتے ہیں۔ میراثی اس کا اعلان ویل کی صورت کرتا۔ ہمارے گھر کی عورتوں نے ہمسایوں کی چھت پر ہندو عورتوں سے علیحدہ دوسری مُنڈیر پر بیٹھ کر وہ ڈرامے دیکھے۔ آخر میں والدہ نے ایک روپیہ پلو میں باندھ کر نیچے لٹکایا۔ پاس کھڑے ایک ہندوٴ نے کھول کر میراثی کو دیا۔ ہندوٴ معاشرہ نے اِس فراخدلی کو بہت سراہا۔ میراثی نے اُونچی آواز میں اِس کا اعلان کیا۔ ”شریمتی بابو نور احمد چوہان رَاجپوت کی پتنی کی ویل“

میراثی نے رَاجپوت کے لفظ پر خاص زور دیا۔ تا کہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ہم کسی ملیچھ سے نہیں بلکہ ایک کشتری کی پتنی سے پیسے لے رہے ہیں۔ اس اعلان کے بعد ہمیر پور سدھڑ کے ہندوؤں کے روّیے میں تلخی اور نفرت میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی۔

ایک روز بے جی کے دانت میں درد کی شکائت ہوئی۔ ایک روئی کے پھاہا کو گرم گھی میں ہلدی ملا کر مسوڑھوں پر لگایا اور تھوڑا گرم گھی روئی کے ایک ٹکڑے پر لگا کر دانتوں میں رکھ کر دبایا۔ پھاہا کو دانتوں میں دبانا تھا کہ درد میں کمی کی بجائے اضافہ ہو گیا۔ ہمیر پور سدھڑ کی ڈسپنسری میں دانتوں کا کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ بازار میں دوائیوں کی دُکان نہ تھی جہاں سے دانت درد کی دوا مل سکتی۔ سارا دن اسی بھاگ دوڑ میں گزر گیا۔ والد صاحب سخت پریشان تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہمیں صبح ہی سیالکوٹ واپس بھیج دیں۔ میں کسی کام سے بازار جا رہا تھا کہ ہماری مالکن مکان، سروشانی نے مجھے بُلا کر دریافت کیا کہ کل سے آپ سب کیوں پریشان ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ بے جی کے دانت میں درد ہے۔ وہ پچھلی دو رات سے سو نہیں سکیں، وہ بولی۔

”اگر آپ کے پتا جی مہاراج اجازت دیں تو میں مندر کے بڑے پڑوہت کو جا کر لے آتی ہوں۔

وہ آ کر منتر پڑھیں گے، پرماتما کی اچھیا سے تمہاری والدہ کو جلد آرام آ جائے گا۔“

میں نے والد صاحب کو سروشانی کا پیغام دیا۔ انہوں نے جواب میں کہا۔

”اُن کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہمارا اتنا خیال کیا۔ لیکن ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ہماری خواتین بغیر پردہ کیے کسی غیر محرم کے سامنے آئیں۔“

سروشانی والد صاحب کا جواب سن کر پنڈت جی کو بلانے چلی گئی۔ سروشانی نے جا کر پنڈت جی سے بات کی کہ اس کے کرایہ دار کی پتنی کے دانت میں درد ہے۔ لیکن وہ مسلمان ہیں اور ان کا دھرم مسلمان عورتوں کو کسی غیر محرم مرد کے سامنے بغیر پردہ آنے کی اجازت نہیں دیتا۔ پنڈت جی مہاراج نے جواب میں کہا۔

”میں ان کے دھرم کی اس روائیت کا احترام کرتا ہوں، وہ اپنی چارپائی پر لیٹی رہیں اور کوئی کپڑا اوڑھ لیں۔ میں دور کھڑا ہو کر منتر پڑھ دونگا۔ پرماتما کی اچھیا سے انہیں جلد آرام آ جائیگا“۔

مغرب سے پیشتر پڑوہت اپنے ہمراہ سبز پتوں والی کسی درخت کی تین ٹہنیاں بغل میں دبائے ہری اوم ہری اوم کرتے سروشانی کے گھر چلے گئے۔ بے جی نے بستر پر لیٹے ایک چادر مزید اوڑھ لی۔ میں نے سروشانی سے جا کر کہا۔

”کہ وہ پنڈت جی مہاراج کو لے آئے۔“

ایک دبلا پتلا آدمی ٹنڈ چمکائے پیشانی اور سینے پر سرخ اور سفید رنگ کی تین تین لکیریں کھینچے ہمارے گھر آیا۔ پنڈت جی نے بے جی کی چارپائی کے پاس کھڑے ہو کر پہلے اُنگلی کے اشارہ سے ہوا میں کچھ تحریر کیا اور کچھ منتر پڑھے سروشانی بھی وہیں پنڈت جی کے پاس کھڑی تھی۔ پنڈت جی نے اُسے کہا۔

”اِن پر کالے جادو کا گھمبیر اثر ہے۔ پرم آتما کی اِچھیا سے جادو ابھی بھسم کر دوں گا۔“ پنڈت جی نے مزید کہا۔

”بچوں کو باہر بھیج دیں کہیں وہ ڈر نہ جائیں“

والد صاحب اور سروشانی وہیں کھڑے رہے۔ بھابھی اور بہنیں پہلے ہی دوسرے کمرے میں تھیں۔ ہم تینوں بھائی بھی وہیں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں اور بڑا بھائی کمرے سے باہر آ گئے اور دروازہ کی درز سے دیکھتے رہے۔ پہلے پنڈت جی مہاراج نے منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔

ایک سبز ٹہنی کو بغل سے نکالا اور چادر سے چھوتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں تک آہستہ آہستہ پھیرا اور اُسی رفتار سے ٹہنی کو واپس لائے۔ کچھ منتر اونچی آواز میں پڑھے۔ ساتھ لمبی ہوں۔ ہوں۔ ہوں۔ کی آواز نکالتے رہے، جیسے کسی کو زمین پر گرا کر اس کی گردن کو دبا رہے ہوں۔ وہ منہ بند کر کے بھی لمبی لمبی ہوں کہہ رہے تھے۔ بے جی نے بعد میں بتایا کہ جو کچھ ان کی سمجھ آیا وہ بس یہی تھا،

''ہرتھوابرتھوا دادوا''

اس کے علاوہ اور کچھ بھی سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں تو ٹہنی نظر نہ آئی۔

پنڈت جی مہا راج ہماری جانب پُشت کیے تھے۔ البتہ سروشانی نے بتایا کہ وہ گیتا (Bhagavad Gita) کے اشلوک دیر تک پڑھتے رہے۔ اُس نے بتایا کہ پنڈت جی مہاراج ٹہنی کو دیکھ کر پریشان دکھائی دیئے۔ پنڈت جی نے پریشانی کے عالم میں دوسری ٹہنی کو جب سر سے پاؤں تک پھیرا اور گیتا کے اشلوک اونچی آواز میں پڑھے تو بے جی نے ایک چھوٹی سی انگڑائی لی۔ وہ پچھلے تین روز اسی چارپائی پر لیٹی تھک گئیں تھیں۔ پنڈت جی بڑے خوش ہوئے سروشانی سے بولے دیکھا اشلوک کا اثر۔ جادو اتر رہا ہے۔ تیسری ٹہنی کو بھی پنڈت نے اس طرح اشلوک پڑھتے پھیرا۔ پنڈت جی مہاراج نے ٹہنی کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور لمبا سانس لیا اور تینوں ٹہنیوں کو واپس اپنی بغل میں دبایا اور بولے کہ بڑا سخت جادو تھا اُتر گیا ہے۔ صبح تک پرم آتما کی آشیرباد سے بالکل ٹھیک ہو جائیں گی اور وہ چلا گیا۔ بے جی پچھلی دو رات سے سو نہ سکیں تھیں نیند کے غلبہ سے سو گئیں دوسری صبح اُنہیں کافی آفاقہ تھا۔ پنڈت کو پانچ آنے بطور فیس سروشانی نے دیئے تھے۔ جو بے جی نے اسے دے دیئے۔

بابو نور احمد صاحب چوہان راجپوت ہیں، کے اعلان کے بعد سے ہندو لوگوں میں تلخی اور نفرت میں کچھ کمی واقع ہونے لگی۔ اب وہ مجھے ایک قابلِ رحم راجپوت سمجھنے لگے جس کی رُوح بھٹک کر مسلمان خاندان میں اپنی سزا بھگتنے کے لیے پہنچ گئی ہے۔ وہ مجھ سے بات کرنے میں عار محسوس نہ کرتے۔ اب اکثر سروشانی مجھے دوسری چارپائی پر بٹھا کر شفقت بھری باتیں کرتی رہتی۔ اکثر ماس (گوشت) لا کر دینے کا کہتی جو میں ہمیر پور سدھڑ جا کر لا دیتا۔ ایک روز میری طبیعت کچھ سست تھی۔ میں نے پیکر کو پرانے ہمیر پور سدھڑ بھیج کر گوشت منگوا دیا۔ پیکر کا تعلق

شودر ذات سے تھا۔ مجھے اس بات کا خیال نہ رہا کہ شودر کے ہاتھوں چھوا ہوا گوشت تو ناپاک ہو جاتا ہے۔ سروشانی کو اطلاع ہوگئی۔ مجھ سے اس نے اس بات کی تصدیق کروائی۔ میں نے بھی سچ بتلا دیا۔ سروشانی یہ بات سُن کر خاموش ہوگئی اور آئندہ اُس نے ماس منگوانے کی فرمائش کبھی نہ کی۔

ایک روز سروشانی کی ساس مجھے کہنے لگی تم کتنی پیاری آتما کے مالک ہو اگر تم ہمارے دھرم کے پُجاری ہوتے تو میں اپنی بڑی پوتی شکنتلا کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی۔ میں خاموش رہا اور میں نے کسی سے بات نہ کی۔ اب بات کرتے ہوئے سروشانی کے چہرے کے تاثرات مختلف تھے۔ چہرے پر تناؤ کی بجائے مسکراہٹ ہوتی۔ لہجہ میں دھیما پن اور محبت جھلکتی۔ شکنتلا بھی ان کی باتوں میں بے دھڑک شامل ہو جاتی ایک روز شکنتلا کی دادی نے اسے بھیج کر مجھے گھر سے بلوایا۔ میں آیا تو دیکھا کہ وہی پنڈت جی مہاراج جنہوں نے بے جی کے دانت کے درد پر منتر پڑھے تھے، اپنا مخصوص لباس پہنے، پیشانی اور سینہ پر رنگوں سے لکیریں کھینچے ہاتھوں میں چند اوراق پکڑے ایک چارپائی پر بیٹھے تھے۔ دوسری چارپائی پر سروشانی، شکنتلا اور اس کی چھوٹی بہن بیٹھی تھیں۔ شکنتلا کی دادی تیسری چارپائی پر بیٹھی تھی۔ دادی نے مجھے بازو سے پکڑ کر پنڈت جی مہاراج کے سامنے کھڑا کیا اور کہا کہ انہیں پرنام کرو۔ میں نے دائیاں ہاتھ پیشانی تک لیجا کر کہا۔ ''سلام پنڈت جی'' پنڈت جی نے کوئی جواب نہ دیا، البتہ سر کو جنبش دیکر دو بار ہلایا۔ وہ اشلوک پڑھ رہے تھے اشلوک ختم کیے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔

''پوتر تمہارا شبھ نام کیا ہے''۔

مجھے شبھ نام کا علم نہ تھا۔ میں نے سروشانی کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا وہ بولی۔

''تمہارا نام پوچھ رہے ہیں۔''

میں نے جواباً اپنا پورا نام ولدیت ذات اور گوت بتایا جو اُس نے کاغذ پر ہندی میں تحریر کر لیا۔ اُس نے سروشانی سے اس کی بیٹی شکنتلا کا شبھ نام پوچھا اور اُسی کاغذ کے ٹکڑے پر ہندی میں لکھ لیا۔ اس کے بعد وہ کچھ ہندی میں لکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کاغذ پر چند سیدھی چند الٹی اور چند ترچھی لکیریں کھینچ کر ایک زائچہ بنایا۔ ہندی میں تھوڑی دیر تک کچھ حساب لگایا اور کچھ جمع تفریق کیا۔ اور پھر اپنی کتاب کھولی کچھ پڑھنے کے بعد ان کے چہرے پر رونق نمایاں ہوگئی۔

''دونوں کی جنم پتری ایک دو روز میں بنا دونگا ''

غالبًا انہوں نے شکنتلا اور میری کنڈلی کا حساب لگایا تھا جس کا جواب انہیں مثبت ملا تھا۔ سروشانی نے ان سے ہندی کا ایک لفظی سوال کیا۔ جسے میں نہ سمجھ سکا۔ اور پنڈت جی نے ہاں میں سر ہلایا، بڑھیا بولی۔

''آپ اسے چرنوں میں جگہ دیں۔ اسے کاشش کریں ہوسکتا ہے کہ بچہ شُدھ ہو جائے بہت نیک اور عقلمند ہے درشن کرو مہاراج یہ چھوٹا سا سندر بچہ اب دسویں جماعت میں پڑھتا ہے۔''

میں ان کے ارادہ سے بے خبر یہ سمجھا کہ وہ شاید میری کامیابی کے لیے دعا کروا رہی ہے۔ پنڈت جی مہاراج نے مجھ سے کہا کہ ہاتھ جوڑ کر ماتا جی کو نمستے کہو۔

میں نے بھی بڑی تابعداری کے ساتھ کہا۔

''ماتا جی نمستے۔''

پھر وہ بولا۔

''نمستے کے بعد کہو رام رام۔''

میں نے اپنا سبق دہرایا۔

''ماتا جی نمستے رام رام۔''

ماتا جی کا نام سنتے ہی سروشانی کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی شکاری کی چمک دکھائی دی۔ جو میرے ماتا جی رام رام کہنے کے بعد اُس کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ پنڈت جی نے مجھے کہا کہ چند دن تک یہی لفظ نمستے رام رام کا پاٹھ کرو۔ میں یہی کہتا ہوا گھر میں داخل ہوا اور بڑی بہن کو نمستے اور رام رام کہا، بڑی بہن ہنس پڑی۔ البتہ بے جی کہنے لگیں۔

''تم کب سے ہندو ہو گئے ہو۔ خبردار جو آئندہ مجھے نمستے کہو۔ کہنا تو اسلام علیکم پورا کہو۔''

چند دِن بعد پنڈت جی مہاراج اپنے مخصوص لباس اور اس پر اُسترے سے تازہ ٹنڈ کو تیل سے چمکائے بالوں کی لِٹ کو نمایاں کیئے پیشانی اور سینے پر گہرے رنگ کی تین لکیریں بنائے۔ موٹی مالا ہاتھ میں لٹکائے اوم تت ست، ہری اوم ہر ہر مہادیو کا ورد کرتے ہمارے دروازہ کے پاس سے گزرے۔ جلد شکنتلا بلانے آ گئی۔ میں چلا گیا دیکھا کہ پنڈت جی مہاراج بیٹھے ہوئے گیتا پڑھ رہے تھے۔ مجھے اشارہ سے کہا۔

''بیٹھو''

میں نے نگاہ دوڑائی کوئی چارپائی خالی نہ تھی ایک پر پنڈت دوسری پر بڑھیا اور تیسری پر شکنتلا اور اسکی ماتا بیٹھی تھی، وہاں پر تین چارپائیاں ہی رکھی تھیں۔ میں نے پھر نگاہ دوڑائی اور کھڑا رہا۔

''چارپائی پر بیٹھو''

شکنتلا کی ماتا اٹھ کر دوسری چارپائی پر بڑھیا کے پاس بیٹھ گئی۔ شکنتلا اٹھنے لگی تو ماتا نے کہا تم بیٹھی رہو۔

پنڈت جی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا

"ماتا جی کو پرنام کرو''۔

میں نے دونوں ہاتھوں کو پیشانی پر جوڑ کر بڑے ادب سے سر کو جھکا کر کہا۔

''ماتا جی پرنام، رام رام نمستے رام رام۔''

بڑھیا بہت خوش ہوئی اس کی باچھیں کھل گئیں خوشی سے پیلے میلے دانت نکالے۔ پنڈت جی کی طرف چمکتی آنکھوں سے دیکھا۔ گویا وہ ایک بڑا کارنامہ سرانجام دے چکی ہو۔ پنڈت بولا۔

''روئیت پوتر گاتری کا پاٹ کرو''

میں نے اُس کی جانب حیرانگی سے دیکھا نہ میرا نام روئیت تھا نہ میں گاتری کو جانتا تھا۔ میں سمجھا کہ پنڈت جی شاید کسی اور سے مخاطب ہیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہاں تو کوئی نہ تھا۔ پنڈت جی پھر مجھ سے مخاطب ہوئے

''پوتر پاٹھ کرو''

''اُوم، تت ست بھورُ، بُھوَہ، سوَہُ""" دھاتنک، دھو پنک، کبھو کنک، پنچ اندریان، ھون۔''

میں اتنا لمبا سبق نہ یاد کر سکتا تھا، سروشانی کو میری مشکل سمجھ آ گئی پنڈت جی سے بولی، مہاراج آپ ابھی اسے گاتری تک ہی رکھیں۔

''اوم تت ست بنوز، بوھاؤ، سوہو۔''

میرا تلفظ ہر دفعہ غلط ہوتا۔ پنڈت جی نے میرے تلفظ کو کئی بار درست کروایا اکثر میں بُھوا ُ کو بیوا و ہو، کہتا بلکہ جو منہ میں آتا وہی بول دیتا۔ پنڈت جی صحیح تلفظ سے پڑھنے اور پاٹھ کرتے رہنے کا کہہ کر مندر چلے گئے واپس گھر آیا بڑی بہن کو سُنایا۔

"آ پاں نمستے ،رام رام، ہری اوم،تت ست بھو بھا سوا ہو، پرنام آ پاں۔"

بے جی نے پوچھا۔

"یہ کیا ہے۔"

"یہ سنسکرت میں بسم اللہ ہے۔اسے گاتری کہتے ہیں۔ پنڈت جی نے مجھے یاد کرنے کو کہا ہے۔"

میں نے بے جی کے سامنے پیشانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کیئے، پورا سبق دہرایا۔

"ماتا جی، پرنام،نمستے ،رام رام، ہری اوم،تت ست، بھوہوبھُوا ُ،سواہ، پرنام ماتا جی۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا لیا۔ پٹاخ سے ایک زوردار تھپڑ بے جی نے میرے منہ پر رسید کیا۔ بڑا بھائی اور بہن بھی بے جی کے ساتھ میری پٹائی میں شامل ہوگئے۔ دونوں نے بھی ثواب کے چند تھپڑوں کا اضافہ کردیا۔ بھابھی کچن میں بیٹھی کام کررہی تھی۔تھپڑوں اور میرے باں باں رونے کی آواز سن کر دوڑ کر باہر آئی۔ اس نے مجھے ان سے مار کھانے کے دوران ہی گھسیٹ کر چھین لیا۔ میری منہ پر بے جی کی انگلیوں کےانشان بہت گہرے تھے۔ وہ جگہ سرخ ہوگئی تھی، بھابھی انہیں سہلانے لگی۔اور بے جی سے کہنے لگی۔

"ہائے بے جی اتنے زور کا تھپڑ تو بیٹوں کو نہیں مارتے۔"

بے جی نے غصہ کے عالم میں کچھ نہ سنا اور چیخ کر کہا۔

"ابھی تمہارے والد صاحب کو بلواتی ہوں وہ تمہاری مرمت کریں گے اور تمہیں اگلے جنم میں نہیں اسی جنم میں انسان بنا دیں گے۔"

میرے باں باں رونے کی آواز سُن کر شکنتلا وہیں آ گئی، لیکن بے جی نے اسے غصہ سے ڈانٹ کر کہا۔

"تم لوگ اِسے کیا سکھا رہے ہو۔ جاؤ یہاں سے۔"

بھائی غلام صدیق دوڑتا ہوا والد صاحب کے پاس گیا اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کیا اور کہا کہ بے جی آپ کو بُلا رہی ہیں۔ وہ دفتری مصروفیات کی بناء پر اُس وقت گھر نہ آ سکے۔

البتہ شام کو دفتر بند کر کے آئے تو بے جی سے کہا کہ بہتر آپ لوگ جانے کی تیاری کریں اور واپس گاؤں چلے جائیں۔

اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد ایک روز شکنتلا کو بلایا۔

"آ و شکنتلا چھٹا پو کھیلتے ہیں۔"

"نہیں۔ ماتا جی کہتیں ہیں کہ اس جنم میں ہمارے راستہ میں بہت سے راکھشس ہیں۔"

میں خاموش ہوگیا اور پھر کبھی اس کو مخاطب نہ کیا۔

دسمبر تعطیلات گزارنے کے بعد ہم دونوں بھائی واپس مناور سکول چلے گئے۔ مارچ تک دونوں سہمے سہمے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مارچ، اپریل ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان دینے کے لیے ہمیں گُجرات ضِلع سے مُنسلک شہر ٹانڈہ جانا پڑا۔ سکول کی جانب سے طلباء کے لیئے ہر قسم کی سہولت اور آرام کا انتظام تھا۔ دونوں بھائی یا تو کمرہ اِمتحان میں پرچہ حل کررہے ہوتے یا پھر کھانے کا اِنتظام کررہے ہوتے۔ پڑھائی تو بہت پہلے کی ختم ہو چکی تھی۔ سیالکوٹ میں جو پڑھا تھا اِسی کے سہارے اِمتحان دیا۔ اِمتحان سے فراغت کے بعد واپس ہمیر پور سدھڑ آ گئے۔ شہر میں کوئی لائبریری یا کوئی کھیل کا میدان نہ تھا اکثر دریائے چناب کے کنارے بیٹھ کر مچھلیاں پکڑنے کی بے کار کوشش کرتا ایک ماہ تک پُوری کوشش کے باوجود کسی چھوٹی یا بڑی مچھلی کا شکار نہ کرسکا۔

ہجرت

اَگست ۱۹۴۷ کے اِبتدائی اَیام تھے اَبھی پاکستان کی آزادی کا اعلان نہیں ہُوا تھا اور ریاست میں بظاہر ہر جگہ سکون تھا۔کوئی جلسہ جلوس کسی جگہ منعقد ہونے کی خبر کبھی سنی نہ گئی۔ایک روز بڑے بھائی نے ڈاکخانہ کے نوٹس بورڈ پر''پاکستان زندہ باد'' لکھ دیا۔ جسے ایک کارڈ خریدنے والے نے پڑھ لیا۔بس اس کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ایک آتا اور اس کے جانے سے پیشتر دو اور آجاتے۔ان میں سے کوئی کسی کام سے کسی کلرک یا پوسٹ مین سے رابطہ نہ کرتا۔میں نے برآمدہ میں جا کر دیکھا کہ لوگ نوٹس بورڈ کے پاس کھڑے ہیں۔جب وہ گئے تو میں نے جلدی سے وہ نوٹس اتار کر اسی جگہ ایک نیا نوٹس لگا دیا۔لوگ تو آجا رہے تھے لیکن جلد ان کا آنا جانا بند ہو گیا۔

لاوہ اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ ہماری چھٹی حس ہمیں خبردار کر رہی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ایک رات ہم بستر پر دراز ہو کر سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ یکا یک گلی میں لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔سب خاموش ہو گئے بے جی نے آہستہ مدھم آواز میں ''جل توں جلال توں آئی بلا کو ٹال توں'' کا ورد کرنا شروع کر دیا۔اس دوران دُور سے ماتا ہری کی جے کے نعروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگی۔بڑے بھائی نے دروازے کی اَوٹ سے جھانک کر دیکھا۔انہیں کچھ سمجھ نہ آیا کہ یہ لوگ گاؤں سے باہر تھانہ کے میدان کی جانب کیوں بھاگ کر جا رہے ہیں۔والد صاحب حوصلہ سے تھے،انہوں نے پُر اعتماد آواز میں ہم دونوں بھائیوں سے کہا کہ گھر کے چاروں کونوں میں کھڑے ہو کر مدھم آواز میں اذان دو انشاللہ ہم محفوظ رہیں گے۔ہم دونوں

بھائیوں نے صحن کے دو مختلف کونوں میں کھڑے ہو کر سہمی اور دبی آواز میں باری باری اذان دی۔ ہوا کے اندر بس ارتعاش ہی پیدا ہوا۔اذان دینے کے بعد ہمارا غیر محفوظ ہونے کا خوف دُور ہو گیا۔ لیکن ہم سب نے رات جاگ کر گزاری۔

یہ ریاستی حکومت کی ریہرسل تھی اُنہوں نے اِس ریہرسل سے اِس بات کا تعیُن کیا کہ ہمیر پور سدھڑ میں کتنے ہندؤ نوجوانوں کو مُسلمانوں کے خلاف مسلح کیا جا سکتا ہے۔ نیز اِس بات کا بھی تعیُن کیا گیا کہ اُن کے مقابلہ میں مُسلمان نوجوان تعداد میں کتنے ہیں۔اُس وقت ہندؤوں اور مُسلمانوں کی اَلگ اَلگ فہرستیں تیار کی گئیں ایک مُسلمان نوجوان نے بتایا کہ وہ گھر میں سو رہا تھا اس کا ہندو ہمسایہ دوست اُسے جگا کر اَپنے ساتھ لے گیا۔اس کا کہنا تھا کہ وہ جانے کو تیار نہ تھا۔ اس کے غیر مسلم دوست نے اسے مجبور کیا کہ وطن کی حفاظت ہندؤ اور مسلمان دونوں پر فرض ہے۔ اُس نے مزید انکشاف کیا کہ وہاں جب پہنچا تو وہاں انجانے چہرے زیادہ تعداد میں دیکھنے میں آئے۔

والد صاحب انجانے چہروں کا سن کر کچھ پریشان دکھائی دیئے۔وہ سب کو واپس گاؤں بھیجنے کا فیصلہ پہلے ہی کر چکے تھے۔اسی شب اُنہوں نے بے جی سے کہا صبح ہی سب لوگ واپس چلے جاؤ۔سامان تو ہم پہلے ہی باندھ کر بیٹھے تھے۔ہم سب صبح ہی بس میں سوار ہو گئے۔بس میں بیٹھتے ہی بے جی کو یاد آیا کہ وہ اپنا پڑھنے والا چشمہ گھر بھول آئی ہیں۔مجھ سے کہا کہ بھاگ کے جاؤ اور تکیہ کے نیچے رکھا چشمہ لے کر بھاگتے آجاؤ۔ایک کلومیٹر سے کم فاصلہ تھا میں بھاگم بھاگ گیا اور چشمہ لے کر آ گیا۔جب لوٹ کے آیا تو دیکھا کہ بس دُور گرد اڑاتی کچی سڑک پر سو گز کے فاصلہ پر جا رہی تھی۔میں تھوڑی دُور تک اِشارے کرتا کچی سڑک پر دوڑتا رہا۔لیکن ہر لمحہ بس کا فاصلہ مجھ سے بڑھتا گیا اور بس نظروں سے اوجھل ہو گئی۔بڑی کوفت ہوئی منہ لٹکائے والد صاحب کے پاس آ گیا۔ اُنہوں نے دیکھتے ہی سوال کیا۔

''باقی کہاں ہیں؟''

''وہ سب چلے گئے۔''

''تمہیں ساتھ کیوں نہیں لے کے گئے۔''

''بے جی پڑھنے والا چشمہ گھر بھول گئی تھی اسے لینے آیا تھا واپس پہنچا تو بس جا رہی تھی۔میں پیچھے

دوڑتا رہا۔لیکن ڈرائیور نے بس نہ روکی اور چلا گیا۔''

''کوئی بات نہیں شاید اسی میں کوئی اللہ تعالیٰ کی بہتری ہوگی ہم دونوں اکھٹے رہیں گے۔بس کسی کے گھر نہ جانا، خاص طور پر سرو کے گھر بالکل نہیں جانا بلانے پر بھی نہیں جانا۔''

''جیسے آپ کہیں گے''

میرا لوگوں کے گھر جانا بند ہو گیا۔لیکن ہندو محلّہ میں رہتے ہوئے اَب ہر محفل دیکھنے کا موقع مل گیا۔ جہاں شمولیت ناممکن ہوتی چُھپ کر دور سے دیکھتا۔اَکثر رسُومات میرے لیےنئی اور حیرت کا باعث تھیں۔روزانہ صبح سیر کے لیئے دریا پر چلا جاتا طُلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی ہندو پُوجا کرتے دکھائی دیتے۔دریا کے کم گہرے پانی میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں کا ایک چُلو بنا کر پانی کو چڑھتے سورج کی جانِب چند بار اُچھالتے۔چند بار پانی کو ابشار کی صورت چلو سے گراتے نیچے سے اوپر لیجاتے اور اسی طرح آبشار کو اوپر سے نیچے لاتے اور چند بار دائیں کندھے اور چند بار بائیں کندھے کے اوپر سے پانی کو پیچھے پھینکتے اور ہر بار اپنے گلے میں پہنے جنئو کے دھاگہ کو پھیرتے اور پانی میں غوطہ لگاتے۔اس دوران ابتدا سے آخر تک اشلوک ہی پڑھتے رہتے اور پوتر ہو کر واپس گھر، مَندر یا دُکان کی جانِب چلے جاتے۔یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ 'سورج پوجا' یا 'جل پوجا' تھی، وہ کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوئی۔ہو سکتا ہے کہ وہ ان کا اَشنان کرنے کا طریقہ یا عبادت کا کوئی حصہ ہو۔

ایک روز لوگ ایک اَرتھی (جنازہ) اُٹھائے گلی سے گزر کر دریا کی جانِب گئے۔ارتھی کے ساتھ پندرہ بیس سوگواران آہستہ آہستہ ہری اوم ہری اوم کا ورد کر رہے تھے۔ میں اُن کے جانے کے چند منٹ بعد دریا پر چلا گیا۔میرا خیال تھا کہ اَب مردہ کی کریا کرم کے لیے شمشان گھاٹ پر چتا جلائیں گے اور کریا کرم کی دِیگر رَسُومات ادا کریں گے۔لیکن خلاف معمول وہ اَرتھی کو کشتی میں رَکھ کے دریا کے اَندر گہرے کھڑے پانی میں لے گئے۔چار ملاحُوں نے دو لمبے بانسوں (وَنج) کی مدد سے کشتی کو ساکت کھڑا کیا اِس کے بعد لاش کو جل بُرد کرنے کا عمل شُروع کیا گیا۔لاش کشتی کے درمیان میں رکھ دی ایک براہمن لاش کے سرہانے کھڑے ہو کر کُچھ پڑھتا رہا اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد لاش کے گرد چکر لگاتا۔چکر لگانے کے دوران پنڈت اور کشتی میں موجود سوگوار اونچی آواز میں اشلوک پڑھتے۔اِس کے بعد کشتی میں سوار لوگ بشمُول ملاحُوں اور

دریا کے کنارے پر کھڑے لوگوں نے اِکھٹے مِل کر اُونچی آواز میں اَشلوک پڑھنے شروع کر دیئے اور اَرتھی کو آہستہ آہستہ پانی میں ڈُبو دیا۔میں نے ساتھ کھڑے ایک شخص سے دریافت کیا۔

''کہ اُنھوں مُردہ کو جلانے کی بجائے پانی میں کیوں ڈُبو دیا''۔

وہ بولا۔

''اکثر عمر رَسیدہ شخص اپنی لاش کو جلانے کی بجائے جَل پروان کرنے کی خواہش کرتا ہے۔اَلبتہ اگر کوئی جوان بھی اِس خواہش کا اِظہار کرے تو اُس کی لاش کو بھی حسبِ خواہش جلانے کی بجائے ارتھی کو وَزنی پتھروں میں جکڑ کر جَل پروان کر دیا جاتا ہے۔''

ایک بار ہمارے ہمسایہ میں ایک لڑکی کی ویدی (شادی) ہوئی۔بارات کسی گاوں سے آئی تھی۔بارات کو خوش آمدید کہنے کے لئے لڑکی والے بازار میں کھلی جگہ ڈاک خانہ کے پاس چلے گئے۔بارات کو گھر لانے سے پیشتر ملنی کی رَسم ڈاکخانہ کے سامنے ادا کی گئی جو میں نے ڈاک خانہ کے برآمدہ میں کھڑے ہو کر دیکھی۔بارات کی آمد پر مہمانوں اور میزبانوں کے درمیان آمنے سامنے دونوں طرف کے پنڈت میراثی بھانڈوں کو ساتھ لیے کھڑے ہو گئے۔لڑکے والوں کی پگڑیوں کا رنگ لڑکی والوں کی پگڑیوں سے مختلف تھا۔پہلے لڑکے کا باپ سامنے آیا۔لڑکے کی جانِب سے آمدہ میراثی نے لڑکے کا شجرہ نسب بیان کیا کہ فلاں ولد فلاں کہنے کے بعد رُکا پھر بولا فلاں کا پوتا اور فلاں کا پڑپوتا اور اس کے ساتھ اُس نے سات آٹھ پشتوں کا شجرہ اپنی یادداشت کو ظاہر کرنے کے لیے پیش کیا۔درمیان میں وہ ایک جگہ اٹک گیا۔اسے کوئی نام یاد نہ آ رہا تھا۔ایک شخص نے اسے لقمہ دیا کہ فلاں بزرگ کا نام بھی لو جو کوئی بڑا امیر جہاندیدہ اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا دوست اور سرکاری افسر تھا۔فوراً بولا۔

''میں اُس طرف بھی آتا ہوں صبر کرو''

پھر وہ اُسی رفتار سے بولتا گیا اور بہت سے نام پکارے۔اسی طرح اس نے لڑکے کی ماں کا شجرہ نسب بھی بیان کیا۔آخر میں میراثی کو لڑکے کے باپ نے خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔اس کے بعد لڑکی کا باپ اِسی طرح سامنے آیا۔دوسرے میراثی نے پہلے کا مقابلہ کرتے ہوئے اور زیادہ تفصیل سے لڑکی کے والدین کا شجرہ نسب بیان کرنا شروع کر دیا دونوں میراثی اپنے علم اور یاداشت کا رُعب ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے اُسے بھی خاموش کروایا گیا۔دونوں مراثیوں نے

بہت زیادہ وقت لے لیا تھا۔ تعارف کے ختم ہونے پر دونوں نے مصافحہ کیا گلے مِلے اور لوٹ گئے۔
اِس کے بعد لڑکے اور لڑکی کے ماموں و دیگر رشتہ دار باری باری آئے دونوں طرف کے شجرہ نسب
بیان ہوئے اور تعارف مکمل ہو جانے کے بعد دونوں نے ہاتھ ملائے گلے مِلے اور واپس لوٹ
گئے۔

بہت عرصہ بعد میں مغربی افریقہ کے ایک ملک میں حکومت پاکستان کی جانب سے
ڈیپوٹیشن پر ملازمت کر رہا تھا۔ میرا پرنسپل ایک ہندو تھا۔ اس کی بیوی کو باتوں باتوں میں جب
معلوم ہوا کہ میرے دونوں بھائی اور بہنیں اپنی خالہ اور چچا کے گھر شادی شدہ ہیں۔ تو وہ پاپ پاپ
پکارتی رہی۔ بعد میں جب اس سے ہندو بچوں کی شادی کا پوچھا، تو اس نے بتایا۔ کہ ان کے
مذہب میں دادا اور نانا کی اولاد سے شادی گناہ تصور ہوتی ہے۔ صرف اِن بچوں کی شادی جائز
تصور کی جاتی ہے۔ جو آپس میں خُون کے رِشتہ میں دادا اور نانا تک کہیں بھی اکٹھے نہ ہوں۔ تھوڑی
دیر خاموش رہنے کے بعد خود ہی بولی کہ ایک سو سال پیشتر یہ شرط باپ کے دادا اور نانا تک
ہوتی۔ جس کی وجہ سے نوے فیصد باراتوں کو واپس جانا پڑتا۔ پچھلی صدی کی ابتدا میں ہندو مذہب
کی ایک اعلیٰ کمیٹی نے اس شرط کو باپ کے دادا، اور نانا کی بجائے لڑکے اور لڑکی کے دادا، اور نانا
تک محدود کر دیا۔ لڑکے اور لڑکی کے والد اور ماموں کے شجرہ نسب سے مراد لڑکے اور لڑکی کے والد
اور والدہ کا شجرہ نسب ہوتا۔ تاہم اس رسم کو انتہائی مختصر رکھنے کی بجائے مزید رشتہ داروں کا مختصر شجرہ
نسب بھی بیان کیا گیا۔ بظاہر یہ ایک تعارفی میلہ تھا۔ جس میں نئے رشتہ دار متعارف ہوئے۔ لیکن
بین السطور نہاں مقصد یہ مذہبی پابندی تھی۔ ملنی کی رسم کے باعزت اختتام پر مغرب سے
پیشتر بارات کو گھر میں لا کر شیرینی سے تواضع کی گئی۔ باراتی دو لائنوں میں آمنے سامنے ایک دری
پر بیٹھ گئے اور تین چار لوگ اُن کی تواضع کے لیے مٹھائی اور نیلوفر کے پتے (lotus,
Nymphaea or water lily) اُٹھائے اُن کے درمیان سے گزرے۔ پہلے شخص کے
ہاتھ میں دُھلے ہوئے نیلوفر کے بڑے بڑے پتے تھے۔ جن سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔
وہ تھوڑی دیر پیشتر پانی سے نکال کر لایا تھا۔ وہ ہر باراتی کے سامنے ایک ایک پتا رکھتا ہوا آگے بڑھتا
گیا۔ اس کے پیچھے آنے والے دوسرے شخص نے ایک ٹوکرا بالوشاہی سے بھرا اُٹھا رکھا تھا وہ اُس
ٹوکرے میں سے ایک بالوشاہی اُٹھا کر ہر ایک کے سامنے سبز پتے پر رکھتا گیا۔ اُس کے بعد آنے

والے شخص نے اُسی ترتیب سے ہر ایک کے سامنے دیگر مٹھائیاں رکھنی شروع کر دیں۔ نیلوفر کے
پتوں کو پلیٹ کے طور پر استعمال کیا گیا، چمچ کا کوئی رواج نہ تھا۔ ایک بار تقسیم کنندہ کے ہاتھ سے
ایک بالوشاہی دری پر گر گئی۔ اُس نے اُٹھا کر گھر کے باہر پھینک دی۔ وہ ناپاک ہو گئی تھی۔ منہ میٹھا
کروانے کے بعد ویدی کی رسومات شروع کی گئیں۔ درمیان میں رکھی تمام دریاں ہٹا دی گئیں۔
ایک کُھلی جگہ پر دائرہ کھینچ کر منڈپ بنایا گیا۔ پھر پوتر آگ کو جلانے کے لیئے لکڑیاں مربع شکل
میں ایک خاص ترتیب میں رکھی گئیں۔ اس دائیرہ کے گرد کچھ فاصلہ پر دریاں بچھائی گئیں۔ ایک
جانب دری پر پنڈت جی مہاراج جو اپنے مخصوص لباس میں پیشانی اور سینہ پر مختلف رنگوں کی
لکیریں کھینچے تھے، بیٹھ گئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں گیتا تھی دوسرے میں پیتل کی لٹیا جس میں ایک
چھوٹی کٹوری سے سیدھی ڈنڈی جڑی تھی۔ منڈپ میں رکھی لکڑیوں کو گائے کے دودھ سے تیار کردہ
گھی ڈال کر روشن کیا گیا۔ پنڈت جی مہاراج دیر تک گیتا کے مخصوص اشلوک پڑھتے رہے۔ اِس
دوران وہ شواہو کا لفظ پُکارتے رہے اور گھی جلتی آگ پر ڈالتے رہے۔ جس سے فضا مُعطر ہو جاتی۔
پھیرے شروع کرنے سے پیشتر لڑکے اور لڑکی کے والدین کو اَگنی کے دائیں اور بائیں جانب
بٹھایا گیا۔ پہلے لڑکے کو پوتر اَگنی کے سامنے بٹھا کر پنڈت نے گیتا کے مخصوص اشلوک پڑھے اور
پھر لڑکے سے پڑھوائے گئے۔ پھر کنیا کو بُلوا کر لڑکے اور لڑکی کے پلوؤں کو ایک گرہ دی گئی۔ اِس
کے ساتھ ہی پوتر آگ کے سامنے لڑکے اور لڑکی نے جنم جنم کا ساتھی ہونے کا عہد کیا۔ آگنی کے گرد
چکر لگانے کے بعد لڑکے نے عہد کیا جب وہ فلاں نیک کام کرے گا تو اپنی بیوی کو اپنے ہمراہ بائیں
جانب بٹھا کر یہ تمام کام سر انجام دیگا۔ اس عہد کو مزید پختہ کرنے کے لیے اگنی کے گرد چکر لگوائے
گئے۔ دوبارہ لڑکی کو لڑکے کے دوسری جانب بٹھا کر اگنی کے سامنے لڑکے نے عہد کیا کہ جب کبھی
وہ غریبوں میں دان تقسیم کرے گا تو پتنی کو دائیں جانب بٹھا کر اُس کی خواہشات اور رائے کا
احترام کرتے ہوئے دان تقسیم کرے گا۔ دولہا اور دلہن نے اَگنی کے گرد مقررہ پھیرے مکمل کیے۔
اِس طرح ویدی کے تمام ستُون مکمل کیے گئے۔ ہر ستُون کی اِبتداء اوم تت ست کے الفاظ سے کی
جاتی ابتدا اور آخر میں گھی کا ایک چمچ اَگنی پر ڈال کر فضا کو مُعطر کیا جاتا۔ پنڈت ہر ستون کے شروع
اور ختم ہونے پر ''سواہو'' (شواہو) کا نعرہ لگاتا۔ بعض دَفعہ اِس لفظ کو ''سواہا'' بھی کہا جاتا۔ بلا آخر
لڑکی پیا کے گھر سدھار گئی۔

خون کی بارش

دوسری جنگ عظیم کے ختم ہو جانے کے بعد بھائیا جی عبدالغفور کو فوج کی ملازمت سے فارغ کر دیا گیا۔ وہ گاؤں میں بے جی کے پاس آ گئے۔ اُنہیں بے جی نے ہمیر پورسدھڑ بھیج دیا کہ جا کر بھائی اور والد صاحب کو لے آؤ۔ اب اکثر ہندو مجھ سے بڑے بھائی کی آمد کی وجہ دریافت کرتے کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد ہندوؤں نے وزیر آباد سے جموں آنے والی ریل گاڑی کو جموں ریلوے سٹیشن پر روک لیا۔

بھائی جان کی آمد کے ایک ہفتہ بعد خبر آئی، کہ جو بس جموں سے ہمیر پورسدھڑ آیا کرتی تھی۔ اس کا مسلمان ڈرائیور بس لے کر پاکستان فرار ہو گیا ہے۔ دوسری بس کو ہمیر پورسدھڑ آنیکی اجازت نہ دی گئی۔ پاکستان سے ہر قسم کی ڈاک کی ترسیل اور آمدورفت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایک کِشتی کبھی کبھار جموں سے سرکاری ڈاک دریائے توی کے ذریعہ اکھنور، اور دریائے چناب کے راستہ ہمیر پورسدھڑ لے کر آتی۔

پنجاب میں ہندو مُسلم فسادات پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی شُروع ہو گئے تھے۔ گو ریاست جموں وکشمیر میں ہر جگہ سکون تھا۔ کوئی جلوس کہیں بھی ہندو یا مسلمان لیڈر نے نہ نکالا۔ البتہ ہندو دو تین روز کی پرانی اخباریں ''مہا بھارت'' اور ''پرَتاپ'' یا جموں سے چھپنے والا روزنامہ ''رَنبیر'' اَپنے ذرائع سے منگوا کر اِن کے صفحات علیحدہ علیحدہ کر کے گروپوں کی شکل میں بیٹھ کر پڑھتے۔ ہندو مسلم تناؤ دن بہ دن بڑھنا شروع ہو گیا۔ میرا جب کبھی بازار سے گزر ہوتا لوگ نفرت اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے۔ اکثر لڑکے مجھے نام کی بجائے 'او مسلے' کہہ کر پکارتے، پتھر مارتے اور بھاگ جاتے۔ میں نے بازار میں جانا کم کر دیا۔

بہت جلد ہندو مہاجر ہمیر پورسدھڑ پہنچنا شروع ہو گئے۔ گجرات سے آئے مہاجرین میں سے ایک وکیل صاحب بھی تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حکومتِ پاکستان نے غیر مسلم اقلیت کی حفاظت کی خاطر ایک مہاجر کیمپ گجرات ریلوے سٹیشن پر قائم کر دیا۔ اور گجرات کے تمام غیر مسلم شہریوں کو وہاں پر اکٹھے ہونے کی ہدایت کی تا کہ اُن کی حفاظت کا معقول انتظام کیا جا سکے۔ وکیل صاحب نے اپنے گھر سے ریلوے سٹیشن تک پہنچنے کا قصہ لہک لہک کر سُنایا اور بتایا کہ گُجرات شہر کی پولیس کو پانچ سو روپیہ فی کس رِشوت دی۔ وکیل صاحب نے بتایا کہ ہم میاں بیوی کے سروں پر پولیس کی

پگڑیاں رکھ دی گئیں۔ تا کہ سڑک سے دیکھنے والے ہمیں پولیس کا سپاہی سمجھیں۔ انہیں اسی حالت میں پورے شہر کی گشت کرانے کے بعد ریلوے سٹیشن کیمپ پہنچایا گیا۔ ان ہندوٗ مہاجرین نے ہمارے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا جو پاکستان میں ان کا مسلمانوں سے تھا۔ کچھ گھٹن کم ہوئی۔ مقامی اور مہاجرین کے مزاج اور اقدار میں بہت فرق تھا۔ ہندو گھرانوں سے دوستی کی بجائے وہ ہم سے ملنا زیادہ پسند کرتے۔ ان کا خیال تھا، کہ حکومت پاکستان جلد حالات پر قابو پا لے گی، اور امن دوبارہ قائم ہو جائیگا۔ وکیل صاحب بھی اسی خیال کے تحت بارڈر کے نزدیک ترین شہر میں امن اور سکون کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

اکثر وکیل صاحب اور اُنکی بیوی دونوں ہمارے گھر آ کر بھائیا جی اور والد صاحب سے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے۔ ان کا سات سال کا بیٹا جگدیش میرے ساتھ نتھی ہو گیا۔ کئی بار پورا دِن میرے ساتھ بیٹھا گپ لگا تا اور کھانا بھی میرے ساتھ کھالیتا۔ ایک بار وکیل صاحب نے ہمیں اپنے گھر دعوت پر بلایا، بھائیا جی نے ان کے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ وکیل صاحب کی پتنی گھر سے کھانا پکا کر لانے کی بجائے سامان لے کر ہمارے گھر آ گئی۔ میاں بیوی دونوں نے مل کر اَپنے برتنوں میں کھانا پکایا۔ ہم سب نے مل بیٹھ کر اپنے اپنے گھر کے برتنوں میں کھانا کھایا، وکیل صاحب نے اپنے گلاس میں ہمارے جگ کا پانی پیا۔ ان کی پتنی اپنا جگ اور پانی نہ لائی تھی۔ والد صاحب نے اس دن کھانا نہ کھایا اور روزہ کا بہانہ کر دیا۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں ہمیر پورسدھڑ میں افواہ پھیلی کہ وزیری پٹھان حملہ کر کے تمام مردوں کو قتل کر دیتے ہیں اور عورتوں کو ایک ریوڑ کی صورت ہانک کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس خوف کے زیر اثر وکیل صاحب کی بیوی نے بھائی جان سے بہن بنانے اور اسی نسبت سے ضرورت پڑ جانے پر پناہ کی درخواست کی۔ سروشانی نے مجھ سے وعدہ لیا کہ وہ سب خطرہ کی صورت میں کچن کی کھڑکی کے راستہ اَندر آ جائیں گے۔ میں پٹھانوں سے کہوں گا کہ ہمارے گھر میں صرف ہمارے خاندان کی خواتین ہیں۔ بچیوں کو اَپنی بہن ظاہر کروں بڑھیا تمہاری نانی اور میں تمہاری خالہ اور بے جی پاکستان گئی ہیں۔ میں نے بھی روائتی راجپوت بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ پہلے وہ ہمیں ماریں گے پھر وہ گھر میں دَاخل ہوں گے۔ اِسی قسم کے وعدے بھائیا جی نے بھی کیے۔ ہم میں سے کسی نے بھی اِس طرف دھیان نہ کیا کہ کھڑکی کو اَندر سے کھول دِینا دروازہ کھول دینے کے

برابر ہے۔ہم تینوں اِسی زعم میں تھے کہ ہم پر حملہ نہیں ہوسکتا۔پٹھانوں سے تحفظ اور اُن کے ممکنہ حملے کے خوف کو دُور کرنے کے لیے مہاراجہ جموں وکشمیر نے اَپنی ہندو رعایا میں اسلحہ تقسیم کیا۔اسلحہ وصول کرنے کے بعد اَکثر لڑکے مجھ سے پُوچھتے۔

''آپ کو بھی کوئی اسلحہ تھانیدار نے دیا ہے''

''نہیں'' میرا جواب ہوتا۔

''کچھ بھی نہیں' کوئی تلوار چھوی کلہاڑی یا کوئی پستول وغیرہ تھانیدار نے آپ کو کچھ بھی نہیں دیا۔''

'' کچھ بھی نہیں''

ایک روز سروشانی نے بھی یہ سوال مجھ سے کیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ ہمارے پاس کسی قسم کا کوئی اسلحہ نہیں تو وہ گھر سے پرانی تلوار لے کر آئی اور مجھے دی کہ یہ اپنے پاس رکھو اور کسی کو نہ بتانا کہ یہ تلوار میں نے تمہیں دی ہے۔ وہ ایک زنگ آلودہ تلوار تھی ۔لیکن دوسرے روز ہی وہ تلوار سروشانی مجھ سے تیز کروانے کے بہانہ واپس لے گئی اور مجھے واپس نہ دی۔

ایک پاکستانی ہندوٗ مہاجر جو پاکستان میں کسی پرائمری سکول کا ٹیچر تھا۔ وہ صبح ناشتہ کر کے آتا اور شام تک ہمارے ساتھ رہتا۔اَکثر ہمارے ساتھ دوپہر کا کھانا بھی کھاتا۔ایک روز مجھے سر گوشی کے اَنداز میں آہستہ سے بولا۔

''فاروق بات سننا۔''

میں اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ماسٹر نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔

''جب تم کو اسلحہ ملے تو مجھے فوراً بتانا''

''اچھا''

کہہ کر میں نے سر ہلایا اور خاموش ہوگیا۔

ماسٹر نے پھر کہا

''کسی اور کو نہ بتانا''

اور پیچھے ہٹ کر بھائیا جی سے باتیں کرنے لگا۔

بھائیا جی نے اسے میرے کان میں بات کرتے دیکھ لیا تھا۔اس کے جانے کے بعد بھائیا جی نے مجھ سے پوچھا۔

''وہ کیا کہتا تھا''

وہ کہہ رہا تھا۔جب اسلحہ آئے تو مجھے بتانا۔

بھائیا جی بولے۔

''بہادر راجپوت،اس کے معنی یہ ہیں مہاراجہ نے تمام ہندو رعایا میں اسلحہ تقسیم کیا ہے''

اکتوبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ ہمارے لیئے بڑا پریشانی کا مہینہ تھا۔کہیں نہ کہیں سے روزانہ فساد کی خبر آجاتی، جو ہمارے لیئے پریشانی کا موجب ہوتی۔جب سے پاکستان سے مواصلات کا سلسلہ ٹوٹا،ڈاک خانہ کی آمدنی بھی ختم ہوگئی تھی۔کوئی کبھی کبھار لفافہ یا خط خرید کر لے جاتا۔یا کوئی منی آرڈر کرنے آجاتا۔اسی سے ہمارا گزارہ ہورہا تھا تین ماہ سے والد صاحب ملازمین کو تنخواہ بھی نہ دے سکے تھے۔

رات کے چوکیدار نے خبردار کا نعرہ اُونچا لگانا شروع کر دیا۔گھر کی دیوار پر روزانہ ہی ڈنڈے کی ایک زوردار چوٹ لگا کر جاتا۔بھائیا جی اس حرکت کو زیادہ محسوس کرتے۔میں اَکثر نیند سے بیدار ہوجاتا۔والد صاحب چوکیدار کی اس حرکت کی پرواہ نہ کرتے۔ایک روز اجنبی لوگوں کی آمدورفت میں اِضافہ ہوگیا۔سرشام ماسٹر دین محمد،جس کا دوسری گلی میں پُختہ مکان تھا، کا بیٹا والد صاحب کے لیے پیغام لایا۔

''اَبو آپ کو بُلاتے ہیں۔''

والد صاحب جانے لگے تو بھائیا جی بھی ان کے ہمراہ ہوگئے۔میں گھر پر اکیلا تھا۔کچھ دیر بعد میں بھی اُن کے پاس چلا گیا پیچھے گھر کا دروازہ کُھلا ہی رہ گیا خیال تھا کہ جلد واپس آجاونگا۔ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا تو بھائیا جی نے بتایا کہ حالات سخت کشیدہ ہیں آج رات ہم یہیں رُکیں گے۔ وہ رات تمام گھر والوں نے جاگ کر گزاری۔بھائیا جی سابقہ فوجی تھے،انگریزی فوج کی ملازمت سے حاصل کردہ تجربہ سے استفادہ کیا۔

سب سے پہلے انہوں نے ماسٹر صاحب سے کہا کہ اپنے دفاع کے لیے گھر میں موجود تلوار خنجر کلہاڑی،نئی یا پرانی بندوق یا تلوار جو بھی ہے وہ لے آو۔ماسٹر صاحب نے بتایا کہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔بھائی جان بولے گھبرانے کی کوئی بات نہیں گھر میں لوہے کی جو چیز بھی ہے جس حالت میں بھی ہے لے آو۔اس طرح انہیں ایک ہتھوڑی دو ٹوٹے بیلچے، ایک چارپائی کا ٹوٹا ہوا

سیرو، ایک لوہے کی کڑاہی، بغیر دستہ کے ایک کلہاڑی مل گئی۔ ماسٹر صاحب نے بچوں سے کہا کہ گلی سے پتھر اکٹھا کر لاؤ۔ بچے اپنی چھوٹی بہن کو بھی ساتھ لے گئے اور تھوڑی دیر میں لوٹے۔ وہ جھولی میں ریت اور کنکریاں بھر لائے تھے۔ دوبارہ انہیں گلی میں جانے سے منع کر دیا گیا۔عورتوں سے کہا کہ گھر کے اندر پڑی اینٹوں اور پتھروں کے ٹکڑے جتنے اپنے پاس اکٹھا کر سکتیں ہیں کر لیں۔ ماسٹر صاحب کی بیٹی نے اپنے ایک پرانے چولہے سے چار پانچ اینٹوں کے ٹکڑے نکال لیے۔اب ہم سب کے پاس کچھ نہ کچھ آ گیا۔ سب کے حوصلے بلند ہو گئے، عورتوں کے پاس اینٹوں کے ٹکڑے اور پتھر اور بچوں کے پاس کنکریاں، بھائیا جی نے اپنے پاس ہتھوڑی اور کڑاہی رکھ لی۔ مجھے چار پائی کا سیرو دے دیا اور ماسٹر صاحب کے داماد کو کلہاڑی اور بیلچہ دے دیا۔ مجھے بچوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ بھائیا جی نے دفاع کا پروگرام بنایا۔ بھائیا جی بولے اول تو اللہ کرے گا کوئی شخص گھر کے اندر آنے کی جرات نہیں کریگا۔ ہم گھر سے باہر نہیں جائیں گے۔لیکن پھر بھی دشمن تو دشمن ہے ہم مرنے سے پہلے جتنا ممکن ہو سکا انہیں نقصان ضرور پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ دروازہ سے آئے تو ان کا پہلا وار ہم دونوں سنبھالیں گے۔ اگر دیوار پھلانگ کر اندر آئیں تو والد صاحب اور ماسٹر دین محمد ان پر، عورتوں کی مدد سے اینٹوں اور پتھروں سے مقابلہ کریں گے۔ اینٹیں ختم ہو جائیں تو فاروق اور عورتیں انہیں ڈنڈے ماریں گے۔ ہم دونوں دروازہ خالی نہیں چھوڑیں گے۔ بھائیا جی نے ماسٹر صاحب کے داماد سے کہا کہ ہم ان کا پہلا وار بیلچہ پر لے کر ان پر ہتھوڑی اور کلہاڑی سے حملہ کریں گے۔ بھائیا جی نے ایک اینٹ کا ٹکڑا ماسٹر صاحب کے داماد کو پکڑایا۔ اور کہا کہ یہ گویا تمہارے ہاتھ میں ایک گرنیڈ ہے۔ جب کوئی جتھہ گلی سے گزرے تو تم آہستہ سے پوچھنا 'بٹن نکالوں' اور میں کہوں گا، 'نہیں ابھی نہیں۔ یہ ہمارا دشمن کو خوف زدہ کرنے کا نفسیاتی ہتھیار ہوگا۔ اس پلاننگ کے بعد عورتوں سے کہا کہ آپ سب آرام سے سو جائیں۔ البتہ اپنے اپنے 'ہتھیار' اپنے ساتھ رکھیں۔ تاکہ بوقت ضرورت ان کے استعمال میں دیر نہ ہو جائے۔ ویسے امید ہے کچھ نہیں ہوگا۔ صبح پھر اگلا پروگرام سوچیں گے۔ والد صاحب اور ماسٹر صاحب نے عشا کی نماز برآمدہ میں ہی پڑھنی سروع کر دی۔ میں بغیر بستر چار پائی پر لیٹ گیا نیند آئی اور سو گیا۔ بھائیا جی اپنے ساتھی کو لیے بڑی دلیری سے تمام رات جاگتے رہے۔ صبح جب میں اُٹھا تو بڑے فخریہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئے کہنے لگے۔

''فاروق تم تو سو گئے تھے۔ رات بھر کئی جتھے ماسٹر صاحب کے گھر کا چکر لگاتے رہے لیکن کسی نے اَندر آنے کی جرأت نہ کی۔ جب کوئی گروپ گزرتا تو ماسٹر صاحب کا دَاماد مجھ سے سرگوشی کے اَنداز میں اینٹ کے ٹکڑے کو ہاتھ میں پکڑ کر دریافت کرتا، کیا اب بٹن نکال دوں؟''

اور میں کہتا۔

''ابھی نہیں احتیاط''

گویا ایک گرنیڈ اس کے ہاتھ میں ہے اور بٹن نکالنے سے پھٹ جائے گا۔

علی الصبح نماز کے وقت تھکے ماندے، ہم اپنے گھر آ گئے، دیکھا کہ کچن میں چند چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔ ہم نے اس طرف توجہ نہ دی۔ جب میں گھر سے دودھ لینے کے لیے بازار جانے لگا تو سروشانی نے دیکھتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

''رات آپ لوگ کہاں تھے۔ چولہے میں آگ جلتی چُھوڑ گئے تھے۔ میں نے جا کر بُجھائی''

تھوڑی دیر بعد خود ہی بولی۔

''اچھا ہوا۔''

میں نے اُس سے پوچھا کیوں رات کیا ہوا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا، بس اتنا کہا۔

''کچھ نہیں خیر ہوئی''۔

میں نے مزید کریدنا مناسب نہ جانا اور بازار چلا گیا۔

بازار سے دودھ لینے کے بعد واپس گھر کی جانب لوٹ رہا تھا، دیکھا کہ بہت سے لوگ بازار میں ایک جگہ دائرے میں کھڑے ہیں۔ عام طور پر خبریں سُننے والا دائرہ چُھوٹا ہوتا۔ آج دائرہ نسبتاً بڑا تھا اور سامعین کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ میں دو کھڑے لوگوں کے درمیان سر نکال کر اُن میں شامل ہو گیا۔ ایک صاحب اُونچی آواز میں اخبار پڑھ رہے تھے۔ باقی تمام بڑے غور اور توجہ سے سُن رہے تھے۔ وہ مسلمانوں کے ہاتھوں صرف قتل و غارت کی خبریں سُنا کر ان کے جوش اور نفرت کو اُبھار رہا تھا۔ اِسی دوران ساتھ کھڑے ایک ہندو نے اَخبار پڑھنے والے لیڈر سے مخاطب ہو کر ریاستی پنجابی میں کہا۔

''پرماتما مکائی چھوڑے اناں مسلیاں کی۔ اناں ساڑیاں زنانیاں، بھراواں کی کوہی چھوڑیا، کیں جواب دیئے۔''

(خدا ان مسلمانوں کو تباہ کرے۔ ہماری عورتوں اور بھائیوں کو ذبح کر دیا، کس طرح جواب دیں۔)

''جواب کیویں دیئے، تسیں وی اناں کی وڈی ٹکی چھوڑو''

(جواب کس طرح دینا ہے تم بھی انہیں کاٹ کر ان کے ٹکڑے کر دو!)

اتنے میں میرے ایک ہم جماعت ہندو لڑکے نے مجھے وہاں کھڑا دیکھ لیا۔ اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''اُوے باو دا منڈا''

بابو کا بیٹا، اور آنکھوں سے میری جانب اشارہ کیا۔ لیڈر نے دائرے میں نظر دوڑائی، مجھے چہرے سے پہچان کر قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولا۔

''اوجہڑے گاو ماتا ناں ماس کھانڑیں تے اساں وچکار رہنڑیں، اناں کی مونڈوں مکاو''

(وہ لوگ جو گائے کا گوشت کھاتے ہیں اور ہم میں رہتے ہیں، ان کو تو جڑ سے کاٹ دو۔''

اس نے 'مونڈوں' پر خاص زور دیا۔

وہ والد صاحب کی چند روز پیشتر نڈالہ برانچ آفس کی جانچ پڑتال کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اس گاوں کے پوسٹ ماسٹر نے دعوت گائے کے گوشت سے کی تھی۔ ہمارے ہمراہ ڈاکخانہ کا ملازم، جس کا تعلق شودر ذات سے تھا، ہمیر پور سدھڑ واپس آ کر سب کو بتایا کہ ہم گائے کا گوشت کھا کر آ رہے ہیں۔

میں دائرہ سے نکل کر تیز تیز قدموں سے گھر آیا۔ بھائی جان کو سارا ماجرا سُنایا۔ انہوں نے والد صاحب سے بات کی۔ والد صاحب نے بغیر کسی گھبراہٹ کے کہا کہ میں جا کر تھانیدار سے بات کرتا ہوں۔ پھر آئندہ کا لائحہ عمل سوچتے ہیں۔ والد صاحب اُبھی یہ بات کر ہی رہے تھے، کہ گلی کے آخری دومنزلہ مکان کی ممٹی پر کھڑے ہو کر ایک ڈھولچی نے ڈھول پیٹنا شروع کر دیا۔ ڈھول کی آواز کا سُننا تھا کہ بھائیا جی عبدالغفور کے جسم میں بجلی سی کُوند گئی۔ وہ تو اس سگنل کی پہلے سے توقع میں تھے۔ گھبرا کر اُٹھے اور مجھے زور سے آواز دی۔

''فاروق کِدھر ہو باہر نِکلو''

حالانکہ میں ان کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ وہ بولے۔

''چُھوڑو ناشتہ اَب اِس کا وقت نہیں رہا بس نکلو۔''

والد صاحب سے کہا کہ آپ جلد جا کر تھانے میں رپورٹ کریں۔ والد صاحب کہنے لگے۔

''چائے پی کر چلتا ہوں۔''

بھائی جان نے اِصرار کیا کہ آپ جائیں۔ ابھی دومنٹ پیشتر فاروق کیا خبر لایا تھا۔

''اناں کی وڈی ٹکی چھوڑو''

دیر نہ کریں وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ یہ ڈھول کی آواز ایک پیغام ہے جو دُور تک جا رہا ہے۔ اُبھی نڈالہ چلتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر حالات کا جائزہ لیں گے اگر ٹھیک ہو گئے، تو واپس لوٹ آئیں گے۔ یُوں بھی ہجرت تو سُنت ہے۔ والد صاحب ہجرت کا لفظ سُنتے ہی اُٹھے اور تھانیدار کو ملنے تھانے چلے گئے۔ بھائی جان نے جلدی سے ایک بیگ لیا، جس وقت بھائیا جی اَپنا بیگ تیار کر رہے تھے۔ میں نے بھی ریاستی رواج کی پیروی میں قمیض کے اُوپر ایک اور قمیص پہن لی۔ اور بھائیا جی کی تقلید میں ایک بیگ بھی تیار کر لیا۔ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑا اور باہر آ گئے بھائیا جی نے باہر سے دروازہ کو کُنڈی نہ لگائی۔ میں کنڈی لگانے کے لیئے مڑا لیکن بھائی جان نے مجھا ایسا کرنے سے روک دیا۔ صُبح کا وقت تھا۔ گلی ابھی سنسان تھی۔ گلی سے نکل کر میدان میں پہنچے تو دیکھا کہ والد صاحب سامنے آہستہ آہستہ آ رہے تھے۔ یاس اور نا امیدی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ بھائیا جی نے دَریافت کیا۔

''کیا آپ کی تھانیدار سے ملاقات ہوئی؟ وہ کیا کہتا ہے۔''

والد صاحب نے بتایا۔ جب وہ تھانے پہنچے تو تھانیدار وردی پہنے گھوڑے پر سوار تھانے سے نِکل رہا تھا۔ والد صاحب اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔

''اُس سے کیا بات ہوئی''

''اس سے کوئی بات نہ ہوئی۔ اُس نے میری جانب نفرت سے دیکھا اور میرے کچھ کہنے سے پہلے بولا۔''

''باؤ جا خطرہ ہوا تو سب سے پہلے تمہیں پار کروادُوں گا''۔

''ابا جی وہ تو اتنی جلدی سرحد پار کروانے کا بندوبست نہیں کر سکے گا۔ اُس کی بات پر یقین نہ کریں، اب وقت بالکل نہیں رہا، اللہ کا نام لیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔''

والد صاحب ایک ذُمہ دار سرکاری افسر کی طرح سوچنے کے لیے وہیں رُک گئے۔ تھوڑی دیر رکنے

کے بعد کہنے لگے۔

''غفورُ دفتر کی چابیاں تو کسی کے حوالے کر دوں''۔

بھائی جان نے کوئی جواب نہ دیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں والد صاحب اور بھائیا جی کے درمیان کھڑا تھا۔ بھائیا جی جو دس قدم آگے جا چکے تھے۔ رک کے پیچھے مڑ کے والد صاحب اور میری جانب دیکھا اور بولے۔

''اچھا ابا جی خُدا حافظ مُجھے جان عزیز ہے۔ میں چلا۔۔''

وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئے۔ چند قدم آگے جا کر کے والد صاحب سے مخاطب ہونے کی بجائے میری جانب دیکھا اور بولے۔

''فاروق تم نے آنا ہے تو آؤ میں جا رہا ہوں۔''

میں نے والد صاحب کی جانب دیکھا۔ پھر بھائیا جی سے مخاطب ہوا۔

''ذرا رک جائیں۔''

اور والد صاحب کی جانب دیکھ کر ان سے دریافت کیا۔

''ابا جی میں کیا کروں؟''

بھائیا جی نہ رکے اور آگے بڑھ گئے۔ اَبھی وہ چند قدم ہی گئے تھے۔ کہ والد صاحب کو تھانیدار کی بے رُخی بے مروتی نے غیر محفوظ ہونے کا احساس دلا دیا۔ اب بھائیا جی کے جانے کے بعد، والد صاحب کو تنہائی کا احساس بھی ہو گیا۔ اُنہوں نے بھائیا جی کو آواز دی۔

''غفورُ کو میں بھی چلتا ہوں۔''

صبح کا وقت تھا، ڈسپنسری بند تھی، تھانے کے گیٹ پر بھی کوئی نہ تھا۔ تھانیدار پہلے ہی کسی مشن پر جا چکا تھا۔ اِس وقت میں، والد صاحب اور بھائیا جی ہی کچے راستے پر ایک لائن میں جا رہے تھے۔ اِبتداء میں ہم چل رہے تھے۔ تا کہ دور سے دیکھنے والے کو شک نہ ہو کہ ہم شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہم تینوں گھبراہٹ کے عالم میں تھے، شہر کی حدود سے نکلنے کے لیئے لمبے لمبے ڈگ بھر رہے تھے۔ لیکن شہر کی حد تھی کہ ختم نہیں ہو رہی تھی۔ باغ کے پاس پہنچتے ہی تینوں نے درختوں کی اَوٹ میں تیز چلنے کی بجائے دوڑنا شُروع کر دیا۔ میں ان کے ساتھ قدم سے قدم تو نہ ملا سکتا تھا۔ مجھے اکثر دوڑ کر ان کے ساتھ شامل ہونا پڑتا۔ مجھے اُس ہندوؤ کا مکالمہ یاد آ رہا تھا، جو صبح صبح مجھے

قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر اپنے ساتھیوں کو کہہ رہا تھا۔

''اناں کی وڈی ٹکی چھوڑو''

کپڑے کا بیگ جو میں نے جلدی جلدی تیار کیا تھا ایک بوجھ بن گیا۔ کبھی ایک ہاتھ میں کبھی دوسرے میں لٹکائے اُن کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ والد صاحب اور بھائی جان تیز تیز قدموں سے آگے جا رہے تھے۔ ایک بار جب فاصلہ زیادہ بڑھ گیا تو بھائیا جی اور والد صاحب رک گئے۔ بھائیا جی نے مجھے تھیلا ایک ہاتھ سے دوسرے میں بدلتے دیکھ لیا۔ فوراً تحکمانہ انداز میں بولے۔

''سٹ اس خزانہ نوں۔ اسانوں پہلے ہی دیر ہو گئی اے''

میں نے تھیلا دور گنے کے کھیت میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ چند دنوں کے بعد آ کر خود اٹھا لوں گا۔ تھیلا پھینک کر میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب میں ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس دوران بھائیا جی نے کھیتوں میں نگاہ دوڑائی اور پھر دوڑنے لگے۔ میں اب انکا ساتھ دے رہا تھا۔ بھائیا جی کو میرے مل جانے کا انتظار نہ کرنا پڑ رہا تھا ہر نئے کھیت میں داخل ہونے کے بعد یا کچھ دیر دوڑنے کے بعد بھائیا جی رک جاتے اور پیچھے نگاہ دوڑاتے میں حیران تھا کہ وہ پیچھے کس کو دیکھ رہے ہیں۔ ماسٹر دین محمد کے داماد کو کسی نے ایک روز پیشتر ہی خبر دی تھی۔

''رات باہر سے آئے ہندو مسلمان بستیوں پر دھاوا بولنے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں۔ اُن کے حملے سے پیشتر ہی نکل جاؤ۔''

یہی خبر دینے کے لیے اُنھوں نے والد صاحب کو اپنے گھر بُلایا تھا۔ والد صاحب اور بھائیا جی کو تو انہوں نے خبر دے دی تھی۔ لیکن فضاء میں مکمل سکون تھا۔ کسی کو بھی یقین نہ تھا کہ حملہ ہو گا۔ رات مکان کے گرد ہندوؤ پہرے نے بھائی جان کا شک یقین میں بدل دیا تھا۔ لیکن والد صاحب کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے یہی وجہ تھی کہ بھائیا جی میری لائی ہوئی خبر کے بعد کسی غیر معمولی بات کے انتظار میں تھے۔ ڈھول کی آواز سنتے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

ماسٹر دین محمد اور اس کے داماد کو والد صاحب اور بھائیا جی کے چلے آنے کے بعد، تنہائی کا احساس ہوا۔ وہ بیوی بچوں کو لیے اندھیرے میں ہی گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اُسی رات چند ہندوؤ ہمارے کچن میں کُھلتی کھڑکی کے راستہ اَندر آئے ہمیں تلاش کیا نہ پا کر خاموشی سے واپس

چلے گئے ۔سروشانی نے صُبح مجھ سے چولہے میں جلتی آگ چھوڑ جانے کا گِلہ کیا،لیکن کسی کے آنے کا ذکر تک نہ کیا۔ماسٹر دین محمد فیملی میں عورتوں اور بچوں کی وجہ سے اُن کی رفتار بہت سُست تھی ۔ ماسٹر دین محمد کی بیوی کو گھر بار اور مانوس گلیاں چھوڑنے کا دکھ ہو رہا تھا ۔وہ ہر لمحہ خاوند کو برا بھلا کہہ رہی تھی ۔اَبھی ریاستی بارڈر تک کا آدھا راستہ بھی طے نہ کر سکے تھے ۔باغ نظروں سے اوجھل نہ ہوا تھا کہ پیچھے سے تین نو جوان کلہاڑیوں سے لیس نمُودار ہوئے ۔انہیں ماسٹر صاحب کے داماد کے سر پر رکھی رضائیوں سے بھری گٹھڑی دور سے ہی نظر آ گئی تھی ۔گٹھڑی کے پاس پہنچے تو ہمیں آگے جاتے دیکھا آواز دے کر رکنے کا شارہ کیا اور دوڑ کر ہم تک پہنچے ۔بھائیا جی بولے ۔

’’وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔فاروق تم جاؤ ہم بات کر کے آتے ہیں ۔‘‘

میں جا نہ سکا ان کا ایک ساتھی میرے سامنے آ گیا۔اُنہوں نے ہمیں گھیر لیا۔اِتفاق سے اُن میں سے ایک فوجی پینشنر کا بیٹا تھا جو اَپنے بُوڑھے باپ کے ہمراہ پینشن لینے ہر ماہ ڈاکخانہ میں آتا۔ اور والد صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کافی دیر تک گپ لگاتا اُس کو والد صاحب نے پہچان لیا اسے نام سے پکارا اور کہا۔

’’سنتوش تم جو لینا چاہتے ہو لے لو۔ہمارے پاس کچھ بھی تو نہیں ہم پیسے ہی تو لینے جا رہے ہیں ۔تم شاید بھول گئے تمہارے پتا جی کو اس ماہ پینشن نہ دے سکا تھا۔‘‘

تھوڑا سا نادم ہو کر پیچھے ہٹ گیا لیکن دو اور بھی تھے ۔چونکہ ہم اُن کا پہلا شکار تھے ۔ہمیں نقصان پہچانے کی بجائے ہماری تلاشی لی ۔ بھائی جان کی ایک جیب سے کچھ روپے اور بھابھی کی بالیاں نکلیں ۔وہ اس نے جیب میں ڈال لیں ۔تھیلے کی تلاشی لی بھابھی کے سلمہ ستاروں والا شادی کا جوڑا نکلا، وہ اس نے نکال کر زمین پر رکھ لیا۔ بھائی جان کی کلائی پر ویسٹ اینڈ کی گھڑی بندھی تھی ، وہ اس نے اتار لی۔اس کے بعد اس نے میری تلاشی لی،اوپر والی قمیص میں کچھ نہ تھا، نیچے والی قمیص کی جیب سے چودہ آنے نکلے وہ اُس نے اَپنی جیب میں ڈال لیے ۔والد صاحب کی جیب سے ساڑھے تیرہ روپے نقد اور تیس روپے کے سیونگ سٹرفکیٹ نکلے جو بناوٹ کے لحاظ سے کرنسی نوٹ سے مختلف تھے ۔اُس نے رکھ لیے ۔والد صاحب نے اسے کہا۔

’’یہ سرٹیفیکیٹ تمہارے کسی کام کے نہیں ،اِنہیں صرف میں ہی کیش کروا سکتا ہُوں اور وہ بھی سیالکوٹ سے لہٰذا اِنہیں واپس کر دو تمہاری مہربانی ہوگی وگرنہ مجھے اِن کے گم ہونے کی اِطلاع

دے کر نقل لینی پڑ جائے گی ۔‘‘

اُس نے والد صاحب کی بات مان لی اور سرٹیفیکیٹ واپس کر دیئے ۔ بھائی جان نے دوسرے سے کہا۔

’’دیکھو بیٹیاں اور بہنیں سب کی سانجھی ہوتی ہیں ،لہٰذا اُن کی بالیاں اور کپڑے مجھے واپس کر دو تمہاری مہربانی ہوگی ، پیسے اور گھڑی بیشک تم رکھ لو، مُجھے کوئی اِعتراض نہیں ۔‘‘

وہ اِتنا سادہ بھی نہ تھا ، بھابھی کے قیمتی کپڑے واپس کر دیئے لیکن زیور، پیسے گھڑی رکھ لی اور ہم سب کو جانے دیا۔ بڑے بھائی نے دوبارہ میرے کان میں کہا۔

’’تم بھاگ جاؤ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہو واپس نہ آنا ۔‘‘

میں خطرہ بھانپ گیا اور اَکیلا ہی دوڑ پڑا۔دو کھیت آگے جا کر ایک طرف گنے کی فصل کی اَوٹ میں کھڑے ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا، بھائیا جی اور والد صاحب دوڑتے آ رہے تھے ۔ میں اُن کے انتظار میں رک گیا، بھائی جان نے مجھے دیکھ کر اِشارے سے کہا۔

’’جاؤ۔جاؤ‘‘

میں دوڑنے کی بجائے زَمین پر چت لیٹ گیا۔ تیز دوڑنے سے میرا سانس پھول گیا تھا۔ والد صاحب اور بھائیا جی کی تلاشی لینے کے بعد اُنھوں نے ماسٹر صاحب کی تلاشی لینی شُروع کر دی۔ اِتنے میں دُور سے ایک سپاہی وردی میں آتا دکھائی دیا۔ماسٹر صاحب کے لیے تو وہ فرشتہ رحمت بن گیا۔اُسے آتا دیکھ کر وہ تینوں لٹیرے کھیتوں کی جانب بھاگ گئے ۔ماسٹر صاحب اور عورتیں تلاشی دینے سے مکمل بچ گئے ۔ سپاہی بھائیا جی کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے بتایا۔

’’صبح ہم سب ڈیوٹی پر تھے کہ جموں سے حکم آیا مُسلمان ملازمین سے بندوقیں واپس لو اور اَگلے حکم کا اِنتظار کرو۔میں ڈیوٹی پر تھا۔ بندوق واپس دینے کے بعد مجھے خطرے کا احساس ہوا موقع ملتے ہی بھاگ آیا ہوں ۔اَب وقت نہیں رہا بھاگو اور بارڈر جتنی جلدی ہو سکے پار کرو۔ اَگلے لمحے معلوم نہیں کیا حکم آ جائے ۔‘‘

سب ہی لمبے لمبے ڈگ بھرتے رکاوٹوں کو پھلانگ کر عبور کر رہے تھے ۔ سپاہی نے چلتے چلتے بتایا۔

’’اُس کے ہمسائے کے گھر رات ہی پوتا پیدا ہُوا ہے جبکہ ان کا بیٹا اکھنور گیا ہے اللہ خیر کرے ۔‘‘

بعد میں خبر ملی کہ اسکے ہمسائے کی فیملی بیٹے کے پاس پیدل ہی دریا کے ساتھ ساتھ اکھنور جا رہی تھی ، کہ ہندوؤں نے اس کے دو معصوم بھائیوں اور بوڑھے باپ کو دریا کے کنارے قتل کر دیا۔

ہم تقریباً آدھا سفر طے کر کے چھنی گاؤں کے کھیتوں میں سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی چاول کی فصل کاٹ رہا ہے۔ شکل وصورت سے وہ مسلمان دکھائی دے رہا تھا۔ بھائیاجی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔

’’بھائی تم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہندوٗ اور سکھ مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں راستہ سے ہٹ جاؤ۔‘‘

’’میری کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔‘‘

فصل کاٹتے ہوئے اس نے بھائیاجی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

’’میں اپنی فصل کاٹ رہا ہوں کسی کی نہیں‘‘۔

ہم سب خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ ریاستی باڈر یہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ ہمارا پیدل سفر ختم ہونے کو نہ آ رہا تھا۔ باڈر کی جانب دوڑ دوڑ کر تھک گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود دوڑ رہے تھے۔ بھائیاجی اور پولیس کا سپاہی حوصلہ اور ہمت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ لیکن میں اور والد صاحب دونوں بہت تھک گئے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم دوڑتے گرتے پڑتے باڈر پر پہنچے سامنے تین پاکستانی فوجی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں ہمیں اپنے ہاتھوں میں پکڑی محسوس ہوئیں۔ جموں وکشمیر سرحد کے اِسطرف گورکھا فوجی بھی موجود تھے، اُنہوں نے ہم میں سے کسی کو نہ روکا۔

ہم ریاست کی سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو گئے اور سیدھے پوسٹ ماسٹر کے گھر چلے گئے۔ اس نے ہمیں خوش آمدید کہا اور فوراً دوپہر کا کھانا تیار کروایا۔ ابھی ہم نے کھانا شُروع ہی کیا تھا کہ دور سے عورتوں کے رونے کی آواز آئی۔ پہلے تو ایک دو کی تھیں خیال ہوا کہ شاید گاؤں میں کوئی فوت ہو گیا ہے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دس بارہ عورتوں اور بچوں کا ایک گروہ روتا چیختا چلاتا سرحد کی جانب آتا دکھائی دیا۔ بھائیاجی نے کھانا وہیں چھوڑ دیا اور حالات کا جائزہ لینے کے لیے باڈر کی جانب نکل گئے۔ نڈالہ کا پوسٹ ماسٹر بھی ان کے ہمراہ ہو گیا۔ وہ خبر لائے کہ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کے گاؤں چھنی ، پرانا ہمیر پور اور آس پاس کے ہر ایک گاؤں کے مُسلمان مردوں بچوں اور بوڑھوں کو چُن چُن کرُ وڈی ٹکی چھُوڑیا۔ جو عورتیں اور بچے بچ نکلنے میں کامیاب

ہو سکے وہ سب خُون میں نہائے ہوئے تھے۔ سر کے بالوں سے لیکر پاؤں تک جسم کا ہر حصہ خُون سے لت پت تھا۔ یوں لگا جیسے ریاست میں خون کی بارش ہو رہی ہے۔

بھائیاجی کا اندازہ درست نکلا تھا۔ ممٹی پر چڑھ کر ڈھول کا پیٹنا ہندوؤں اور سکھ جوانوں کے لیے پیغام تھا، کہ کلہاڑیوں اور تلواروں سے لیس ہو کر طے شدہ ناکوں پر پہنچ جاؤ۔ جب وہ اپنی مقررہ جگہوں پر پہنچ کر ہمارا راستہ روکنے کے لئے اکٹھے ہو رہے تھے۔ ہم اُس وقت گاؤں سے باہر نکل چکے تھے۔ چند منٹوں کا ہی فرق تھا ہم اُن سے آگے آگے دوڑ رہے تھے۔ اور دہشتگرد لٹیرے ہم سے پیچھے دس منٹ کی دیر سے کچھ ہی فاصلہ پر آ رہے تھے۔ چند منٹ بعد ہی انہوں نے تمام راستے بند کر دیئے۔ جس گروپ نے ہمارا راستہ روکا وہ ان کا ہراول دستہ تھا۔ اُس وقت تک اُن میں انسانیت کی رمق موجود تھی۔ جب تعداد میں زیادہ ہو گئے تو اگلے لمحہ اہنسا کے پجاری درندوں کا روپ دھار گئے۔ انہوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کر دی۔ ابتدا میں تو صرف مردوں کو قتل کرتے اور عورتوں کو نکلنے کی اجازت دیتے رہے۔ بعد میں یہ فرق بھی مٹا دیا اور عورتوں اور بچوں کو بھی قتل کرنا شروع کر دیا۔ ہمارا گروپ ہی گاؤں میں سے بچ سکا۔

بھائیاجی چونکہ ایک سابق فوجی تھے کھانا کھانے کے بعد، حالات کا جائزہ لینے کے لیے بارڈر پر موجود پاکستانی فوجیوں سے ملنے چلے گئے، اور جلد ہی واپس لوٹے۔ والد صاحب سے مخاطب ہو کر بولے۔

’’یہ جگہ بھی محفوظ نہیں۔ ہمیں دریا کے پار جانا چاہیے۔ اس گاؤں کی حفاظت کے لیے صرف پانچ یا چھ فوجی ہیں اور ہر ایک کے پاس صرف پچاس پچاس گولیاں اور ایک ایک گرنیڈ کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ جبکہ سامنے گورکھا فوجی کافی تعداد میں آ گئے ہیں‘‘۔

پوسٹ ماسٹر نے بتایا کہ دریائے توی کے پار تین میل کے فاصلہ پر بائیں جانب ایک کچا راستہ ہیڈ مرالہ کو جاتا ہے۔ وہاں دریائے چناب پر ایک پل ہے جسے آپ مغرب سے پیشتر آسانی سے پار کر سکتے ہیں۔ اس سے آگے سیالکوٹ کے لئے آپ کو تانگہ آسانی سے مل جائے گا۔ دریائے توی کا پانی شفاف، یخ ٹھنڈا، سست رو اور کم گہرا تھا۔ دریا کی تہہ میں جہاں کہیں چھوٹا بڑا گڑھا ہوتا، وہ نظر آ جاتا ہم نے چکر کاٹ کر دریا کو پار کر لیا۔ ہم ہیڈ مرالہ کا دریائے چناب پر پل شام ہونے

سے پیشتر پار کرنا چاہتے تھے۔ ہم عشاء کے قریب ہیڈ مرالہ کا راستہ بھول کر پھکلیان گاؤں جو ہیڈ مرالہ کے راستہ سے پندرہ میل آگے تھا پہنچ گئے۔ یہ گاؤں ایک ٹیلہ پر واقع تھا۔ گاؤں کے چوک میں ایک مسجد تھی۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ رات اسی مسجد میں گزار لی جائے لیکن بھائیا جی نہ مانے۔ اور نمبردار کے گھر میں رات گزارنے کا کہا۔ اس کے گھر کو تلاش کرنا مشکل نہ تھا وہ مسجد کے پاس ہی تھا۔ رات اُس کے گھر پر رکے۔ صبح نمبردار نے نماز فجر سے پہلے بھائیا جی کو جگا کر ایک روشنی کی جانب اشارہ کیا۔ نڈالہ گاؤں کو ہندوؤں اور سکھوں نے گورکھا فوج کی مدد سے حملہ کر کے آگ لگا دی تھی۔

صبح نمبردار نے ناشتہ میں باجرہ کی روٹی اور لسی دی اور ہم کو دریائے چناب کے پتن کا راستہ دکھا کر واپس چلا گیا۔ ہم دریائے چناب کے کنارے کشتی میں بیٹھ گئے، ملاح کو علم ہو چکا تھا کہ کشتی میں سوار چند لوگ بے سروسامان ریاست جمّوں وکشمیر کے مہاجر ہیں فوراً بولا، میں سب کے پاس کٹورا لیکر آتا ہوں، جس کے پاس پیسے ہیں، ایک آنہ اِس کٹورے میں ڈال دے جس کے پاس نہیں ہیں، خاموشی سے بیٹھا رہے۔ ملاح کٹورا لے کر میرے سامنے آیا۔ میں شرمندہ ہو کر نیچے کشتی کے فرش کی جانب دیکھتا رہا۔ یہی حال والد صاحب اور بھائی جان کا تھا۔

کشتی سے اتر کر کوٹلی لوہاراں کی جانب بڑھے۔ اس وقت تک ہم بتیس میل کا پیدل سفر طے کر چکے تھے۔ والد صاحب اَکثر چلتے چلتے گر جاتے۔ وہ ہمیں حوصلہ دینے کے لیے اُٹھنے کے بعد ایک ہی فقرہ دُہراتے کہ پاؤں تلے پتھر آ گیا تھا۔ میرا حال ان دونوں سے بُرا تھا۔ پاؤں من من کے ہو رہے تھے انکا اُٹھانا انتہائی مشکل تھا۔ جسم کا ہر حصہ اور ہر جوڑ درد کر رہا تھا۔ حیران تھا کہ چل تو پاؤں سے رہا ہوں درد کندھے کر رہے ہیں۔ بھائیا جی البتہ حوصلہ سے خود بھی تھے اور ہمارا حوصلہ بھی بڑھا رہے تھے۔ کوٹلی لوہاراں میں سیالکوٹ چھاؤنی کے لیے تانگے والے آواز لگا رہے تھے۔ ہم ایک خالی ٹانگہ میں بیٹھ گئے وہ تین سواریاں ہی لیکر منزل کی جانب چل دیا۔ مغرب کی اذان کے وقت ہم سیالکوٹ چھاؤنی پہنچ گیے۔ بھائی جان نے اپنے ایک پرانے دوست کے گھر کے سامنے تانگہ رکوا کر اسکے دروازے کی کنڈی ہلائی۔ اتفاق سے وہ گھر پر موجود تھا۔ بھائیا جی نے اس سے ڈیڑھ روپیہ لے کر تانگہ کوچوان کو دیا اور ہم وہیں اُتر گئے۔ چائے سے تواضع کے بعد اس نے بھائیا جی کو بتایا کہ دوسرے محلّہ کے مَندر میں جمّوں مہاجرین کے لیے حکومت پاکستان نے

ایک کیمپ قائم کر رکھا ہے۔ جہاں ریاست جموں وکشمیر سے آمدہ مہاجرین کی فہرست تیار کر کے انہیں رہائش کے لیے مکان الاٹ کرتے ہیں۔ شہر میں بہت سے مکان خالی پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ سامان بھی ہر فیملی کی ضُرورت کے مطابق دیتے ہیں۔ ہر فیملی کو راشن کارڈ بھی بنا دیتے ہیں۔ جس کے ذریعہ ہر فیملی اپنا راشن مقررہ ڈپو سے مفت وصول کر سکتی ہے۔ والد صاحب نے کیمپ میں جانے اور ہندوؤں کا چُھوڑا ہُوا سامان لینے سے صاف انکار کر دیا۔ دلیل یہ دی کہ ہم نہ تو مہاجر ہیں اور نہ زکوۃ کھانے والوں میں سے ہیں۔ ہم تو پاکستان کے رہائشی ہیں۔ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ تمام سامان ہم خود چھوڑ کے آئے ہیں۔ شاید اسی میں ہماری بہتری تھی ہماری جان بچ گئی یہی بڑا انعام ہے۔

والد صاحب نے اپنی آمد کی رپورٹ سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات سیالکوٹ کے دفتر میں جمع کروائی اور پچھلے چار ماہ کی تنخواہ وصول کی۔ سیالکوٹ میں دو دن رکنے کے بعد والد صاحب نے ایک ماہ کی رخصت لی اور ہم چکوال کے لیئے روانہ ہو گئے۔ سیالکوٹ سے وزیر آباد تک تو ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ وزیر آباد مہاجرین کی ٹرین ہر گھنٹہ کے بعد آ رہی تھی۔ جو بھی آتی مہاجرین سے لدی ہوتی مسافر دروازہ تک بھرے ہوتے۔ بھائیا جی نے والد صاحب سے کہا جس طرح بھی ہو اگلی آنے والی گاڑی میں سوار ہونا ہے۔ آپ خود کسی طور اندر پہنچیں میں فاروق کو گاڑی میں چڑھا دوں گا۔ اور خود بھی چڑھ جاؤں گا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ گاڑی حسب سابق مسافروں سے بھری آئی تمام مسافر سو رہے تھے۔ اتفاق سے بھائیا جی کو ایک کھڑکی کھلی نظر آ گئی، ایک صاحب کھڑکی سے ٹیک لگائے سو رہے تھے۔ بھائیا جی نے مجھے بغل سے پکڑ کر اُٹھایا، اور کہا کھڑکی پکڑو میں اسی کھڑکی سے لٹک گیا۔ بھائیا جی نے مجھے پیچھے سے اُٹھا کر ایک زوردار دھکا دیا۔ میں ایک سوئے شخص پر جا گرا وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ چیخ کر بولا۔

''اماں او چپڑ کناتی۔ میرے آ گاڑی آن گرا ہے۔ دکھائی نہ دیوے تیں نے میری پسلاں توڑ ڈالیں۔''

اتنے میں بھائی جان نے ہائی جمپ لگائی اور ڈبہ میں ہاتھوں کے بل مجھ پر گرے۔ مہاجر بھائیا جی کو اندر دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ بلکہ ان کو بھی کھڑا ہونے کی جگہ دی۔ بھائی جان نے ٹرین کے ڈبہ میں چاروں طرف نگا دوڑائی والد صاحب کہیں نظر نہ آئے۔ وہ پلیٹ فارم پر بھی نہ تھے۔ بھائیا جی زور

سے بولے۔

''ابا جی آپ کدھر ہیں۔''

پچھلے ڈبے سے آواز آئی۔

''غفور میں پچھلے ڈبے میں ہوں۔''

ایک شریف مہاجر نے انہیں کھڑکی سے اندر آنے میں مدد دی تھی۔ گاڑی سرائے عالمگیر ریلوے سٹیشن پر روک دی گئی۔ ٹرین کا گارڈ بلند آواز سے پلیٹ فارم پر چلتے چلتے اعلان کر رہا تھا۔

''یہ گاڑی جہلم نہیں رکے گی۔ وہاں ہندو مہاجرین کی ایک ٹرین کھڑی ہے۔ جہلم کے مسافر جن کے پاس سامان بھی ہے وہ یہیں اتر جائیں۔ بغیر سامان کے مسافروں کے لیے گاڑی چند سیکنڈ کے لیے دریائے جہلم کے پل پر روک دی جائیگی۔ گاڑی کا اگلا سٹاپ شاید راولپنڈی ہو۔''

بہت سے مسافر وہیں اتر گئے۔ ہمارے پاس تو کوئی سامان نہ تھا۔ دریائے جہلم کے پل پر گاڑی رکی۔ مجبوراً ہم وہیں اتر گئے اور پل کو پیدل پار کیا۔

جہلم میں ہمیں بس کی چھت پر چکوال تک کی جگہ ملی۔ چکوال سے گاؤں کے لیے تانگہ ظہر کی نماز کے بعد ہی روانہ ہوا۔ تمام راستہ کچا تھا۔ تانگہ انتہائی سست رفتاری سے نماز مغرب کے بعد گاؤں پہنچا۔ تانگہ گاؤں کے قریب سے گذرنے والے برساتی نالہ ''دریگڑ'' کے اس پار ہی رُک گیا۔ نالہ پر کوئی پل نہ تھا۔ سڑک دونوں جانب سے پینتالیس درجہ کا زاویہ بناتی نالہ کے پاٹ تک پہنچتی۔ اس کے علاوہ بارشی پانی نے کچے راستہ میں کئی چھوٹی چھوٹی گہری نالیاں بھی بنا دیں تھیں۔

تانگہ رکنے کے ساتھ ہی میں نیچے اترا، بھائیا جی کہنے لگے۔

''فاروق تم بھاگ کر گھر پہنچو ہم آتے ہیں۔''

میں اکیلا ہی دوڑ گیا۔ ایک کلومیٹر کا ناہموار فاصلہ تھا قدم بڑی احتیاط سے رکھنے پڑ رہے تھے۔ بہت سا وقت نالہ پار کرنے میں ضائع ہو گیا۔ راستہ ایک پرانے قبرستان کے درمیان سے ہو کر گزرتا۔ میرے نانا اکثر کہا کرتے کہ قبرستانوں اور گھنے درختوں کے نیچے سے آیت الکرسی پڑھتے ہوئے گذرنا چاہیے۔ کوئی بدروح آیت الکرسی پڑھنے والے کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ گاؤں تک پہنچنے کا وہی ایک راستہ تھا۔ اس سے پیشتر بھی جب کبھی میرا گزر اس قبرستان سے ہوتا میں آیت الکرسی پڑھتے گزرتا۔ اس وقت پریشانی کے عالم میں آیت الکرسی یاد نہ آ رہی تھی۔ آیت

الکرسی آیت الکرسی کرسی بولتے سڑک پر دوڑ پڑا اور قبرستان پار کر لیا۔ شام کے دھندلے سایہ نے تاریکی میں اضافہ کر دیا تھا۔ چھوٹے چاچا جی کا گھر راستہ میں تھا۔ اپنے گھر جانے کی بجائے ان کے گھر چلا گیا۔

بے جی بھائیا جی کو ہمیر پور سدھڑ بھیجنے کے بعد سے ہر لمحہ ہم تینوں کے انتظار میں رہتیں۔ انہوں نے بھائیا جی کو ہمیر پور سدھڑ غلط فہمی میں بھیجا۔ ان کا خیال تھا کہ بھائیا جی ہمیں لیکر تیسرے یا چوتھے روز واپس آ جائیں گے۔ لیکن اُنکے ہمیر پور سدھڑ پہنچتے ہی ڈاک کی ترسیل کا سلسلہ بند ہو گیا۔ پہلے بس رکی پھر ٹرین جموں ریلوے سٹیشن پر روک لی گئی۔ جموں کا پاکستان سے ہر قسم کی مواصلات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ خیریت کا خط آئے زیادہ دن گزر گئے تو اب بے جی پریشان رہنے لگی۔ اکثر صبح صبح دروازہ کے پاس جا کر انتظار میں بیٹھ جاتیں۔ اس سوچ میں گم رہتیں کہ شاید بھائیا جی عبدالغفور کو ہمیر پور سدھڑ بھیج کر انہوں نے اور بڑی غلطی کی ہے۔ پہلے انہیں ہم دو کی انتظار تھی اب تین کی انتظار کرنا پڑ رہی تھی۔ بھائیا جی عبدلغفور کی بیوی جو میری خالہ زاد بہن بھی تھی، وہ بے جی کے ساتھ پریشانی میں برابر کی شریک تھی۔ لیکن بے جی کا غم اس کے غم سے کئی گنا زیادہ تھا۔ گھر کے سربراہ اور دو جوان بیٹوں کی زندگیاں خطرے میں تھیں۔ ان کے غم کی گہرائی کا اندازہ کسی کو نہ ہو سکتا تھا۔ بھابھی کمرہ میں جا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی۔ جب کمرہ سے باہر نکلتی تو چہرہ بتلا رہا ہوتا کہ وہ اپنے کمرہ سے رو کے آ رہی ہے۔ بے جی کمرہ میں جا کر غم کا بوجھ ہلکا نہ کر سکتی تھیں۔ اگر ایک آنسو بھی ان کی آنکھ سے ٹپک جاتا، تو گھر میں ایک کہرام مچ جاتا، جسے وہ برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ بے جی کا شمار نہ زندوں میں نہ مُردوں میں تھا۔ وہ تو اپنے کندھوں پر اپنا جنازہ لیے پھرتیں۔ جس کے بوجھ تلے دبی ہر وقت بھرائی آواز میں بات کرتیں۔ اُن کی حالت تو ایک سلگتی لکڑی کی تھی، جو نہ بجھتی نہ راکھ ہوتی ہے۔

رمضان تک تو جموں میں حالات بڑے پرسکون تھے۔ مواصلات کا سلسلہ قائم تھا۔ کچھ عرصہ بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اب عید قربان کی آمد آمد تھی۔ بے جی کے لیئے اک بڑے گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو رہا تھا۔ زرعی زمینوں کے علاوہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہ رہا تھا۔ ڈاک بند ہو جانے کے بعد منی آرڈر بھی نہ پہنچ سکتے۔ بے جی جمع پونجی سے گھر کا خرچ چلا رہی تھیں وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب باری زیورات کے فروخت کی تھی۔ چند دن پیشتر ہی بے جی اپنے چھوٹے بھائی محمد شریف

کے ہمراہ شہر جا کر چاندی کا آدھ سیر وزنی ٹکڑا گھر کے اخراجات پورا کرنے کے لیے فروخت کر کے آئی تھیں۔

ذہنی سکون حاصل کرنے کے لئے اکثر اپنے والد چھوٹے چا چا جی کے پاس آجاتی۔ان کو بیٹی کے غم کی گہرائی کا اندازہ تھا۔لیکن وہ بھی دلاسہ دینے اور حوصلہ بڑھانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔بے جی وہاں گھنٹوں بیٹھ کر روتی رہتیں ان کے لیئے مصنوعی دلاسے بھی تکلیف کا باعث تھے۔وہ اکیلی چارپائی پر گھنٹوں خاموش بیٹھی اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتیں۔عید قربان سے ایک روز پیشتر وہ چھوٹے چا چا جی سے مشورہ لینے اور دل کا بوجھ ہلکا کرنے آئی۔وہ اس اُلجھن میں تھیں کہ عید سادگی سے گذاری جائے یا قربانی دی جائے۔بے جی جس حالت میں گھر سے چا چا جی کے پاس آئی تھیں وہ انتہائی قابل رحم تھی۔چھوٹے چا چا جی ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ شخصیت تھے۔انہوں نے بیٹی کو حوصلہ سے مشکل وقت کا مقابلہ کرنے کا کہا اور تسلی دی کہ جموں میں تو امن ہے، فسادات کی کوئی خبر وہاں سے نہیں آئی۔ لہٰذا اپنے طور غلط تاویلیں گھڑ لینا کوئی عقلمندی نہیں۔بچے تو معصوم ہوتے ہیں، انہیں عید ضرور منانی چاہیے۔بے جی کی چھوٹی بہنوں نے بھی انہیں تسلی دی اور حوصلہ بڑھایا کہ مشکل کی گھڑی ہمیشہ نہیں رہتی۔اب چند دنوں کی بات ہے تینوں باپ بیٹا انشاءاللہ جلد پہنچ جائیں گے۔سر جھٹکتے ہوئے چھوٹی بہن نصیر بیگم کے کندھے پر سر رکھ کر مشکل سے بولیں اللہ خیر کرے معلوم نہیں وہ کس حال میں ہیں، اور میں یہاں عید مناوں یہ ناممکن ہے۔یہ کہہ کر آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگ پڑے۔جس ماں کے دو بیٹے اور گھر کا سربراہ موت کے منہ میں ہوں۔ وہ کیسے عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکتی تھی۔
نور احمد صاحب نے سب کو بدمعاشوں کے حملہ کے خطرہ کے پیش نظر ہمیر پور سدھڑ سے روانہ کر دیا تھا۔بے جی کو اب یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ انہوں نے اپنے دو بیٹوں کو خود موت کے منہ میں دھکیل دیا۔مجھے بس سے اتار کر پڑھنے والا چشمہ لینے بھیج دیا۔اور غفور کو چکوال سے ہمیر پور سدھڑ بھیج دیا۔کبھی کوئی بھٹکا ہوا خط اُن تک پہنچتا تو یہی سوچتیں کہ فلاں تاریخ تک تو وہ لوگ زندہ تھے بعد میں معلوم نہیں کیا ہوا۔چند روز پیشتر بے جی نے خواب میں دیکھا کہ بہت سے لوگ تلواریں لیے ہمارے تعاقب میں بھاگ رہے ہیں۔اور ہم تینوں میں سے کوئی بھی ان کے قابو نہ آیا۔چا چا جی کو جب خواب سنایا تو انہوں نے اس خواب کی تعبیر یہ دی اللہ تعالی نے تمہیں بتا دیا ہے، کوئی ان کو

نقصان نہیں پہنچئے گا۔اب چند دنوں کی بات ہے۔وہ سب جلد انشاءاللہ آجائیں گے۔

تھوڑا غم کا بوجھ ہلکا ہو جانے پر بے جی نے گھر جانے کے لیے اپنا شٹل کاک برقعہ درست کرنا شروع کر دیا۔میں چا چا جی کے گھر کے مرکزی دروازہ سے آنے کی بجائے ہمسایوں کے گھر میں کھلتی کھڑکی سے جانکے لیے ہمسائیوں کے گھر چلا گیا۔اس طرح لمبے چکر کا فاصلہ سو گز کے قریب کم ہو گیا۔میں نے کھڑکی کے راستہ داخل ہونے سے پیشتر ہی چا چا جی کے گھر کی پچھالی سے ان کو آواز دی۔
''چا چا جی میں آ گیا''۔
کھڑکی ابھی دور تھی۔بے جی کا وہاں ہونے کی میں توقع ہی نہ کر رہا تھا۔میری آواز سنتے ہی بے جی نے پلٹ کر کھڑکی کی جانب دیکھا شام کے دھندلے اندھیرے میں کچھ نظر نہ آیا۔میری صرف آواز ہی سنی تھی۔جسے بے جی نے پہچان لیا تھا۔انھوں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی کہ میری آواز کہاں سے آئی۔وہ سوچ میں ڈوب گئیں۔کہ فاروق تو ہے نہیں اُس کی آواز کہاں سے آئی ہے۔انہیں وہم ہوا کہ یقیناً یہ آواز آسمان سے آئی ہے۔شاید وہ آج اس وقت اِس دنیا میں نہیں رہا یہ اس کی روح کی آواز ہے، جو مجھے ملنے آئی ہے۔اُن کے لیے یہ گھڑی قیامت صغریٰ سے کم نہ تھی۔چھٹی حس نے اُنہیں جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا وہ شدت غم سے چیخ پڑیں۔
''فاروق۔۔تم۔۔''
وہ جملہ مکمل نہ کر سکیں ایک چیخ فضا میں گونجی اُنھوں نے ایک دَم آنکھیں بند کر لیں اور پیچھے چارپائی پر گر گئیں۔وہ اس سے پیشتر بھی کئی بار یقین کی حد تک سوچ چکی تھیں کہ ہم تینوں اس دنیا میں نہیں ہیں۔اتنے میں کھڑکی کے راستہ میں گھر میں داخل ہو گیا۔دیگر گھر والوں نے بھی میری آواز سنی تھی لیکن سب کی توجہ بے جی کے جانب ہو گئی تھی۔سب گھبرا کر اُٹھے اور بے جی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔گھر کا ہر فرد آپاں، آپاں کا شور کر رہا تھا۔بے جی کا جسم ایک لاش کی مانند ٹھنڈا ہو گیا تھا۔خالہ نصیر نے پانی کے چھینٹے اُن کے چہرہ پر مارے اور بولیں۔
''آپاں دیکھو، فاروق خیریت سے پہنچ گیا ہے۔دیکھو فاروق تمہارے سامنے کھڑا ہے۔'' جونہی انہیں ہوش آیا اُنھوں نے اپنے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھائے میں ان سے لپٹ گیا۔نقاہت کے باوجود مجھے زور سے دبوچ لیا۔

اَب وہ صرف ۔

''فاروق۔ہائے میرا فاروق''۔

زور زور مگر دبی آواز میں پکارے جا رہی تھیں۔ میرا نام پکارتی رہیں اور روتی رہیں۔ میں بھی رو رہا تھا۔روتے ہوئے اپنے بچ نکلنے کی ساری کہانی سنا دی۔ وہ بس نام لیتی رہیں ۔ میری کہانی کی جانب کوئی توجہ نہ دی ۔ میں انہیں اپنی داستان ہر لمحہ سناتا رہا کہ کیسے کیسے نکلے کیسے لوٹا گیا اور دوڑ دوڑ کر نڈالہ کیسے پہنچے۔ اُنھوں نے میری کہانی میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ بے جی جب ذرا سنبھل گئیں تو ڈرتے ڈرتے سہمی اور دھیمی آواز جو دور ایک کُھلی قبر سے آ رہی تھی، مجھ سے دریافت کیا۔

''اکیلے ہو باقی کہاں ہیں؟''

اس کا جواب سننے سے خوف زدہ کانپ رہی تھیں۔اَب تک وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ شاید میں اکیلا ہی پہنچ پایا ہوں۔ میں نے بتایا کہ پیچھے آ رہے ہیں۔ میں تو بھاگ کر آ گیا ہوں۔ ہم دونوں ماں بیٹا نانا کے گھر والد صاحب اور بھائیا جی کی انتظار میں رُک گئے ۔ ہم تینوں کا یوں خیریت سے گھر پہنچ جانا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ ہماری خیریت سے واپسی کی خبر پُورے گاؤں کے لیے ایک بہت بڑی خبر تھی۔ کوئی بھی ہماری واپسی کی توقع نہ کر رہا تھا۔ جو سنتا مبارک دینے ہمارے گھر آتا۔ بھائی جان ہر ایک کو رات گئے تک داستان سناتے رہے۔

لگڑ بگڑ کا شکار

چکوال پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ میں دسویں جماعت پاس کر چکا ہوں۔ مواصلاتی نظام معطل ہو جانے کی بناء پر مجھے اس کی اطلاع نہ ہو سکی تھی۔ میں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں والد صاحب سے کالج میں داخلہ کی خواہش کا اظہار کیا۔لیکن انہوں نے کالج میں داخل کروانے سے انکار کر دیا۔ فرمانے لگے، ابھی تمہاری عمر بہت کم ہے اور قد و قامت میں بھی چھوٹا ہوں۔ لہٰذا اگلے سال تک انتظار کرو پھر داخل کروا دوں گا۔ میرے چُھوٹے قد کا یہ عالم تھا۔ کہ میٹرک کے امتحان کے پہلے روز سپرنٹنڈنٹ صاحب لڑکوں کے رول نمبر پکار کر انہیں ہال میں جانے کی اجازت دیتے۔ مجھے سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ہال میں اندر جانے سے روک دیا۔ اور بولے۔

''کاکا توں کدر چلیا ایں؟'' (بچے کدھر جا رہے ہو۔)

وہ سمجھے کہ میں پرائمری کا کوئی طالب علم ہوں اور کسی کام سے اندر ہال میں جا رہا ہوں۔ اس وقت میری عمر بارہ سال تھی اور قد ساڑھے چار فٹ سے کچھ ہی اوپر تھا۔ بڑے بھائی جان غلام صدیق جو مجھ سے عمر میں دو سال بڑے تھے، نے ایک سال بعد میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

گاؤں کا ماحول غیر تعلیمی تھا۔ کوئی رسالہ یا اخبار پڑھنے کو نہ ملتا۔ سیر تفریح کے لیے کوئی سیر گاہ نہ تھی ۔ البتہ ہمارے گاؤں کے چند نوجوان روزانہ عصر کی نماز کے بعد ایک غیر آباد حویلی میں والی بال کھیلتے ۔ مجھے وہ ریفری کھڑا کر کے پوائینٹ گننے پر مامور کر دیتے ۔ میں روزانہ ہی میچ دیکھنے اور پوائینٹ گننے اس حویلی میں چلا جاتا میرے لیئے یہی بڑا اعزاز تھا کہ میری آواز پر گیم رک جاتی یا شروع ہوتی۔

ہمارے گاؤں کے ایک ماشکی نے ایک لڑاکا کتا پال رکھا تھا۔ ایک روز گاؤں میں افواہ پھیلی کہ ایک لگڑ بگڑ کے پاؤں کے تازہ نشان ''بھتی نالہ'' کی ریت پر دیکھے گئے ہیں، چلو اسے پکڑتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ ماشکی ہمارا گائیڈ تھا۔ وہ ہمیں ایک برساتی نالہ 'بھتی' میں لے گیا۔ نالہ کے پاٹ میں کتے کے طرز کے پنجے دگنی سائیز میں لگے تھے۔ ہم سب نشان دیکھتے ہی خوشی سے چلائے جیسے ہم نے لگڑ بگڑ کو پکڑ لیا ہے۔ نشان دیکھتے دیکھتے ہم سب ایک غار کے پاس پہنچ گئے ۔ ہمارا لیڈر ماشکی بولا سب لوگ زور زور سے اور اونچی آواز میں پکارو۔

''وہ لک طرٹا ہے، اور ایک ایک پتھر غار کے اندر پھینکو۔''

سب نے ماشکی کی پیروی میں آواز لگائی ۔

''وہ لک طرٹا ہے''۔

اور پتھر غار میں پھینکے ۔ لیڈر نے بتایا کہ اگر لگڑ بگڑ باہر نکل کر کسی پر حملہ آور ہو تو اس کے آگے بھاگنا نہیں ۔ جب وہ نزدیک آئے تو دائیں یا بائیں مڑ کر بھاگیں۔ لگڑ گڑ جلدی مڑ نہیں سکتا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں لچک نہیں ہوتی۔ وہ سیدھا آگے بڑھ جائے گا۔ اور کتے کے ڈر سے واپس نہ آئے گا۔ ہم دیر تک غار کی جانب پتھر پھینکتے رہے۔ لیکن غار سے کوئی جانور باہر نہ آیا۔ لگڑ بگڑ وہاں سے جا چکا تھا۔ ''بھتی'' نالہ تو سترہ میل لمبا تھا۔ صبح کے گھر سے نکلے تھے۔ بھوک نے بہت ستایا ماشکی تو کھانا کھا کے آیا تھا۔ مجھے تارامیرا کے پتے ہی کھانے کو ملے۔ سرسوں کے پتے بھی کھائے لیکن وہ بدذائقہ اور ان میں سرسوں کے تیل کا ذائقہ تھا۔ جنگلی بیروں کے توڑنے میں محنت زیادہ

کرنی پڑتی۔ کھانے کو صرف چھلکا ہی ملتا۔ مغرب سے کچھ پہلے گھر پہنچے۔ بے جی نے جوتے سے میری پٹائی کی کہ ان کو بتائے بغیر ماچھی کے ساتھ چلا گیا تھا۔ ایک سال پورا اسی طرح آوارہ گردی میں گزارا۔

مرے کالج سیالکوٹ

بڑے بھائی کے دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد ہم دونوں کو مرے کالج سیالکوٹ فسٹ ائیر میں داخل کرا دیا گیا۔ کالج انتظامیہ نے ریاست جموں وکشمیر کے طالبعلم کی حیثیت سے پوری فیس معاف کر دی۔ صرف یونین فنڈ ہی دینا پڑتا۔ میں ریاستی رواج کو قائم رکھتے ہوئے سردیوں میں دو قمیص پہن کر کالج چلا جاتا، کوٹ پہننے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ نماز پڑھنے کی عادت نہ تھی۔ لیکن سر پر ٹوپی ضرور رکھتا۔ ایک روز کالج میں داخل ہوتے ایک لڑکا میرے سامنے آیا۔ اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

''چاچا یہ لیلا کیپ کہاں سے لی ہے''۔

میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا، اور ٹوپی اتار کر کتابوں میں رکھ لی۔ اس دن کے بعد کالج کبھی ٹوپی پہن کر نہ گیا۔ ایک روز کالج کے باہر آلو چھولے بیچنے والے سے چھولے لیکر کھا رہا تھا۔ کہ ساتھ کھڑا ایک لڑکا بولا، بابو جی، آپ کے پاس دو قمیصیں ہیں، تیسری نہیں؟ اس کے بعد میں نے ایک قمیص ہی پہننی شروع کر دی۔ اور سردی سے بچنے کے لیے لنڈا بازار سے ایک کوٹ خرید کر پہن لیا۔

کالج میں داخلہ کے وقت تو ہم دونوں بھائیوں نے آرٹس کے ایک جیسے مضامین کا انتخاب کیا۔ لیکن بھائی غلام صدیق کو اکنامکس ایک خشک مضمون محسوس ہوا۔ انہوں نے اکنامکس کی بجائے حساب چن لیا۔ میں نے جغرافیہ کی بجائے تاریخ انگلستان کا انتخاب کر لیا۔ اب ہم دونوں بھائیوں کے مضامین میں بہت فرق آ گیا۔ گھر سے تو دونوں بھائی اکھٹے کالج آتے لیکن واپسی پر اکھٹے آنا ممکن نہ رہا۔ اب ہم دونوں اپنے اپنے پیریڈ کے مطابق واپس آتے۔

یونیورسٹی کی سالانہ کھیلوں کے سلسلہ میں زمیندار کالج گجرات کی فٹ بال ٹیم میچ کھیلنے مرے کالج سیالکوٹ آئی۔ وہ میچ ایک گول سے جیت گئی، لیکن گول متنازع تھا۔ کھلاڑیوں نے ریفری سے غلط گول دینے پر بحث کی مگر ریفری نہ مانا۔ کھلاڑیوں کے ساتھ ان کے ہمدرد بھی تھے۔

انہوں نے ریفری سے بدتمیزی کی۔ اس دوران مخالف ٹیم کے ممبران ریفری کی حمائیت میں بولنے لگے۔ جس سے بات بڑھ گئی اور مار کٹائی شروع ہو گئی۔ اور میچ دوبارہ شروع نہ ہو سکا۔ ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ اور پرنسپل صاحب نے بڑی مشکل سے حالات پر قابو پایا۔

ہاکی میچ

بڑا بھائی غلام صدیق ایک اچھا سپورٹس مین تھا۔ وہ تقریباً ہر گیم میں شامل ہوتا۔ ہاکی اس کا پسندیدہ کھیل تھا اسے کالج کی ہاکی ٹیم کا ممبر چن لیا گیا۔ چند دنوں کے بعد ہاکی ٹیم کو یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں شرکت کے لیئے گجرات جانا پڑا۔ بہت سے طالبعلم بغیر ٹکٹ خریدے ریل گاڑی میں سوار ہو گئے، میں بھی ان میں سے ایک تھا۔ وزیرآباد اور گجرات کے درمیان ایک ہی چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ جس کے سگنل ہر وقت نیچے رہتے تھوڑی دیر کے لیئے گاڑی وہاں رکی۔ چند بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے لڑکے انجن ڈرائیور کے پاس گئے اور کہا کہ گجرات میں داخل ہونے سے پیشتر وہ گاڑی کو بیرونی سگنل پر چند سیکنڈ کے لیئے روک دے۔ اس طرح وہ اتر کر ایک ٹرک میں سوار ہو جاہیں گے، جوان کی انتظار میں وہاں کھڑا ہوگا۔ لیکن انجن ڈرائیور نہ مانا۔ لڑکوں نے بڑی منت سماجت کی کہ ایک منٹ کی بات ہے، آپ گاڑی کو آہستہ کر دیں، ہم سب آہستہ چلتی گاڑی سے اتر جائیں گے۔ لیکن ڈرائیور نے گاڑی کو روکنے یا آہستہ کرنے سے معذرت کر لی۔ تمام لڑکے خاموشی سے واپس آ گئے۔ گاڑی جونہی ریلوے سٹیشن سے باہر نکلی تو گاڑی رک گئی، کسی نے گاڑی کی واکم زنجیر (vacuum brake) کھینچ دی تھی۔ انجن ڈرائیور ایک ساتھی کے ہمراہ واکم کو درست کرنے آیا۔ گارڈ شور کر رہا تھا۔

''زنجیر کس نے کھینچی اور کیوں گاڑی کو روکا گیا۔ بلاضرورت زنجیر کھینچنا جرم ہے؟''

مسافروں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ڈرائیور نے واکم کو درست کیا اور گارڈ سے چلنے کی اجازت چاہی۔ گارڈ نے سبز جھنڈی لہرائی اور گاڑی چل دی۔ لیکن گاڑی ابھی ایک میل ہی آگے گئی ہوگی کہ گاڑی دوبارہ رک گئی۔ انجن ڈرائیور اور اس کا ساتھی دوبارہ آئے اور گارڈ بھی دوبارہ دریافت کرنے آ گیا۔ اب کی باز نجیر دوسرے ڈبہ سے کھینچی گئی تھی۔ کوئی شخص زنجیر کھینچنے کی ذمہ داری نہ لے رہا تھا۔ جب چوتھی بار زنجیر کو کھینچا گیا، تو ڈرائیور نے گارڈ کو اصل صورتحال سے آگاہ کیا۔ گارڈ اس کی

بات سن کر ہنس پڑا۔ وہ انجن ڈرائیور پر خفا ہوا کہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ گارڈ کبھی مرے کالج کا سٹوڈنٹ رہا تھا۔ اس کا تمام غصہ جاتا رہا، اس نے مسکراتے چہرہ سے لڑکوں کو آواز دی۔

''مرے کالج کا کوئی لڑکا ہوتو بات کرے۔''

بیس پچیس لڑکے ٹرین سے اتر کر گارڈ کے گرد اکھٹے ہو گئے۔

''میں بھی مرے کالج میں پڑھتا رہا ہوں۔''

گارڈ نے انھیں بتایا۔

لڑکوں نے مرے کالج زندہ باد، گارڈ صاحب زندہ باد کے نعرے لگائے۔

''تم نے مجھ سے رابطہ کیوں نہ کیا۔''

''ہم نے ڈرائیور سے بات کی اور اس کی منت بھی کی کہ ہماری ٹیم زمیندارہ کالج میچ کھیلنے جارہی ہے۔ ہمیں کالج کی گراونڈ کے نزدیک بیرونی پھاٹک پر اتار دے۔ وہاں ایک ٹرک ہمارے انتظار میں کھڑا ہے۔ ہم اس میں سوار ہو کر کالج گراونڈ پہنچ جائیں گے۔ لیکن وہ نہ مانا۔''

''مجھے بتاؤ تمہیں کہاں اترنا ہے۔''

''جی گجرات کے پہلے پھاٹک پر۔''

''آپ کا ایک ساتھی میرے ساتھ آجائے، جہاں کہے گا گاڑی کھڑی کروا دونگا اب آپ لوگ جائیں اور مسافروں کو تنگ نہ کریں۔''

گاڑی کو پھاٹک کے قریب چند سیکنڈز کے لیے روک دیا گیا۔ تمام بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے لڑکے چھلانگیں لگا کر اتر گئے۔ اس وقت تک گاڑی آدھ گھنٹہ لیٹ ہو چکی تھی۔

یونیورسٹی میچ چار بجے شروع ہوا۔ میچ ہاف ٹائم تک برابر تھا کوئی بھی ٹیم گول نہ کر سکی تھی۔ دونوں کالجوں کے پروفیسر صاحبان ہاف لائین کے نزدیک کرسیاں بچھائے خاموش بیٹھے میچ دیکھ رہے تھے۔ میچ کے دوسرے ہاف کے تیسرے منٹ میں مرے کالج کی ٹیم نے گجرات کالج کی ٹیم پر گول کر دیا۔ مرے کالج کے تمام لڑکے بھنگڑا ڈالتے میدان میں آگئے۔ چند لڑکوں نے پروفیسر صاحب کے منع کرنے کے باوجود لڈی ڈانس شروع کر دیا۔ کھیل روک دیا گیا۔ دونوں ٹیمیں اپنے اپنے گول پوسٹ پر جا کر کھڑی ہو گئیں اور دونوں ایمپائر میدان سے باہر آگئے۔ انہوں نے پروفیسر صاحبان سے میدان خالی کرانے کی درخواست کی۔ اتنے میں ایک لڑکے نے سُرخ دوپٹہ

اوڑھ لیا۔ دوسرے لڑکے نے آواز لگائی۔

''لال دوپٹہ''

سب بولے۔

''سوہنی دا''

بس پھر کیا تھا گجرات کے لڑکے بھی جوش میں آگئے انہوں نے نعرہ بازی شروع کر دی۔ گجرات کا ایک لڑکا کہیں سے سرخ دوپٹہ لے آیا مرے کالج کے لڑکے چلائے۔

''لال دوپٹہ سوہنی دا''

اس کے جواب میں گجرات کے لڑکوں نے بھی نعرہ بازی شروع کر دی۔

''لال دوپٹہ پرمیلا دا''

وہ مرے کالج کے پروفیسر صاحب کی بیٹی کا نام لے رہے تھے۔ ٹینشن بڑھنا شروع ہو گئی اور میدان میں پتھر اور اینٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے آنا شروع ہو گئے۔ ان پتھروں نے بہت سے لڑکوں کو زخمی کیا۔ ایک پتھر گجرات کالج کے ایک پروفیسر صاحب کی پیشانی پر لگا۔ جس سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر صاحب کے زخمی ہونے کیساتھ ہی جھگڑا ختم ہو گیا۔ پروفیسر صاحب اٹھ کر گھر چلے گئے۔ پرنسپل صاحب نے کالج ڈسپینسر کو گھر سے بلوا کر زخمی لڑکوں کو مرہم پٹی کروائی۔ بھائی جان غلام صدیق کو تو کچھ نہ ہوا وہ تو ٹیم کے ساتھ دور گول پوسٹ پر کھڑے تھے۔

ایک پتھر میرے سر پر لگا،۔ میں سر پر پٹی باندھے گھر لوٹا بے جی بہت خفا ہوئیں۔

ہم ابھی فرسٹ ائیر میں ہی پڑھ رہے تھے، کہ والد صاحب ریٹائر ہو کر گاؤں چلے گئے۔

بھائی جان غلام صدیق تو پہلے ہی کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ گیم میں لیجانا شروع کر دیا۔ دونوں روزانہ شام مختلف کھیلوں میں حصہ لیتے، پڑھائی کی عادت ختم ہوگئی۔ ہم دونوں بھائی سالانہ امتحان میں فیل ہو گئے۔ بڑے بھائی نے پڑھائی کو خیر باد کہہ دیا۔

اور بھائیا جی عبدالغفور نے بھائی جان غلام صدیق کو محکمہ امداد باہمی میں سب انسپکٹر اور مجھے لارنسپور وولن میں بطور کلرک بھرتی کروادیا۔

بڑے بھائی عبدالغفور کیمل پور میں رہتے تھے اور میں لارنسپور کی وولن مِل میں ملازم تھا۔ میں ہر ہفتہ کی شب ان کے گھر آجاتا اور سوموار صبح ڈیوٹی پر لارنس پور چلا جاتا۔ لارنس پور

جی روڈ پر تھا اور کیمل پور جی ٹی روڈ سے بیس میل دور اندر کی جانب ، بذریعہ ریل کیمل پور سے لارنس پور کا فاصلہ سات میل تھا جبکہ سڑک کے راستہ سے تیس میل چنانچہ میں ہر ہفتہ کی شب ریل یا سائیکل سے کیمل پور چلا جاتا ۔

ایک سوموار ڈیوٹی پر جانے کیلئے ریلوے لائن کے ساتھ بنی پگڈنڈی پر جارہا تھا۔ پگڈنڈی بعض جگہوں پر ریلوے لائن کے ساتھ اور بعض جگہوں پر نیچے تھی۔ ایک اونچی جگہ کے پیچھے سے کوئلہ سے چلنے والے انجن کا دھواں نظر آیا۔ اور پھر گاڑی کی آواز آنا شروع ہوگئی جو نزدیک آتی گئی۔ دو تین بار بھک بھک کی آواز کے ساتھ بہت سا کالا دُھواں فضاء میں بکھر گیا جو مجھے دور سے ہی نظر آ گیا۔ جلد ہی کچھ فاصلے پر کالا انجن ایک ملی پیڈ کی طرح کئی سو پاؤں چلاتا بلندی سے نشیب کی جانب آتا نظر آیا۔ یہ ایک مال گاڑی تھی۔ یہاں پگڈنڈی ریلوے لائین سے پانچ فٹ نیچے تھی۔ میں نے مزید آگے بڑھنے کی بجائے ، ریلوے انتظامیہ کے ایک بورڈ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اپنا بائیاں پاؤں زمین پر ریلوے لائن کی جانب اُونچی جگہ پر ٹیک کر رُک گیا۔ انجن ڈرائیور نے انجن کے دروازہ سے باہر نکل کر مجھے پگڈنڈی چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ لیکن آگے ڈھلوان بہت زیادہ تھی۔ پچیس فٹ نیچے جانے کی بجائے میں نے سائیکل پر ہی بیٹھے رہنے کو ترجیح دی اور بورڈ پر نصب لوہے کی پٹی کو مزید مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گاڑی ڈھلوان پر تھی اور مجھے اب انجن اور ڈبوں کے پہیے اور اُن کے پار روشنی اندھیرے اجالے میں تبدیل ہوتی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں بغیر کسی ڈر خوف کے سائیکل پر بیٹھا رہا انجن مجھ سے پانچ فٹ کے فاصلے سے گزرا۔ ہوا کا ایک زوردار اور طاقتور جھونکا آیا۔ میں اور سائیکل دونوں ہی زمین سے اُٹھے۔ دیوہیکل انجن کے پیدا کردہ شدید دباؤ کی تیز ہوا نے مجھے اور سائیکل دونوں کو اپنی جانب کھینچا۔ ہاتھ کی مظبوط گرفت نے مجھے اور سائیکل کو جانے نہ دیا۔ میں سائیکل سمیت اپنی جگہ سے ہلتا رہا اور گاڑی گزر گئی۔

لارنسپور میں صرف دوسال ہی نوکری کرسکا۔ مل کا مینجنگ ڈائیریکٹر ایک ریٹائیرڈ گورنمنٹ افسر تھا۔ اسے گورنمنٹ کے سکیل بڑے یاد تھے۔ وہ ہر ملازم کو سرکاری ملازم کی تنخواہ ہی دیتا۔ ان دنوں فیکٹری بھی زیرِ تعمیر تھی۔ لہٰذا وہ اخراجات بھی کم رکھتا۔ لارنسپور کے پاس ہی پاکستان تمبا کو کمپنی کے دفتر میں مجھے لارنسپور کی نسبت دگنی تنخواہ پر نوکری مل گئی۔ وہاں دیگر مراعات کے علاوہ کیپسٹن سگریٹ ماہوار ملتی۔ میں سگریٹ نہ پیتا تھا وہ سگریٹ بھائی جان عبدالغفور کو دے دیں۔ انہیں

سگریٹ پینے کی عادت تھی۔ بھائی جان کو جب سگریٹ کے مفت ملنے کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے وہاں سے استعفٰی دینے کا کہا۔ اور مجھے کواپریٹو بنک فتح جنگ میں بھرتی کروادیا۔ بنک میں مجھے معقول تنخواہ پر نوکری ملی۔ اس دوران میں نے ایف اے کا امتحان ۱۹۵۴ میں پاس کیا۔ میں نے والد صاحب سے کالج میں تھرڈ ایئر میں داخل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔ والد صاحب مان گئے ، اور مجھے تھرڈ ایئر میں داخل کروادیا۔ ملازمت میں جتنے پیسے بچا سکا تھا وہ سب فیسوں اور کتابوں پر لگادیئے۔

ایک قیدی

میں گھر سے روزانہ صبح سویرے انگریزی کے پہلے پریڈ کے لیے کالج پہنچ جاتا۔ کالج کی راہداری کے نصف میں مغلیہ دور کی ایک عمارت نانک چندی پتلی اینٹوں سے بنی تھی۔ جہاں مغلیہ عہد میں خزانچی لوگوں سے مالیہ وصول کرتا۔ اس عمارت میں اب خزانچی کی بجائے ایک جج صاحب کی عدالت تھی۔ چکوال کی تحصیل جیل کالج کے جنوب مشرقی نکر پر بنی تھی۔ ایک روز میں کالج کی راہداری سے گزر رہا تھا کہ کانسٹیبل قیدی کو ہتھکڑی لگائے ، میرے قریب سے گزرا۔ اکثر ہتھکڑی لگائے معمولی جرائم میں ملوث قیدیوں کو لئے پولیس والے اس راہداری پر مل جاتے۔ میں ابھی چند قدم ہی گیا تھا کہ پیچھے سے کانسٹیبل نے آواز دی۔

’’بابو جی بات سننا‘‘

میں نے آواز سن لی لیکن پرواہ نہ کی ، سوچا کہ یہ کانسٹیبل مجھ سے نہیں کسی اور بابو جی سے مخاطب ہے۔ یہ سوچ کر کلاس روم کی جانب بڑھتا گیا۔ میں تیز قدموں سے کلاس کی جانب جارہا تھا، کہ کانسٹیبل نے دوبارہ زور سے آواز دی۔

’’باو جی او باو جی میری بات سُنتے جانا‘‘

میں نے حیرانگی سے مڑ کر دیکھا۔ کہ شاید یہ مجھ سے ہی مخاطب ہو اور کچھ کہنا چاہتا ہو۔

’’کیا آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟‘‘

’’جی آپ سے ہی بات کرنی ہے۔‘‘

کانسٹیبل نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا بات ہے؟ مجھے کلاس میں جانا ہے۔ پہلے ہی لیٹ ہو رہا ہوں''

میں اُس کے انتظار میں وہیں رُک گیا۔

کانسٹیبل قیدی کو لیے میری جانب واپس آیا، نزدیک آنے پر بولا۔

''یہ لڑکا کہتا ہے کہ آپ کو جانتا ہے''

''ہوگا پھر کیا ہوا۔''

میں نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

جواب دے کر میں نے کلاس جانے کے لیے مڑتے ہوئے قیدی کی جانب دیکھا۔ اس کے سر پر لمبے گندے اُلجھے بالوں کا گچھا، کسی پرندے کا گھونسلہ لگ رہا تھا۔ وہ چھوٹا میلا کچیلا گندا پھٹا پرانا کمبل کا ایک ٹکڑا اوڑھے ہوئے تھا۔ وہ بھکاریوں کا سا لباس پہنے آنکھیں نیچے کیے میرے سامنے کھڑا تھا۔ یقیناً وہ پچھلے ایک ماہ سے نہایا نہ تھا۔ بدن پر ایک پتلی ململ کی ٹوٹے بٹنوں والی پھٹی قمیص، پاؤں میں ٹوٹی ہوئی ہوائی چپل پہنے تھا۔

میں اُسے پہچان نہ سکا۔ میں نے کانسٹیبل سے کہا۔

''میں تو اِسے نہیں جانتا۔''

سپاہی بولا۔

''بیچارہ پچھلے دو ماہ سے آوارہ گردی کے الزام میں قید ہے اس کا کوئی جاننے والا اس شہر میں نہیں ہے۔ جو اس کی ضمانت دے کر اسے رہا کروائے''۔

''میرا اِس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں اِس کی ضمانت نہیں دے سکتا۔''

کانسٹیبل پھر بولا۔

''جناب آج جج صاحب نے مجھے خاص طور پر کہا ہے۔ کہ یہ لڑکا کسی شریف خاندان کا فرد دکھائی دیتا ہے۔ میں کالج کے راستے سے جاؤں شاید کوئی لڑکا اس کو پہچان لے اور اس کی مدد کرے۔''

کانسٹیبل نے ایک ہی سانس میں اس دن کی کاروائی بیان کر دی۔

''مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں، میں اس کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ میں کلاس سے لیٹ ہو رہا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں کالج کی جانب مڑا۔ کانسٹیبل نے پھر آواز دی۔

''جناب اس لڑکے کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو جانتا ہے اور آپ کا نام فاروق بتا رہا ہے''۔

اپنا نام سُنتے ہی میں چونک گیا۔ میں نے مڑ کر قیدی کی جانب غور سے دیکھا۔

قیدی بولا۔

''بھائی جان میں فلاں صاحب جو آپ کے بڑے بھائی عبدالغفور صاحب کے افسر ہیں کا بیٹا ہوں۔''

اب کی بار میں نے اُسے آواز سے پہچان لیا تھا۔ ایک دفعہ اس کے والد صاحب نے اسے میرے پاس پڑھائی میں دلچسپی نہ لینے پر لارنس پور میں ملازمت کے لیے بھیجا تھا۔ میں اُسے صرف دو روز ہی اپنے پاس رکھ سکا تھا۔ اس نے میرے تکیہ کے نیچے رکھے پیسے چوری کر لیے تھے۔ جس کے بعد میرے پاس ناشتہ کے لیے بھی پیسے نہ بچے تھے۔ جب میں نے اس سے پیسوں کے متعلق دریافت کیا تو اُس نے لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا۔ اُسے اِس حالت میں دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پاوں تلے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ میرے ذہن میں الٰہ باد شہر کا مرکزی چوک آ گیا جہاں پر ایک ڈونڈی پیٹنے والا شخص ایک ٹینس ریکٹ کے فریم پر چمڑا لگائے ڈونڈی پیٹ کر عوام کو متوجہ کرنے کے بعد اعلان کر رہا تھا۔

''ہوشیار لوگو توجہ سے سُن لو آج بعد از نماز ظہر مجلس احرار ہند کے دو ممبران کو کیمپ میں دیر سے آنے پر سزا دی جائے گی۔''

بعد از نماز ظہر اس چوک میں مرکزی مجلس عمل احرار کے ممبران تشریف لائے۔ دونوں ملزمان دو پہرہ داروں کے ہمراہ فیصلہ سننے کے لئے حاضر ہو گئے۔ ان ملزمان میں ایک میونسپل کمیٹی الہ آباد کا صدر اور دوسرا مجلس احرار الہ آباد کا صدر تھا۔ مجلس کی نظم وضبط کمیٹی نے اپنا فیصلہ سنایا کہ دونوں کو پانچ پانچ کوڑے مارے جائیں۔ حکومت ہند کا ایک پولیس افسر میونسپل کمیٹی کے صدر کے پاس آیا اور اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ دوسرے کے پاس گیا۔ اس کے کان میں کچھ کہا جواب میں دونوں ملزمان نے یک زبان ہو کر کہا۔

''یہ ہمارا اور پارٹی کا معاملہ ہے حکومت ہند کے کسی قانون کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ ہم جانیں اور ہماری پارٹی۔ آپ اپنی پولیس کو واپس لے جائیں۔''

اور پھر مجلس نظم وضبط کے صدر نے دونوں کو کوڑے مارے جانے کا حکم دیا۔

یہ لڑکا اُس حکم دینے والی مجلس نظم وضبط کے صدر کا بیٹا تھا۔اس کے والد صاحب کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا۔وہ مجلسِ احرار کے بانی ارکان میں سے تھے۔ اکثر دفتری اوقات کے بعد اکیلے ہی دفتر کے لان میں کندھے پر بیلچہ لگائے پریڈ کرتے۔خود ہی اپنے منہ سے اپنے لیئے۔آگے چل۔ پیچھے مڑ۔رک جا۔ کہتے اور پندرہ منٹ تک پریڈ کرنے کے بعد خود ہی اپنے لیئے۔آسان باش اور برخواست کا نعرہ لگاتے۔لوگ اُنہیں پریڈ کرتے اور 'چپ'، 'راست' کا نعرہ لگاتے دیکھنے آجاتے۔وہ مجلس احرار کی بہت سی کمیٹیوں کا ممبر ہونے کے علاوہ مرکزی نظم وضبط کمیٹی کے صدر بھی تھے۔ان دنوں کیمبل پور کا ڈپٹی کمشنر ان کا پرانا شاگرد تھا۔اسے پرائمری میں ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ایک دفعہ وہاں سے گزرتے ہوئے دفتر میں انہیں ملنے بھی آیا تھا۔ان کے شاگرد عزیز ڈپٹی کمشنر نے اپنے اُستاد کو رہائش کے لیئے ایک دومنزلہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔آج مجلس احرار کے بانی رکن کا بیٹا میرے سامنے ہتھکڑی پہنے کھڑا تھا۔میں نے بیساختہ اپنے ہاتھوں میں پکڑی کاپی اُس کے مُنہ پر دے ماری، اور بولا۔

''اوہ تم اتنے گر گئے ہو کہ اب تم آوارہ گردی میں گرفتار ہو۔تمہاری یہ حالت''

اُس نے کاپی سے بچنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ میری کاپی کی جلد علیحدہ ہو کر دور جا گری۔ پولیس کانسٹیبل نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا کہ میں نے اُسے کاپی کیوں ماری۔قیدی شرمندگی سے آنکھیں نیچے کیئے رو پڑا۔آنسو اُس کے چہرے سے سیاہ میل کو لیے لکیر کی صورت ڈھلک پڑے۔میرا تمام غصہ جاتا رہا۔کانسٹیبل نے بتایا کہ اس کے پاس نہ تو کھانے کے پیسے ہیں نہ دوسرے کپڑے کہ دھو کر پہن سکے۔ یہ کہتا ہے کہ رات کو سڑک پر سو رہا تھا۔کوئی شخص اس کے جوتے اور کپڑے اُٹھا کر لے گیا۔پولیس اِسے آوارہ گردی کے الزام میں سڑک سے ہی پکڑ کر لائی تھی۔

پولیس کانسٹیبل دل میں خوش تھا۔کہ جج صاحب کی خواہش پوری ہو گئی۔اُن کو بھی اس بچے پر رحم آیا تھا، کہ کسی شریف خاندان کا چشم و چراغ سکول سے بھاگا ہوا بچہ ہے۔ سپاہی کہنے لگا کہ آپ اگر جج صاحب کو لکھ دیں کہ آپ اُسے گھر پہنچا دیں گے تو میں ابھی واپس جاتا ہوں۔ میں نے ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔البتہ سپاہی سے وعدہ کیا کہ میں اس کے والد صاحب کو آج ہی مطلع کر دونگا۔سپاہی نے بتایا کہ پانچ روز کے بعد اُسے جج صاحب نے دوبارہ پیش کرنے کا حکم دیا ہے۔

میں نے اُسی وقت ایک کارڈ ڈاکخانہ سے خرید کر وہیں کھڑے کھڑے کیمبل پور اپنے بھائی جی عبدالغفور کو تحریر کیا، کہ فلاں صاحب کا بیٹا یہاں آوارہ گردی کے جرم میں گرفتار ہے۔ اور اس کی اگلی پیشی فلاں تاریخ کو ہے۔کچھ عرصہ بعد اسی راستہ پر اسی کانسٹیبل سے دوبارہ ملاقات ہوگئی۔اس نے بتایا کہ اُس کے والد مقررہ تاریخ پر آکر اُس کی ضمانت دے کر اُسے لے گئے تھے۔

ایف اے پاس کرنے بعد میں نے ایک اخبار میں اعزازی طور پر کام کرنا شروع کر دیا تھا۔وہ ایک غیر معروف مقامی اخبار تھا۔اخبار کے دفتر میں مجھے قومی اور مقامی خبریں ریڈیو سے سن کر نقل کرنی ہوتیں۔ان خبروں کو میں دوبارہ پڑھ کر اہمیت کی چیزیں ایڈیٹر کو لکھ دیتا وہ انہیں خبر کی شکل دے کر چھاپ دیتا۔

فاہیان کے نقش قدم پر

چکوال کالج سے بی اے کا امتحان دو بار دیا۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کبھی ایک مضمون کا ممتحن فیل کر دیتا۔ کبھی دوسرے میں ممتحن ناکام کر دیتا۔ لیکن ہمت نہ ہاری انجام کار ایک بار سب میں کامیاب ہوا۔ گریجویشن کے بعد میرا ارادہ تو انگریزی زبان میں ایم اے کرنے کا تھا۔ لیکن بھائیا جی غلام صدیق کا خیال تھا کہ قانون کا پیشہ اپناؤں۔

ایم۔اے انگریزی کی کلاسز صرف راولپنڈی اور لاہور میں ہوتی تھیں۔ داخلہ کے لیے جب پہنچا تو معلوم ہُوا کہ داخلے تو مکمل ہو چکے ہیں اور یہی حال لاء کالج کا تھا۔ وہاں بھی داخلے مکمل ہو چکے تھے۔ اپنی خواہش کے مطابق انگریزی زبان میں داخلہ نہ مل سکا اور نہ بھائیا جی کی رائے کو عملی جامہ پہنا سکا۔ مجبوراً پشاور چلا گیا۔ وہاں میرے ایک خالو انسپکٹر پولیس سکونت پذیر تھے۔ پنجاب کے لئے مختص تمام سیٹوں پر داخلہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ میرے ہمراہ یونیورسٹی سفارش کرنے گئے۔ انہوں نے پرنسپل سے کہا ہم پنجاب کے رہائشی ضرور ہیں۔ ہمارا مستقل پتہ تو پنجاب میں ہے لیکن ہم ملازمت تو سرحد میں کرتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو اسی صوبہ کا رہائشی تصور کیا جائے۔ لیکن جب وہ رپورٹ لکھنے لگا تو فارم پر مستقل اور موجودہ پتہ پنجاب کا تحریر تھا۔ اور یہ فارم میں نے بیس روز پہلے بذریعہ ڈاک ارسال کیا تھا۔ اس پر تو کوئی اضافہ یا تبدیلی نہ کی جا سکتی تھی۔ مجبوراً واپس پنجاب آ گیا۔

فزیکل ایجوکیشن کالج لاہور میں داخلے ابھی شروع نہ ہوئے تھے۔ ان کے ٹسٹ دیئے۔ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔ لیکن فیس جمع نہ کروائی۔ مجھے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید لاء کالج پشاور

میں داخلہ مل جائے۔ خالو نے بھرپور کوشش کا وعدہ بھی کیا لیکن انہیں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ان کی ''نو ہوپ'' کی ٹیلیگرام آئی، مجبوراً فزیکل کالج میں آ گیا۔ لیٹ فیس جرمانہ کے ساتھ جمع کروائی، کلاسز کو شروع ہوئے دس دن گذر چکے تھے۔

اُسی دن پورا کالج سٹڈی ٹور پر وادیِ کاغان جا رہا تھا۔ میں کالج جانے کی بجائے لاہور ریلوے سٹیشن پر ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ ہم سب طلباء ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ البتہ لاہور ضلع کے طلباء کے گروپ نے کچھ دیر تک رونق لگائے رکھی۔ وہ ایک کتا کہیں سے پکڑ لائے۔ اس نے خوب اودھم مچایا کبھی ایک کے پاؤں میں ہوتا تو کبھی دوسرے کی جھولی میں آن گرتا۔ پورا ڈبہ کتا لانے والے کو گالیاں دے رہا تھا۔ آخر ایک چھوٹے ریلوے سٹیشن پر کسی نے کتے کو کھڑکی سے باہر پھینکا۔

گاڑی مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ ہمارا تمام سامان ابھی تک دروازہ کے پاس ہی رکھا تھا اور میں بھی وہیں دروازہ کے پاس ہی کھڑا تھا کہ گاڑی کسی چھوٹے ریلوے سٹیشن پر رُکی۔ ایک مسافر جلدی سے گاڑی میں سوار ہوا۔ اس نے دروازہ کے پاس رکھے میرے بستر کو اپنی طرف گھسیٹا۔ میں پاس ہی کھڑا تھا۔ میں نے بستر پر اپنی گرفت مظبوط کر کے اس سے پوچھا کیا بات ہے؟ بستر کو کیوں گھسیٹ رہے ہو۔ وہ بولا۔ ''بستر میرا ہے میں یہاں اتر رہا ہوں۔''
''تمہارا بستر دوسرے ڈبہ میں ہوگا یہ میرا ہے۔''
اس نے بستر کو چھوڑ دیا اور دوسرے ڈبہ کی جانب لپکا۔ رات بارہ بجے کے بعد کچھ رش کم ہوا میں نے دروازہ کے پاس فرش پر بستر بچھایا اور وہیں لیٹ گیا۔ میری تقلید میں چند اور لڑکے فرش پر ہی بستر لگا کر لیٹ گئے۔ ہمیں صرف اتنی جان پہچان ہوئی۔ ایک دوسرے کا نام پوچھا اور خاموشی سے سو گئے۔ صبح سویرے تقریباً آٹھ بجے ہم ہری پور پہنچے خیال تھا کہ ناشتہ کے بعد، ہری پور میں شہر دیکھنے کے لیے کچھ وقت مل جائے گا۔ لیکن چیف ڈی مشن نے حکم صادر فرمایا۔
''گیٹ کے باہر بسیں کھڑی ہیں۔ اپنا اپنا سامان اُٹھاؤ اور بسوں میں سوار ہو جاؤ۔ دوپہر کا کھانا بالاکوٹ میں جا کر کھائیں گے۔'' سب بسوں میں سوار ہو گئے۔ ہری پور سے نکلے تو پہلے ایبٹ آباد سے گزرے، جو ہری پور کے مقابلے میں صاف ستھرا اور روشن شہر تھا۔ لڑکوں نے وہاں رُکنے کی اجازت چاہی تا کہ ناشتہ کر سکیں۔ لیکن چیف ڈی مشن نے انکار کر دیا۔ ایبٹ آباد سے بل کھاتی

سڑک پر گاڑی بڑی سست رفتاری سے چل رہی تھی۔

کہ ایک لڑکے نے ماہیا کے بول اونچی آواز میں کہے۔

''چٹا ککڑ بنیرے تے، کاسنی دوپٹے والی اے منڈا عاشق تیرے تے''

اس بول نے ماحول کافی رومانٹک کردیا۔اب ہر لڑکا گنگنانے کی کوشش کررہا تھا۔ایک آواز آئی۔

''آوارہ ہوں''

دلیپ کمار کی مشہور فلم آوارہ کا گانا ایک لڑکے نے گنگنایا۔

''آوارہ ہوں یا گردش میں ہوں آسمان کا تارہ ہوں، آوارہ ہوں''

تمام لڑکے گانا سننے کے لیے خاموش ہوگئے۔ وہ لڑکا کان پر ہاتھ رکھے، بڑے ردھم اور ترنم کے ساتھ گانا سنا رہا تھا۔

پروفیسر صاحب جو ڈرائیور کی ساتھ والی اکیلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ڈرائیور سے کہا۔

''بھئی ایکس لیٹر دباؤ، لڑکوں نے صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا۔جتنی جلدی ہوسکے بالاکوٹ پہنچو۔تاکہ لڑکے دوپہر کا کھانا تو وقت پر کھاسکیں۔''

ڈرائیور بولا۔

''جناب ذرا دمہ کریں اِس موڑ کاٹتی پکی سڑک پر جلدی میں کہیں گاڑی بے قابو نہ ہوجائے بس مکمل بھری ہوئی ہے۔اس کے علاوہ چند لڑکے بس کی چھت پر بھی بیٹھے ہیں۔''

چھت پر لڑکوں کا سُنتے ہی پروفیسر صاحب نے ڈرائیور کو بس روکنے کا حکم دیا۔ نیچے اُتر کر دیکھا کہ چار لڑکے پاؤں بس کی سکرین کی جانب لٹکائے اور چند چھت پر ٹول بکس پر ٹیک لگائے بڑے آرام سے ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے تمام بسوں کو روکنے کا حکم دیا اور چھت پر بیٹھے لڑکوں کو بس کے اندر بیٹھ جانے کا کہا۔

ہر بس میں بہت سی سیٹیں خالی تھیں۔ چند طلباء بضد تھے کہ انہیں یہاں بیٹھنے دیں، یہاں بڑے مزے میں ہیں۔

''میرا چالان ہوجائے گا۔سب نیچے آؤ سفر ابھی لمبا ہے آپ کی عیاشی میرے لیے مصیبت بن سکتی ہے۔ خدانخواستہ اگر بس کسی وجہ سے بے قابو ہوگئی تو آپ سب کا وزن ایک جانب ہوجائے گا

اور بس الٹ جائے گی۔''

دوپہر ہونے کو تھی کہ ہم مانسہرہ میں تھے۔ مانسہرہ ایک پُر رونق شہر لگا۔ سڑک کے دوسری جانب جانوروں کی منڈی لگی تھی خریدار بھی کافی تھے۔ آبادی کے اختتام کے قریب سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ایک سڑک گلگت وشمالی علاقاجات اور دوسری بالاکوٹ کو جارہی تھی۔تھوڑا سفر طے کرنے کے بعد پروفیسر صاحب نے ایک چھوٹی پہاڑی کے دامن میں گاڑیاں رکوادیں۔

سڑک کے دونوں جانب اس پہاڑی پر اشوکا نے بدھ مذہب کے احکامات کندہ کروادیئے تھے۔تاکہ لوگ انہیں پڑھیں اور ان پر عمل کریں۔تمام لڑکے ان احکامات کو پڑھنے کے لیئے اتر گئے۔ چند لڑکے تو چٹانوں کے قریب اپنا قد اوپر نیچے کر کے لفظوں کو پڑھنے کی کوشش بھی کررہے تھے۔

''یہ کونسی زبان ہے''

ایک لڑکے نے پروفیسر صاحب سے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔ یہ زبان آج سے دو ہزار سال پہلے لکھی اور بولی جاتی تھی۔''

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے ڈرائیور کو گاڑی سٹارٹ کرنے کو کہا۔ وہ سٹیرنگ پر سر رکھ کر آرام کر رہا تھا۔فوراً سیدھا بیٹھ گیا اور اُس نے دائیں ہاتھ سے چابی گھمائی انجن سٹارٹ ہوگیا۔ڈرائیور نے گیئر بدلا۔ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھی لڑکوں نے دوڑ کر چلتی گاڑی پر چڑھنا شروع کردیا۔ چند لڑکے دروازے میں کھڑے ہوگئے باقی کے لڑکے گاڑی کی پشت پر لگے جنگلے اور لوہے کی سیڑھیوں پر لٹک گئے اور باری باری دروازہ کی جانب بڑھ کر گاڑیوں میں سوار ہوتے گئے۔

دوپہر ڈھلے ہم بالاکوٹ میں تھے۔گاڑیوں سے اترنے کے ساتھ ہی لڑکے شہر کی سیر کو نکل گئے۔اس چھوٹے قصبہ کا بازار بہت تنگ تھا۔ بازار کی تمام دکانیں سامان سے لدی تھیں۔وادی کاغان کی ضروریات کو بالاکوٹ سے ہی پورا کیا جاتا تھا۔ ہم بازار میں ہی گھوم پھر رہے تھے کہ باورچی نے زور سے آواز دے کر کہا۔

''کھانا تیار ہے۔لڑکے آجائیں۔''

باورچی کچن کی پلیٹیں ہمراہ نہ لایا تھا۔میں ایک مگ، چائے، دودھ اور پانی پینے کے لیے ساتھ لایا تھا۔ایک لڑکے سے پلیٹ لے کر سالن لیا۔اپنے حصہ کا حلوہ مگ میں ڈلوا کر چمچ سے نکال کھایا۔

اورگلاس مانگ کر پانی پیا۔ابھی کھانے سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ پروفیسر صاحب نے لڑکوں کو گاڑیوں میں سوار ہونے کا کہا۔ ہرگاڑی میں تقریباً آدھے لڑکے ہی بیٹھے تھے۔
پروفیسر صاحبنے گاڑیوں کو چلنے کا حکم دے دیا۔چلتی گاڑی میں سوار ہونا لڑکوں کی اب عادت بن گئی تھی۔گاڑیاں دریائے کنہار کے پُل کے نزدیک جا کر اس طرف ہی رُک گئیں۔ بالاکوٹ سے آگے گاڑیاں یک طرفہ ٹریفک میں چلتیں۔سڑک تنگ اور کچی تھی اس پر صرف چھوٹی بس، جیپ یا چھوٹے ٹرک ہی چل سکتے۔ چاروں بسیں دریائے کنہار کے پُل پر جا کر جھنڈی کے انتظار میں رک گئیں۔ وہاں پہنچنے تک تمام لڑکے گاڑیوں میں سوار ہو چکے تھے۔ جوا کا دکا بچ گئے وہ پل پر شامل ہوگئے پل کے بعد سڑک کو پہاڑ کھود کر ہموار کیا گیا تھا۔ وہ بہت تنگ سڑک تھی، بڑی گاڑیاں پوری سڑک کو گھیر لیتیں۔جس سے سڑک پر پیدل چلنے والے مسافروں کے لیے کھڑے ہونے کی محفوظ جگہ نہ بچتی۔اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ہر دس فٹ کے فاصلہ پر پہاڑ کے اندر دوفٹ گہرا ایک محراب کھودا ہوا تھا۔ پیدل چلنے والا مسافر محراب کے اندر سما کر ٹرک یا بس کو گزرنے کا موقع فراہم کرتا۔

یہ تنگ سڑک پہاڑ کے دامن میں دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ بل کھاتی چل رہی تھی۔ دریا اور سڑک کے درمیان پتھروں کی دیواریں ہر چار فٹ کے فاصلہ پر بنی تھی۔مغرب کے قریب پارس نامی قصبہ پہنچے۔رات یوتھ ہاسٹل میں قیام کا انتظام تھا۔ پارس یوتھ ہوسٹل میں صرف دو ہی کمرے تھے۔ پروفیسر صاحبان ان میں رُک گئے ۔یہاں پہاڑ نسبتاً ہموار تھا۔یوتھ ہاسٹل کے ساتھ ہی سڑک کے کنارے ایک چھوٹا ہوٹل بنا تھا۔ جو صرف دن کے وقت ہی کھولا جاتا۔مغرب کے بعد اس سڑک کو ٹریفک کے لیئے بند کر دیا جاتا۔عشاء کے قریب تمام طلباء دریائے کُنہار کے کنارے ہی سڑک پر کھلے آسمان تلے بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ دریا کے شور کی بنا پر ابتداء میں سو ہی نہ سکے۔ آدھی رات کے بعد ہی کسی وقت نیند آئی۔ رات کافی سرد ہوگئی، گرمیوں کی رات تھی گزارہ ہوگیا۔ ہماری مَنزِل تو سطح سمندر سے سات ہزار فٹ بلندی پر واقع شڑان تھی۔

ابھی تمام لڑکے سڑک پر سو رہے تھے کہ پانچ چھ گاڑیوں کا ایک چھوٹا قافلہ بالاکوٹ سے گلگت جانے کے لیے سڑک پر آ کھڑا ہوا تھا۔ تمام گاڑیاں ایک ہی وقت میں ہارن بجا رہیں تھیں۔ گاڑیوں کے ہارن کے شور سے لڑکے جاگ گئے۔ ٹیچر نے کہا اپنا اپنا بستر ایک جانب رکھو

اور گاڑیوں کو آگے بڑھنے کا راستہ دو۔چھوٹے ڈڈو ٹرک سامان اور سواریوں سے لدے گزرنا شروع ہوگئے۔ ہر جیپ پر سواریوں کا سامان گاڑی کی باڈی کے باہر لٹکا ہوا تھا۔
پروفیسر صاحب سے ایک لڑکے نے دریافت کیا۔
''سر ناشتہ کب ملے گا۔''
''پہلے ہاتھ منہ دھولو پھر ناشتے کا مطالبہ کرنا۔''
سب لڑکے ناشتہ کی توقع پر ہاتھ منہ دھونے دریا کے کنارے پھیل گئے۔پانی بہت صاف اور شفاف تھا تہہ کے پتھر صاف نظر آرہے تھے۔کہیں کہیں دریا سڑک کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ چندلڑکے جہاں پانی کم گہرا دکھائی دیا سڑک کی دیوار پر ہاتھ رکھ کر دریا میں کود گئے۔ دریا کا پانی یخ ٹھنڈا تھا۔ اگلے ہی لمحہ وہ سب چھلانگ لگا کر واپس سڑک پر آگئے۔
''ٹھنڈا ہے یار بہت ٹھنڈا ہے۔''
ایک اور بولا۔
''ٹھنڈا کہاں وہ تو برف ہے۔ دفعہ کرو منہ دھونے کو بھلا شیر کب منہ دھوتے ہیں۔''
ناشتہ کی کی بجائے پروفیسر صاحب نے ہر ایک لڑکے کو ایک بڑا رس پکڑایا اور فرمایا کہ ابھی دوسرا سامان نہیں پہنچا، آپ فی الحال اسی پر گزارہ کریں۔انشاللہ کل سے آپکو چائے کے ساتھ ناشتہ ملے گا۔ پروفیسر صاحب نے تمام لڑکوں سے کہا۔
''اپنا سامان اُٹھاؤ''
سامنے پہاڑ پر ایک سفید لکیر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''وہ شڑان جانے کا راستہ ہے۔ یہ دومیل کا پہاڑی راستہ شڑان یوتھ ہوسٹل کو جاتا ہے۔راستہ میں گائیڈ آپکا انتظار کر رہا ہے۔وہ آپکو یوتھ ہوسٹل تک لے جائے گا۔''
لڑکوں نے بستروں کو کندھے پر اُٹھایا اور دریائے کنہار پر بنے معلق پُل کو پار کر کے پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔لڑکے ایک لائن میں اپنا اپنا بیگ اُٹھائے چیونٹیوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے تھے۔اس تنگ راستہ پر صرف ایک شخص ہی چل سکتا تھا۔سامنے سے آنے والے کو راستہ دینے کے لیے دونوں میں سے ایک کو پہاڑ سے ٹیک لگا کر رُک جانا پڑتا اور دوسرا گزرتا۔ پہاڑ کی ڈھلوان کوئی زیادہ نہ تھی۔شڑان تک جیپ کا راستہ موجود تھا لیکن وہ دس میل آگے

بنے پل سے دریائے کنہار کو پار کرتا اور واپس شڑاں آتا۔ شروع میں لڑکے تیز چل رہے تھے۔ لیکن بہت جلد سب پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ایک ہموار جگہ ہوسٹل کا ملازم پہلے سے بیٹھا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں سے شڑان کا راستہ دائیں اور بائیں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ اس نے بتایا کہ دائیں جانب جانے والا راستہ آگے جا کر تنگ گھاٹیوں سے گزرتا ہے۔ جب کہ بائیں جانب کا راستہ ہموار مگر لمبا ہے۔ آپ بائیں راستہ سے جائیں۔ ہوسٹل کا چوکیدار تحکمانہ انداز میں لڑکوں سے باتیں کر رہا تھا، بولا۔

''سب اپنا بستر اور سامان اُٹھاؤ اور چلو''

ہم میں سے ایک نے اسے کہا۔

''بستر تم اُٹھا لو، میں تمہیں ایک روپیہ دے دوں گا''

وہ ایک روپیہ فی بستر لے کر جانے پر راضی ہو گیا۔ اُس نے اپنا کمبل جسے اُس نے اپنے گرد لپیٹ رکھا تھا زمین پر بچھایا اور بولا۔

''سب اپنا اپنا بستر اس میں ڈالو، میں اٹھا لیتا ہوں، آپ سب اس لمبے راستہ سے آگے بڑھیں۔ میں آپ کے سامان کا گٹھڑ لے کر آپ کے پہنچنے سے پہلے ہوسٹل پہنچ جاؤنگا۔''

اس نے تمام بستروں کا گٹھڑ بنا سر پر رکھا اور دائیں راستہ سے جسے وہ مشکل بتا رہا تھا۔ یہ جا وہ جا ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک لڑکے کو خیال آیا کہ یہ شخص ہمارے بستر لے کر اگر اپنے گھر چلا گیا، تو ہم سب رات کیسے گزاریں گے۔ ہم میں سے تو کوئی بھی اس کو نہ جانتا ہے۔ وہ تو ہمیں پہلی بار راستہ میں ملا ہے۔ وہ تو جا چکا تھا، اب ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ خاموشی سے اللہ توکل آگے چل دیئے۔ تقریباً ایک میل چلنے کے بعد دور جنگل میں آخروٹ کے درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا۔ اُن درختوں کے درمیان ایک عمارت کھڑی تھی۔ شڑاں یوتھ ہوسٹل کا ایک بورڈ بھی نصب تھا۔ ہمارے پہنچنے سے پیشتر چوکیدار ہمارے بستر لیے وہاں پہنچ چکا تھا۔

زیادہ تر لڑکے اپنے ساتھ کمبل لائے تھے۔ میں چونکہ اس سے پہلے مری کی رات کا تجربہ کر چکا تھا۔ میں اپنے بستر میں رضائی لیکر گیا۔ رات کو درجہ حرارت منفی درجہ تک گر گیا۔ تمام لڑکے کمبلوں میں کانپ رہے تھے۔ میرے دائیں جانب لیٹے لڑکے نے رضائی میں پناہ کی درخواست کی۔ وہ اپنے ساتھ ایک کمبل ہی لایا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو پہنچانتے نہ تھے۔ تاہم مجھے کوئی

اعتراض نہ ہُوا۔ رضائی بھی منفی درجہ حرارت میں سردی کو نہ روک رہی تھی۔ اس نے اپنا کمل میری رضائی پر ڈال دیا اور میری رضائی کے نیچے آ گیا۔ بائیں جانب سے لڑکے نے بھی اس کے دیکھا دیکھی رضائی میں پناہ کی درخواست کی وہ بھی میری رضائی میں گھس آیا۔ میری رضائی پر ایک کمبل مزید آ گیا۔ اب ہم تین لڑکے ایک گرم رضائی کے اندر تھے۔ سب کو اگلے پانچ روز تک آرام ہو گیا۔

کاغان میں پہلے دو روز ہمیں پہاڑ پر رسہ کی مدد سے عمودی چڑھنے اور اترنے کی مشق کرائی گئی۔ دوسری شب کیمپ فائر کا پروگرام تھا جنگل سے بہت سی لکڑیاں منگوا کر جلائی گئیں۔ کوئلوں کی حِدت اور خشک لکڑی سے نکلتے شعلوں نے ماحول کو گرم کر دیا۔ سیکرٹری یوتھ ہاسٹل اور چیف ڈی مشن صاحب تشریف لائے اور ایک طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کیمپ فائر کے پنڈال کے لئے درمیان میں کافی جگہ خالی چھوڑ دی گئی۔ سیکرٹری یوتھ ہاسٹل نے کیمپ فائر کے آغاز کا کہا۔ اس نے ایک گائیڈ کو گانا سُنانے کے لیے بلایا۔ اس نے لتا کا گانا گایا۔

''گلی میں آج چاند نکلا''

لڑکوں نے تالیاں بجا کر داد دی۔ گائیڈ طلباء سے مخاطب ہوا، کہ کوئی لڑکا آ کر گانا سُنائے۔ ایک منچلا لڑکا اُٹھا اُس نے گانا شروع کیا۔

''آوارہ ہوں۔ آوارہ ہوں۔ یا گردش میں ہوں آسمان کا تارا ہوں''۔

لڑکوں نے وہ شور مچایا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تالیاں بجا بجا کر داد کیا دی جنگل سر پر اُٹھا لیا۔ اناونسر نے کہا، اب آپ کو بابا بُھلے شاہ کا کلام سناتے ہیں۔

''ویکھ بندیا آسماناں تے اڈدے پنچھی
ویکھ تے سہی کی کردے نے
نہ او کردے رزق ذخیرہ
نہ او بھکے مردے نے
کدے کسے نے پنکھ پکھیرہ
بُھو کھے مردے ویکھے نے؟
بندے ہی کردے رزق ذخیرہ

بندے ہی بُھوکھے مردے نے''

لڑکوں نے خوب تالیاں بجا کر کلام سراہا۔اور مزید مزید کا شور مچا دیا۔اناونسر نے کہا، چند شعر پیش کرتا ہوں۔

''نہ کر بندیا میری میری

نہ تیری نہ میری

چار دناں دا میلہ

دنیا فیر مٹی دی ڈھیری''

لڑکوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھالیا۔اس کے بعد خوب ماحول بن گیا۔رات گئے تک بیشمار خاکے، گانے، شعروشاعری اور لطیفے سنائے گئے۔

اختتام پر اناونسر نے ایک لطیفہ پیش کیا، آپ کیلیے پیش ہے۔

''میاں بیوی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔خاوند نے سوچا کہ اس نے کبھی تعریف نہیں کی چلو آج کر دیتا ہوں۔بیگم سے مخاطب ہوا۔

بیگم آج تم نے دال چنا بہت ہی لذیذ پکائی ہے۔

بیگم غصہ کے عالم میں بولی پچھلے پانچ سال سے میں تمھیں پکا کے کھلا رہی ہوں۔ وہ تمھیں کبھی اچھی نہ لگی۔آج ہمسائی نے دال بھیجی تمھیں بہت پسند آئی ہے۔''

لڑکوں نے خوب زور کی تالیاں بجائیں اور مطالبہ کیا ایک لطیفہ اور بھی سناو۔لیکن وہ کہنے لگا پھر کبھی کوئی یاد آ گیا تو سنا دونگا۔اناونسر نے کیمپ فائر کے ختم ہونے کا اعلان کر دیا۔تمام لڑکے تالیاں بجاتے کمروں میں چلے گئے۔

تیسرے روز ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جایا گیا۔گائیڈ نے اس کا ایک نام بھی بتایا۔جو میں فراموش کر چکا ہوں۔گائیڈ نے اشارہ سے بتایا کہ یہاں سے چند پہاڑ آگے کلاش وادی کی حد شُروع ہوجاتی ہے۔اِن وادیوں کے رہائشی کیلاش قبیلہ کے لوگ یونانی النسل ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ ان کے اباواجداد سکندرِاعظم کے ہمراہ آئے۔چند سپاہی یہیں رُک گئے تھے۔یہ اُن فوجیوں کی اولاد ہیں۔

ایک لڑکے نے کھڑے ہوکر گائیڈ سے کہا کہ ان لوگوں کے متعلق کچھ بتلایں۔ان یونانی

النسل لوگوں کو ہم نے کہیں گھومتے پھرتے نہیں دیکھا۔گائیڈ بولا۔''ان لوگوں کو وادی سے باہر جانے کے لیئے مہتر چترال سے اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ لوگ اپنی مدد آپ کے تحت اشیاءِضرورت پیدا کرتے ہیں۔لہذا آپ ان لوگوں کو شہروں میں گھومتے پھرتے نہیں دیکھ سکتے۔''

اسی لڑکے نے دوسرا سوال کیا۔

''کیا یہ وادی ان کے لیے ایک قید خانہ نہیں؟ جس کی دیواریں اونچے پہاڑ اور اندر بسنے والے قیدی ہیں جو اپنے آپ کو آزاد تصور کرتے ہیں۔''

گائیڈ اس سوال پر بڑا پریشان ہوا۔بولا، یہ لوگ قیدی نہیں یہ پاکستان کے شہری ہیں۔پاکستان میں ہر جگہ آ جا سکتے ہیں۔تاہم مزید وضاحت اور آپ کے سوالوں کا مفصل جواب دینے کے لیے میں سیکریٹری صاحب سے درخواست کرونگا، کہ وہ آکر آپ کو مطمئن کریں۔اس کے علاوہ بھی وہ ان لوگوں کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں، آپ کو بتلائیں۔وہ سانولے رنگ کے چھوٹے قد مگر گُٹھے جسم کے مالک تھے، بولے۔

''اس قبیلہ کی آمد کی کہانی تو گائیڈ بتا چکا ہے۔یہ لوگ ایک ایسی تہذیب کے امین ہیں جو آج سے دوہزار سال پہلے یونان میں تھی۔یہ تہذیب جدید خیالات، عقائد اور تفرقات سے مبرا ہے۔اس علاقہ کی فضا موجودہ زمانہ کی الائشات سے پاک ہے۔اس وادی کی ہوائیں ازل سے وہی ہیں جو خالق حقیقی نے زندگی کا سانس دیتے وقت انسان کو عطا کی تھیں۔ہر چیز، اپنی اصلی حالت میں برقرار ہے۔اس علاقہ کی فضاء انتہائی صاف اور پانی قدرتی شفاف ہے۔کیلاش قبیلہ میں زندگی انتہائی پرسکون ہے۔یہ لوگ ناقابل یقین حد تک سادہ زندگی گزارتے ہیں۔حکومتِ پاکستان کے علاوہ یونائیٹڈ نیشن بھی یہی چاہتی ہے کہ کیلاش قبیلہ کا تہذیب وتمدن اپنی اصلی حالت میں برقراررہے۔کیونکہ یہ بھی ایک اہم عالمی تمدنی وارثت ہے''

(Kalash valleys will be lost if not included in Unesco World Heritage List for preservation)

اور کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر بولے۔

''اِن کے آباؤاجداد ہی اِن کی یونیورسٹیاں ہیں وہی اِن کو اپنی روایات اور عقائد کی تعلیم دیتے ہیں۔اِن کی، عادات، پسند اور ناپسند سادہ اور قدیم ترین ہیں۔ان کا یقین انتہائی محکم ہے۔اس

قبیلہ کے لوگ افغانستان کے صوبہ نورستان اور پاکستان کے علاقہ کیلاش جسے عرف عام میں کافرستان کہا جاتا ہے میں رہتے ہیں۔ اِن لوگوں میں غمی کا کوئی تہوار نہیں البتہ خوشی کے تین تہوار ہیں جنہیں جوشی، اُچھاؤ اور کاموس کہتے ہیں۔ ان تہوار کے دنوں میں قبیلہ کے لوگ دیر تک ڈانس کرتے اور کھیلوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا مشترکہ ڈانس پر زیادہ زور رہتا ہے۔ اِن کے پاس جنگ میں استعمال والے کوئی ہتھیار نہیں ہیں۔''

ذرا دیر کی خاموشی کے بعد پھر بولے۔

''کیلاش قبیلہ کی عورتیں کالے لباس اور مخصوص لمبی کوڑیاں لگی ٹوپی پر سُرخ دھاگا سے کشیدہ کاری کر کے پہنتی ہیں۔ لڑکے عموماً کالے رنگ کی شلوار قمیض پہنتے ہیں اور سر پر چترالی ٹوپی میں کسی پرندے کا پر لگا کر ڈانس میں شریک ہوتے ہیں۔ چترالی لوگ ان لڑکیوں کو کالے لباس کی نسبت سے انہیں کالی کافر کے نام سے پہچانتے ہیں۔''

ایک لڑکا اُٹھا اور بولا سر پیاس لگی ہے۔ پانی پینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

''میں آپ لوگوں کی مجبوری سمجھتا ہوں۔ بس ان کے مذہب پر بات کرنے کی اجازت دو، تھوڑی دیر میں بات ختم کر دونگا۔''

انہوں نے پھر بولنا شروع کر دیا۔

''مذہب کے کہ لحاظ سے کیلاش قبیلہ کے لوگ مظاہر فطرت یعنی بادل، آسمانی بجلی و دیگر خیالی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں بھی دیتے ہیں۔ ان میں نکاح یا طلاق نامی کوئی رسم نہیں ہے۔ اِس قبیلہ کے رسم و رواج میں عورت کا مقام مرد سے افضل ہے۔ وہ جس مرد سے چاہے شادی کر سکتی ہے۔ شادی شُدہ عورت ایک خاوند کی موجودگی میں دوسرے شخص سے اپنے تعلقات استوار کر کے پہلے خاوند کو مطلع کر دیتی ہے۔ بس یہی اُن کی طلاق ہے۔ البتہ پہلے خاوند سے حقِ مہر کے طور پر حاصل کردہ اشیاء دُگنی واپس کرنے کی پابند ہے۔ پہلا خاوند حقِ مہر میں اپنے ہمراہ اگر ایک گائے بطور تحفہ لایا تھا، تو لڑکی دوسری شادی کرنے پر دوسرے خاوند سے دو گائے لے کر اسے واپس کرنے کی پابند ہوتی ہے۔''

اتنا لیکچر دینے کے بعد سیکرٹری صاحب نے پوچھا اگر کسی کے ذہن میں کیلاش قبیلہ کے متعلق کوئی سوال ہو تو پوچھے۔

وہی لڑکا جس نے پہلے سوال کرنے کی اجازت چاہی تھی بولا۔

''سر آپ نے کیلاش قبیلہ کی رسومات عقائد مذہب پر گفتگو کی ہے۔ کیا آپکا تعلق کیلاش قبیلہ سے ہے یا آپ ان کے ساتھ کسی نسبت سے وابستہ رہے ہیں۔''

وہ بولے۔

''یہ سوال مجھ پر پہلی دفعہ نہیں ہوا۔ میں ہر ماہ سیاحوں کو یہاں ایک دو بار لاتا ہوں۔ اور مختلف ممالک سے آئے سیاحوں کو ان تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہوں۔ میں تو انہیں پہاڑوں کا باسی ہوں۔ بعض اوقات تو کئی کئی روز تک کاغان، بلتستان اور تبت کے پہاڑوں کی خاک چھانتا ہوں۔ اس کے باوجود بعض سیاح تو مجھ سے زیادہ معلومات رکھے ہوتے ہیں۔ میں ان کی معلومات سے بھی مستفید ہوتا ہوں۔ یہ سب باتیں ذاتی تجربہ اور کتابوں سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی ہیں۔
''

''کوئی اور سوال ہو تو پوچھیں؟''

ایک لڑکا کھڑے ہو کر بولا۔

''اگر میں اپنے ہمراہ دو گائے لے کر جاؤں تو کیا کوئی لڑکی مجھ سے شادی کر لے گی۔''

''مجھے تو علم نہیں۔ کیا معلوم کوئی لڑکی آپ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرے۔ لیکن وہاں جانے سے پہلے آپکو مہترِ چترال سے وادی کیلاش میں جانے کی اجازت لینا ہوگی جو شاید اس مقصد کے لیے نہ دے۔ یونائیٹڈ نیشن نے اس قسم کی شادی پر سخت پابندی لگا رکھی ہے تاکہ اس قبیلہ کی شناخت اور روایات معدوم نہ ہو جائیں۔ حکومتِ پاکستان بھی یہی چاہتی ہے کہ سکندرِ اعظم کی باقیات کو اپنے عقاید اور رسومات کے ساتھ پاکستان میں زندہ رہنا چاہیے۔''

ایک لڑکے نے ہاتھ کھڑا کیا۔ وہ بولا، سر کیا ہم دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی ''کے۔ٹو'' کو یہاں سے دیکھ سکتے ہیں؟

وہ بولے۔

''نہیں۔ یہاں سے وہ نظر نہیں آ سکتی۔ ایک تو وہ یہاں سے بہت دور ہے دوسرے وہ دیگر پہاڑوں کی اوٹ میں آ جاتی ہے۔''

وقت کافی گزر چکا تھا۔ ہمیں بھوک نے ستا رکھا تھا۔ سب نے خاموشی اختیار کی اور سیکریٹری

صاحب نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

اگلے روز موسیٰ کا مصلےٰ نامی چوٹی (Musa Ka Musala) پر جانے کا پروگرام تھا۔ ہم سب وہاں جانے کے لیے تیار ہو کر چل دیئے۔ یوتھ ہوسٹل سے سو گز کے فاصلہ پر ہمیں ایک وادی کے اندر سے ہو کر جانا پڑا سب لڑکے ایک لائن میں جا رہے تھے کہ ایک لڑکے نے ایک پتھر اٹھا کر دور وادی میں پھینکا۔ پتھر نزدیک ہی وادی میں گرا۔ وہاں چند جنگلی مرغ بیٹھے تھے۔ وہ سب پھڑ پھڑا کر اُڑے وادی میں پرندوں کے پھڑ پھڑانے کا ایک شور ہوا۔ اور پھر اس کی گونج سنائی دی۔ جو دیر تک آتی رہی۔

گائیڈ کہنے لگا۔

''یہ سب جنگلی مرغ ہیں جو اکثر راستہ میں مل جاتے ہیں لیکن ان کا شکار کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ زخمی ہو کر اُڑ جائیں تو ان کو پکڑنا مشکل ہے۔ پہاڑوں میں تو ناممکن ہے۔''

ایک مقام پر پہنچ کر گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ شیڈول کے مطابق تو ہمارا پروگرام یہاں تک کا ہے آگے جو جانا چاہے جا سکتا ہے۔ موسےٰ کا مصلےٰ نامی چوٹی وہ سامنے ہے۔ یہ ۴۰۸۰ میٹر بلند، ہمالیہ میں سرن اور کاغان وادی (at the junction of Siran and Kaghan Valleys in Himalaya) کے ملاپ پر واقع ہے۔ یہ راستہ سیدھا وہاں تک جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے، سب کو مغرب سے پیشتر کیمپ میں واپس پہنچ جانا چاہیے اس کے بعد درجہ حرارت گرنا شُروع ہو جاتا ہے جو بارہ درجہ منفی تک گر جاتا ہے۔ جو بھی باہر رہ گیا، وہ منفی درجہ حرارت کا شکار ہو جائیگا۔

ہم دس بارہ لڑکے بغیر گائیڈ کے ہی آگے جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ باقی سب ایک روز پیشتر کے پروگرام کی وجہ سے نڈھال ہو رہے تھے واپس لوٹ گئے۔ ہر طرف بَرف ہی بَرف تھی۔ اتنی بلندی پر چلنا مشکل تھا۔ کسی کو اس بات کا علم ہی نہ تھا کہ اونچائی پر فضا میں آکسیجن کم ہونا شُروع ہو جاتی ہے۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے ہم چند قدم چلنے کے بعد تھکاوٹ کا شکار ہو جاتے۔ تھوڑا استانے اور لمبے لمبے سانس لینے کے بعد آگے بڑھ سکتے۔ ایک جگہ چھوٹا سا میدان مل گیا۔ سب لڑکے آکسیجن کی کمی اور تھکان کو دُور کرنے اور تازہ دم ہونے کے لیے پتھروں پر دائیرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ ایک لڑکے نے کھڑے ہو کر اذان دی۔ برفانی چوٹیوں کی یخ ٹھنڈی ہُوا ہماری رگوں

میں خُون منجمد کر رہی تھی۔ کہ ایک لڑکے کو دور غار کے اندر دو چمکتے نقطے نظر آئے۔ اسے شک ہُوا کہ کوئی خونخوار جانور گھات لگائے بیٹھا ہے۔ چیخ کر بولا۔

''وہ دیکھو ریچھ ہے وہ دیکھو۔''

دوسرا بولا۔

''ریچھ نہیں کوئی اور جانور ہوگا۔''

وہ لڑکا جس نے ریچھ دیکھا تھا اب خوف کے مارے کانپ رہا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں پتھر اُٹھا لیے۔ دوسرا بولا۔

''جنگلی ریچھ تو پتھروں سے کیا بندوق سے بھی نہیں ڈرتے۔''

ایک اور آواز آئی۔

''اگر کوئی آدم خور شیر ہوا تو اس کے تو مزے ہو جائیں گے کسی ایک کو پکڑ کر دو روز تک ناشتہ کرے گا۔''

اب تمام لڑکے خوف زدہ تھے۔ وہ سردی سے کم اور ریچھ یا شیر کی موجودگی کے خوف سے زیادہ کانپ رہے تھے۔ ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ گہرے بادلوں نے چوٹی پر سایہ کر دیا۔ اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہم سبھی پریشان ہو گئے کہ اگر بارش شروع ہوگئی تو سب ہی نمونیہ کا شکار ہو جائینگے۔ کسی نے بھی کوئی گرم کپڑا نہ پہن رکھا تھا۔ لیکن جلد بادل آگے دوڑ گئے اور سورج پھر چوٹی پر چمکنے لگا۔ ایک لڑکا بولا۔

''ریچھ یا شیر کے آنے کا انتظار نہ کرو، دور ہے یا نزدیک واپس بھاگو۔''

ہمیں تو لگتا تھا کہ موسیٰ کا مصلیٰ چوٹی تو سامنے تھوڑا سا ہی اُوپر ہے۔ ہمیں تو منزلِ مقصود اوپر سامنے نظر آ رہی تھی۔ لیکن مجبوراً سب نے پتھر زمین پر پھینکے۔ آگے بڑھنے کی بجائے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ہم نے چھوٹی رکاوٹوں کو پھلانگ کر عبور کرنا شروع کر دیا۔ اَب آکسیجن کی کمی کا مسئلہ نہ رہا تھا ہر لحہ فضا میں آکسیجن کی مقدار بڑھنے لگی تھی ہم صرف ممکنہ برف باری سے ڈر رہے تھے۔ چند ایک نے صرف سویٹر پہن رکھی تھی۔ خوش قسمتی سے بَرف باری نہ ہوئی۔

دوپہر کا کھانا تقسیم ہو رہا تھا کہ ہم کیمپ پہنچ گئے۔ رات کو ایک کیمپ فائر کا انتظام تھا۔ لکڑیاں جلانے میں ہم نے ان کی مدد کی۔ رات کیمپ فائر میں گائیڈ سیکرٹری یوتھ ہوسٹل کو میدان

میں پکڑ لایا۔ انہوں نے اپنی وائلن منگوائی اور ایک گانے کی دھن بجائی۔ لڑکوں نے ایک اور کی فرمائش کی، فرمانے لگے، ایک غزل پیش کرتا ہوں۔ ارشاد ارشاد اور زور زور سے تالیاں بجائیں گئیں۔

لڑکوں نے شور کیا ایک غزل اور سیکریٹری صاحب نے ہنستے ہوئے کہا ایک اور سنا دوں یہ ریاض چشتی صاحب کی ہے۔ یہی مجھے اچھی لگی یاد کر لی اور آپکو سنا دی۔ البتہ ایک پنجابی گانا کی دھن سماعت فرمائیں۔ انہوں نے ایک پنجابی گانا۔

''آ ویں وے کبوترا جاویں وے کبوترا''

وائلن کی دھن پر سنایا۔ لڑکے ایک اور گانے کی فرمائش کرنے لگے۔ سیکریٹری صاحب بولے مجھے اور کوئی گانا نہیں آتا۔ البتہ کسی کے ذہن میں اس وادی یا ان پہاڑوں کے متعلق کوئی سوال ہو تو پوچھے۔ ایک لڑکا کھڑا ہو گیا اور بولا سر میں نے ایک ناول میں پڑھا تھا۔ کہ کوہ ہمالیہ میں انسانی شکل کا جانور پایا جاتا ہے۔ اُس کے جسم پر لمبے گھنے بال ہوتے ہیں۔ اور وہ بہت تیز دوڑتا ہے۔ گائے اس کی مرغوب غذا ہے۔ کیا آپ نے اُسے ان پہاڑوں میں کہیں دیکھا ہے۔ سیکریٹری صاحب بولے۔

''برفانی انسان کی موجودگی کی کہانیاں افسانوی اور دیو مالائی ہیں۔ میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا ویسے تبت کے لوگ ایسے انسان کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں وہاں کی بہت سی عبادت گاہوں میں اس انسان کی موجودگی اور دیکھے جانے کی کہانیاں مشہور ہیں۔ لیکن کسی راہب یا کسی شخص نے ایسے جانور کے دیکھنے کا اعتراف نہیں کیا۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ انسان شکل وصورت میں تو انسان کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اُس کا تمام جسم ریچھ کی طرح لمبے بالوں سے بھرا ہے یہاں تک کہ پیشانی اور چہرہ پر بھی بال ہیں ان کا کہنا ہے کہ اِس انسان کے دونوں پاؤں الٹے ہیں، دونوں پاؤں کے انگوٹھے باہر کی جانب اور چھوٹی انگشت اندر کی جانب ہوتی ہے۔ اسی طرح اس کے ہاتھوں کے انگوٹھے اور انگلیاں بھی الٹی ہیں۔ یاک کا گوشت بڑے مزے لے کر کھاتا ہے یاک اُس کی بُو کو دور سے سونگھ لیتا ہے۔ اس کی بُو پا کر یاک چلانا شروع کر دیتا ہے۔ اور اُلٹے پاؤں محفوظ مقام کی جانب بھاگتا ہے۔ بعض عبادت گاہوں میں اس برفانی انسان کی پیشانی کی ہڈیاں بطور تبرک رکھی ہیں۔ تبّتی لوگ اپنے یاک کو اس برفانی انسان سے محفوظ رکھنے کے لیے معبد گاہ میں لے جا کر اس ہڈی کو یاک کی

پیٹھ پر تین مرتبہ پھیرتے ہیں۔ تبّتی لوگوں کا ایمان ہے کہ اس عمل سے اُن کا یاک برفانی انسان کے حملہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔''

اسی لڑکے نے پھر سوال کیا۔

''سر آپ نے کہیں اُس کے پاؤں کا نشان دیکھا۔''

''نہیں مجھ کو اُس کے کسی پاؤں کا نشان کہیں نظر نہیں آیا''

اُنہوں نے مزید کہا کہ میں نے بھی تبت کے بہت سے لوگوں سے اس برفانی انسان کی موجودگی کے متعلق استفسار کیا۔ لیکن کسی نے بھی خود یا کسی اور کی جانب سے دیکھے جانے کی تصدیق نہ کی۔ البتہ تبت کی چند عبادت گاہوں کے راہب اسے بھاگتے دیکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے مزید بتایا کہ ایک دفعہ وہ یاک پر بیٹھے کہیں جا رہے تھے کہ ان کے یاک نے یک لخت اپنے کان کھڑے کیئے چاروں جانب سونگھا اور مجھے زمین پر پٹخ کر سرپٹ دوڑ کر گھر پہنچ گیا۔ میرے رہبر نے کہا کہ اس کے یاک نے یقیناً برفانی انسان کی بو سونگھ لی ہے۔ وہ اس سے ڈر کر بھاگ گیا ہے۔ چند تبّتی لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ یہ ایک دیو مالائی کردار ہے۔ اگر برفانی انسان ایک حقیقت ہوتا تو کبھی کسی کو اُس کی لاش ہی ملتی یا اُسے کسی نے دور سے دیکھا ہوتا۔ یہ ایک دیو مالائی کہانی ہے جسے سادہ لوح لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سیکرٹری صاحب نے کہا کوئی اور سوال ان پہاڑوں کے متعلق؟ سب خاموش رہے۔ سیکریٹری صاحب نے اعلان فرمایا کہ کل آپ آرام کریں۔ پرسوں صبح ہم ناشتے کے بعد واپس لاہور جائیں گے۔

دوسری صبح سب ہی جاگ رہے تھے۔ ایک لڑکا بولا میرے پاس فٹ بال ہے چلو فٹ بال کھیلتے ہیں۔ اس نے فٹ بال کو دو بار فرش پر پٹخا اور بال لیکر باہر آ گیا۔ فزیکل کالج کے لڑکے تمام ہی سپورٹس مین تھے۔ ایک لڑکے نے ایک ہلکی کک لگا کر بال کو اچھالا اور پکڑ لی۔ بال کو اچھالنا لڑکوں کو کھیلنے کی ایک ترغیب ثابت ہوئی۔ پہلے دو لڑکوں نے ایک دوسرے کو پاس کیا۔ ان دو میں چند اور شامل ہو گئے۔ اسی طرح دائرہ بڑا ہوتا گیا۔ ابتدا میں سب بڑی احتیاط سے بال کو ایک دوسرے کی جانب لڑھکا رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اپنی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بال کو اونچا کک کیا بال واپس اُس کے پاس آ کر گرا۔ اس نے بال کو قابو کرنے کے بعد دوسرے کی جانب کک کر دیا۔ بس اب کیا تھا ہر لڑکا اپنی مہارت دکھا رہا تھا۔ ایک لڑکے سے بال کو غلط کک

لگ گئی۔ بال دور جا کر ایک جھاڑی میں پھنس گیا۔ بال کا مالک دوڑ کر گیا اور بال کو لے آیا۔ اب طے پایا کہ جو بال کو غلط کک لگائے وہی لیکر آئے گا۔ دو چار دفعہ چند لڑکوں نے کک لگائی اور مجبوراً دوڑ کر بال کو لے آئے۔ غیر ہموار ڈھلوان سب کو تنگ کر رہی تھی۔ دوڑ دوڑ کے سب ہی تنگ آ گئے۔ ایک منچلا بولا آؤ یوتھ ہاسٹل کے پیچھے پہاڑ پر چلتے ہیں۔ میں کل وہاں گیا تھا پہاڑ کافی ہموار ہے۔ وہاں پر باقائدہ گیم کھیلتے ہیں۔

آٹھ دس لڑکے جو موسیٰ کے مصلے کی پہاڑی تک گئے تھے وہاں جانے پر تیار ہو گئے اور وہ لڑکا جس نے آذان دی تھی، پہاڑ پر جانے کا سب سے زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ اس پہاڑ پر جانے کا راستہ ایک دودھیائی لکیر کی صورت سامنے تھا۔ ہم سب اسی لکیر پر چل دئے یہ لکیر ہموار جگہ سے گزر کر ڈھلوان میں پہاڑ کے دوسری جانب شڑاں گاؤں کو جاتی۔ یہاں دو پہاڑ آمنے سامنے ایک دوسرے کے نزدیک تھے۔ ان پہاڑوں کے درمیانی دراڑ سے پانی نکل کر دس فٹ چوڑی ندی کی صورت بہہ رہا تھا۔

ایک جگہ دراڑ کے آر پار ایک شہتیر پل کی صورت رکھا تھا۔ جس کی چوڑائی کم اور لمبائی زیادہ تھی کوئی لڑکا پار جانے کو تیار نہ ہوا۔ ایک لڑکا بولا ڈرتے کیوں ہو کالج میں داخلہ کے وقت کیا آپ نے چار انچ چوڑے اور بارہ فٹ لمبے بیم کو پار نہ کیا تھا؟ یہ بیم تو بہت چوڑا ہے۔ اور اس کی لمبائی بھی کم ہے بس دو قدم بڑھاؤ اور پار کر جاو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے شہتیر پر نگاہ رکھے دو قدم بڑھائے اور دراڑ کے پار چلا گیا۔ اس کے بعد اس کی تقلید میں دو مزید لڑکے آگے بڑھ گئے۔ وہ لڑکا جس نے موسیٰ کے مصلے کی پہاڑ کے دامن میں اذان دی تھی بڑے اعتماد سے آگے بڑھا اور پار جانے کی بجائے درمیان میں رُک گیا اور پیچھے آنے والے لڑکوں سے مخاطب ہوا۔

''میں تو ریل کی پٹڑی پر دور تک جا سکتا ہوں یہ شہتیر تو بڑا چوڑا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر نیچے پانی کی جانب دیکھا، ایک لمبی اوہ کہنے کے بعد بولا۔

''یارو بڑی گہری ہے۔''

اُس کی آواز میں خوف نمایاں تھا۔ اس نے واپس سیدھا اُٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ توازن حاصل کرنے کے لیئے دونوں بازو ہوا میں گھمائے۔ واپس اُٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ نیچے پانی میں گر گیا۔ ایک لمبی چیخ اور دھڑام کی آواز آئی اور وہ پانی میں غائب ہو گیا۔ ایک ساتھی

نے اُسے نام سے پکارا۔

''سکندر، سکندر کہاں ہو''

وہ تو غائب ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پانی کی سطح پر واپس آیا۔ اُس نے سر کو جھٹکا دیا اور ایک ہاتھ کو اُوپر اُٹھا کر گھُمایا جیسے وہ کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی پانی کی تہہ میں چلا گیا۔ سب لڑکوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

''پانی میں گر گیا۔ ایک لڑکا پانی میں گر گیا۔ او مر گیا۔''

کیمپ نزدیک ہونے کی بناء پر آواز وہاں تک پہنچ گئی لیکن کسی کو سمجھ نہ آیا کہ کیا ہوا ہے۔ ندی کے اِس جانب کھڑے لڑکوں نے کیمپ کی جانب دوڑ لگا دی وہ سب شور کر رہے تھے۔

''ڈوب گیا وہ ندی میں گر گیا بچاؤ بچاؤ۔''

لیکن اس افراتفری اور اُلجھن میں بہت دیر ہو گئی۔ اور اُسے کوئی نہ بچا پایا۔

دوسرے روز ہم نے کاغان سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ واپسی پر سبھی افسردہ تھے نہ وہ ہنگامہ تھا نہ وہ گانے اور نہ ہی وہ لڑکوں کا لطیفے سُنانا تھا۔ آتے ہوئے چند لڑکوں نے ریل گاڑی کے اندر ایک بالٹی میں پانی بھر کر ہر ریلوے پھاٹک پر کھڑے لوگوں پر پانی پھینک کر نعرے لگاتے تھے۔ اب تمام لڑکے پریشانی میں خاموشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

بن بلایا مہمان۔ ایک محفل

کاغان سے واپس آنے کے بعد فزیکل کالج میں باقی کے چھ ماہ کا عرصہ کھیل کود میں گزرا۔ روزانہ صبح چھ بجے جمناسٹک کی ایک گھنٹہ ٹریننگ ہوتی۔ اس کے بعد آٹھ بجے کلاسیں شروع ہو جاتیں۔ چار گھنٹے کی پڑھائی کے بعد کھانے کا وقفہ ہوتا چار بجے پھر گیمز کے لیئے بلا لیتے۔ ہمیں ایک ماہ کی مختصر ٹریننگ کے بعد شہر کے کالجز میں پریکٹکل کے لیئے بھیج دیا گیا واپس آئے تو ایک ماہ کی مزید ٹریننگ کے بعد دسمبر کی تعطیلات کے لیئے کالج بند کر دیا گیا۔ واپس آئے تو پھر دوبارہ چھ ہفتہ کی ٹریننگ کے بعد پریکٹیکل ٹریننگ کے لیئے دو ہفتہ کے لیئے کالجز میں بھیج دیا گیا۔ واپس آئے تو مزید چار ہفتہ کی کلاس ورک کے بعد امتحانات کی تیاری کے لیئے پندرہ دن کی تعطیلات دی گئیں۔ ان تعطیلات کے دوران میں اپنی ہمشیرہ سے ملنے لائیل پور، موجودہ فیصل آباد، چلا گیا۔

چندروز وہیں گزارے۔ ایک روز اپنے بہنوئی کے پرانے مکان میں اپنے پرانے جاننے والوں سے ملنے پیپلز کالونی چلا گیا۔وہاں ایک جاننے والے دوست اکرم خان نیازی سے ملاقات ہوگئی۔وہ لمبے چوڑے قد اور خوب صورت شخصیت کا مالک تھا۔فیصل آباد کی کسی مل میں منیجر تھا،اور کسی کمشنر کا چھوٹا بھائی تھا۔اس کے ساتھ کافی دیر تک گپ لگائی۔دوران گفتگو نیازی صاحب نے سوال کیا۔

''آج کل کیا کرتے ہو اور کہاں ہوتے ہو، بڑے عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔''

میں نے اسے بتایا۔

''کہ میں فزیکل کالج والٹن میں ٹریننگ حاصل کررہا ہوں۔''

کہنے لگے کہ اس ماہ کی فلاں تاریخ کو ماڈل ٹاؤن لاہور میں ایک دوست کی ہمشیرہ کی شادی کے سلسلے میں جاؤں گا۔والٹن ریلوے سٹیشن ماڈل ٹاون کے سامنے پیدل کا راستہ ہے، وقت ملے تو آ جانا محفل جمے گی گپ لگائیں گے۔نواب اکبرعلی خان صاحب کے گھر کا دریافت کر لینا میں وہیں ہونگا۔میں نے آنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کر لیا۔اگلے روز میں واپس لاہور ہاسٹل آ گیا۔البتہ یاد تھا کہ فلاں تاریخ بروز ہفتہ شادی میں نیازی صاحب بھی آ رہے ہیں۔اس دن میں دوپہر کو لاہور مال روڈ پر اپنی ایک کزن کے گھر چلا گیا۔اس کے پاس ہلمین گاڑی تھی۔میں نے کزن سے چند گھنٹوں کے لیئے گاڑی مانگ لی۔اس نے ڈرائیور کو بلا کر کہا۔

''تم ان کے ساتھ چلے جاؤ انہیں جہاں جانا ہے چھوڑ آؤ''

میں ڈرائیور کو ساتھ لیے ماڈل ٹاؤن چلا گیا۔

ایک گھر رنگ برنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے سجا تھا۔آدھی گلی میں ٹینٹ لگے تھے۔گھر کے سامنے ایک بینڈ شہنائی کی سریلی میٹھی دھنیں فضا میں بکھیر رہا تھا۔خیموں میں مہمانوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔گھر کے باہر دور تک گلی میں ایک بھیڑ لگی تھی۔بہت سے لڑکے ہاتھوں میں طشتریاں اُٹھائے آ جا رہے تھے۔بارات میرے پہنچنے سے بہت پہلے کی پہنچ چکی تھی۔مولوی صاحب نے نکاح بھی پڑھا دیا تھا۔اب بارات کھانا کھا رہی تھی۔مہمانوں کو خوش آمدید کہنے والے ابھی گلی میں ہی کھڑے تھے، کہ میری گاڑی گیٹ کے سامنے رکی۔استقبالیہ کے ایک صاحب میری گاڑی کی جانب بڑھے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ایک اور صاحب نے میرے گلے میں

ہار پہنایا اور مسکراتے چہرے سے ہاتھ ملا کر خوش آمدید کہا۔خیمہ میں جانے کا اشارہ کیا میں وہیں رک گیا اور اس سے سوال کیا۔

''اکرم خان نیازی اگر ہیں تو پہلے مجھے ان سے ملا دیں۔''

ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی کھڑے باراتیوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔انہوں نے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے کہ حضور اندر تشریف لائیں، نیازی صاحب آگے دروازہ پر کھڑے ہیں۔میں اس دروازہ کی جانب بڑھ گیا۔وہاں پہنچا تو دیکھا کہ نیازی کی بجائے کوئی اور صاحب کھڑے تھے۔انہوں نے بھی ہاتھ ملایا اور ٹینٹ میں جانے کا اشارہ کیا میں نے اس سے بھی یہی سوال دہرایا

''اکرم خان نیازی سنا ہے کہ ادھر ہیں مجھے ان سے بھی ملنا ہے۔''

وہ بولا۔

''ابھی آتے ہیں آپ ٹیبل پر چلیں اور کھانا شروع کریں''۔

میں بہت پریشان ہوا۔

''مان نہ مان میں تیرا مہمان۔''

ایک صاحب چاول کی ایک ڈش لے کر میرے سامنے آئے اور میز پر رکھی پلیٹوں کی جانب اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

''چاول لیں۔''

وہ سب مجھے لیٹ باراتی سمجھے رہے تھے۔بارات کی ایک گاڑی کو لیٹ آنا تھا۔دیر سے آنے والی گاڑی کا انجن راستہ میں گرم ہو گیا تھا۔وہ گاڑی انجن کے ٹھنڈے ہونے کے لیے رک گئی تھی۔سب میزبان مجھے وہ باراتی سمجھ رہے تھے، جو نیازی صاحب کو بھی جانتا ہے۔میرے لیے کھانا مشکل ہو گیا۔پریشانی کے عالم میں نوالہ حلق میں اٹک رہا تھا۔نیازی مجھے کہیں نظر نہ آ رہا تھا۔میں نے ایک بار پھر خدمت پر معمور ایک صاحب سے دریافت کیا۔

''نیازی صاحب ہیں بھی کہ نہیں؟''

جواب میں وہ بولا۔

''آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں۔جہاں کہیں بھی ہوئے آ جائیں گے یا بلوا دیں گے۔''

اس جواب سے کچھ مطمئن ہوا کہ کوئی نیازی نامی لڑکا ادھر ہے۔ خیال آیا کہ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کرسکتا۔ جو ہوا دیکھا جائیگا اور کھانا شروع کر دیا، کھانا سکون سے کھایا۔

ابھی ٹیبل پر کھڑے آخری نوالہ منہ میں ہی تھا کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا شاید بن بلایا مہمان پکڑا گیا ہے۔ اس شخص کو کیا جواب دونگا بےعزتی کے علاوہ شاید پٹائی بھی ہو جائے، اور شرمندگی علاوہ ہوگی۔ کہ کندھے پہ ہاتھ رکھے وہ شخص بولا۔

''نیازی صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔''

دور سے آواز آئی۔

''فاروق میں ادھر ہوں۔''

آواز شناسا سی لگی، میں نے مڑ کر دیکھا وہاں پر میزوں کے گرد بہت سے باراتی کھڑے تھے۔ نیازی کہیں نظر نہ آیا۔ وہی آواز پھر آئی۔ اتنے میں کسی نے میرے کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا وہ اکرم خان نیازی تھا مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ باہر لڑکوں نے اسے بتا دیا تھا کہ باراتیوں میں سے کوئی صاحب تمہارا نام بار بار لے رہا ہے۔ کھانا تو میں کھا چکا تھا۔ وہ مجھے پکڑے باہر لے آیا، وہ اپنے ہر جاننے والے سے میرا تعارف پورے نام سے کروا رہا تھا۔

''میرے بہترین دوست شیخ غلام فاروق صاحب بارات کی جانب سے آئے ہیں۔ کیا حسن اتفاق ہے۔''

مجھ سے مخاطب ہوا۔

''آپ نے مجھے بتایا ہی نہیں کہ آج آپ بھی آ رہے۔''

نیازی اپنی دعوت فراموش کر چکا تھا۔ مجھے سمجھ نہ آ رہا تھا، کہ میں اسے کیسے بتاوں کہ میں تو تمہاری دعوت پر آیا ہوں باراتی نہیں ہوں۔ نواب صاحب سے تعارف کروانے ان کے پاس لے گیا۔ بولا۔

''آپ ہیں شیخ غلام فاروق صاحب یہاں ایک کالج میں پڑھتے ہیں۔ میرے بہترین دوست ہیں کیا حسن اتفاق ہے بارات کی جانب سے آئے ہیں''

میزبان یہ تو جانتے تھے کہ میں ایک ہل مین گاڑی میں اکیلا آیا تھا۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ میں

دولہا کا دوست کسی امیر کا بیٹا ہوں جس کے پاس اپنی گاڑی اور ڈرائیور ہے۔ اب وہ بھی مجھے بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اکرم خان نیازی مجھے مزید عزت بخشنے کے لیے مجھے پورے نام سے پکار رہے تھے۔ مجھے پکڑے پکڑے مین صوفہ پر لے آئے جہاں پر دولہا کے عزیز واکارب بیٹھے تھے۔ میں نے اب مناسب نہ جانا کہ نیازی صاحب کی تصحیح کروں۔ نیازی صاحب سے کہا۔

''اچھا کھانا تو میں نے کھالیا ہے، اب چلتا ہوں''۔

بہت سے باراتی کھانے کے بعد جا رہے تھے۔

''یار مزید رُک جاو، ایک گانے والی کو نواب زادہ صاحب نے مدعو کیا ہے۔ آج پوری رات کا پروگرام ہے۔ گاڑی اسے لینے گئی ہوئی ہے چلو پنڈال میں چلتے ہیں۔''

خیموں سے ہم دونوں اٹھ کر پنڈال میں آئے اور ایک جانب بیٹھ گئے۔ ایک طرف نرم گداز قالینوں سے سٹیج بنی تھی۔ جس کی ایک جانب چند سدا بہار پتوں والے گملے رکھے تھے۔ دوسری جانب نائیکہ کے ساتھ سازندے اپنا ساز لیے بیٹھے تھے۔ سازندوں نے وارم اپ کے لیے اپنی انگلیوں کو سازوں پر پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ طرح طرح کی میٹھی اور سریلی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ طبلہ نواز نے بھی طبلہ پر انگلیاں پھیر کر زور کی ایک تھاپ لگائی ہارمونیم نواز کیسے پیچھے رہ سکتا تھا اس نے بھی ہارمونیم کی ٹیسٹنگ شروع کر دی ''اہل چمن'' اتنا کہا، اور پھر خاموش ہو گئے۔ انہوں نے مجمع میں ہل چل محسوس کر لی تھی۔ نواب زادہ صاحب دس پندرہ ساتھیوں کے ہمراہ ایک جانب سے نمودار ہوئے۔ نواب صاحب کے ہمراہ ان کی دس بارہ سال کی بیٹی بھی تھی۔ اس کی ماں کو نواب صاحب نے چند سال پیشتر طلاق دے دی تھی۔ لڑکی قمیص پتلون پہنے نواب صاحب کے بازو سے چپکے ان کے ساتھ باتیں کرتی چل رہی تھی۔ نواب زادہ صاحب کی آمد پر نائیکہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔ اس نے جھک کر نواب زادہ صاحب کو فرشی سلام کیا۔

''شمیم کیسی ہو''

بدرنگے سیاہ وسفید دانت نکالتے ہوئے بولی۔

''آپکی دعا سے ٹھیک ہوں''

''معاف کرنا، آپ لوگوں کو انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی۔''

''نہیں جی ہم تو تھوڑی دیر پہلے آئے ہیں''۔

''باراتی کہاں ہیں انہیں بھی دعوت دو۔''

نواب صاحب نے عقب میں کھڑے ایک ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''یہ محفل تو انکے اعزاز میں منعقد کی گئی ہے۔''

باراتی ساتھ والے ٹینٹ میں دعوت کے منتظر بیٹھے تھے۔ دعوت ملتے ہی وہ سب فوراً اٹھ کر آ گئے اور سبھی ایک جانب بیٹھ گئے۔ شمیم نے اپنی چھوٹی بہن کو آواز دی

''اختری اگر تیار ہو گئی ہو تو آ جاؤ۔''

اختری پاوں میں گھنگرو باندھے چھن چھن کرتی کمرہ سے نمودار ہوئی۔ اس نے بھڑکیلے سرخ رنگ کی چولی، اسی رنگ کی گھگری اور گہرے رنگ کی میک اپ کر رکھی تھی۔ اس نے پنڈال میں جانے سے پہلے بڑی بہن کے پاوں چھوئے۔ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیئے ایک چھوٹی سی چھلانگ کے ساتھ پاوں میں بندھے گھنگرو بجانا شروع کر دیئے کبھی کبھی وہ کھڑے ہو کر ترتیب اور ترنم کے ساتھ ایڑی سے گھنگھرو بجاتی۔ اسی طرح گھنگرو بجاتے چھوٹے چھوٹے قدموں سے پورے پنڈال کا ایک چکر لگایا۔ نواب زادہ صاحب کے سامنے جا کر رک گئی۔ اس نے جھک کر نواب صاحب کو فرشی سلام کیا۔ نواب زادہ صاحب نے جواب میں اپنا دایاں ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ نواب صاحب تازہ پھولوں کی ایک ''وینی'' ساتھ لائے تھے وہ اسے پیش کی۔ اختری نے جھک کر وصول کی اور احتیاط کے ساتھ بالوں کا جوڑا بنا کے اس میں لگایا اور نواب صاحب کو ایک بار پھر جھک کر سلام کیا۔ جواب میں نواب صاحب مسکرا دیئے۔ دور بیٹھی شمیم بولی۔

''حضور والا کون سے گانے سے ابتدا کی جائے ارشاد۔۔۔ہو''

''اپنی فلم سے ہی بسم اللہ کرو۔''

نواب زادہ صاحب نے حال ہی میں دو گانے اختری سے اپنی فلم 'ساون آیا رے'' کے لیے ریکارڈ کروائے تھے۔ اختری نے ان کے سامنے تین بول گائے تھے۔ گھنگروں سازوں اور واہ واہ کا شور اُٹھا۔ نواب زادہ صاحب نے اپنا بٹوا نکال کر سامنے رکھ لیا تھا۔ اس میں ایک روپیہ مالیت کے بہت سے نوٹ رکھے تھے۔ ہر بول پر اسے روپے دیتے رہے۔ ایک بار نواب زادہ صاحب نے اپنے ساتھ بیٹھے ایک ساتھی کے سر پر ایک روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ گائیکہ نے ڈانس کرتے ہوئے اس کے سامنے جا کر ایک بول گایا اور نوٹ اُٹھا لیا۔

وہ دائیں ہاتھ سے نوٹ پکڑتی اور بائیں میں دبوچ لیتی۔ ڈانسر نے دائرے میں گھنگروں بجاتے ہوئے چکر لگایا۔ وہ کنکھیوں سے دائرہ میں بیٹھے باراتیوں کے ہاتھوں کی حرکات کی جانب غور سے دیکھ رہی تھی۔ کہ کسی شوقین نے اس کی کسی ادا پر نوٹ دینا ہوا اور وہ دیر نہ کرے۔ پہلا گانا ختم کرنے پر گھنگرو بجاتے ہارمونیم کے پاس رک گئی۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے نوٹ اس نے ہارمونیم نواز کو پکڑائے۔ نواب صاحب نے اسے اپنی اس فلم کے دوسرے گانے کی فرمائش کی۔ طبلہ نواز نے نئے گانے کا انترہ بجایا۔ نواب زادہ صاحب کے چند ساتھیوں نے بھی اپنے بٹوے نکالے اور نوٹ دینا شروع کر دیئے گھنگروں کی جھنکار بتا رہی تھی کہ ڈانس کی گت کافی تیز ہے۔ وہ بڑی مہارت کے ساتھ ایک ہاتھ سے پیسے اٹھاتی، ڈانس کرتے ہوئے کھڑے کھڑے تیز تیز دو چکر لگائے۔ وہ پاوں سے چھن چھن کرتی ایک گھومتی گڑیا لگا رہی تھی۔

تیز گھومتے اس کی گھگری اوپر اٹھی اور ہاتھ بدلتے ہوئے ایک نوٹ اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ دولہا کے چھوٹے بھائی نے ایک روپیہ کا نوٹ ساتھی کے سر پر رکھا ڈانسر وہاں آئی اور اس کے سر سے روپیہ اٹھا لیا۔ دُولہا کے بھائی نے نواب صاحب کی پیروی میں، ایک نوٹ کے بعد دوسرا، دوسرے کے بعد تیسرا دینا شروع کر دیا۔ پہلے اس نے دولہا کے سر پر ایک نوٹ رکھا۔ پھر اس نے ساتھیوں کے سر پر نوٹ رکھنے شروع کیے۔ محفل جلد اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ نواب صاحب پہلے ہی جوش میں تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر بٹوا ہاتھ میں لیا اور پنڈال میں بیٹھے سب دوستوں کے سر پر روپیہ روپیہ رکھ دیا۔ وہی لڑکی جو دولہا کے بھائی کے سامنے دیر سے کھڑی گانا سنا رہی تھی ڈانس کرتے نواب زادہ صاحب کی جانب بڑھنے کے لیئے مڑی۔ دولہا کا دوسرا بھائی دیر سے چوکڑی مارے بیٹھا تھا، نے پتلون کی پاکٹ سے بٹوا نکالنے کے لیے اپنا پاؤں سیدھا کیا۔ اس سے پیشتر کہ وہ بٹوا نکال کر گائیکہ کو نوٹ دے۔ اس کے بڑھتے پاوں سے لڑکی کو گھومتے ہوئے ٹھوکر لگی اور وہ دھڑام سے زمین پر گری۔

''یا الٰہی خیر''

ہارمونیم نواز کے منہ سے یک لخت نکلا۔

شمیم، ہارمونیم نواز اور سازندے جلدی سے سہارا دینے کے لیے اٹھے۔ اس سے پیشتر کہ کوئی اس کی مدد کو آئے۔ ڈانسر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''اللہ نے بچالیا۔کوئی چوٹ تو نہیں لگی۔''

شمیم نے اس سے دریافت کیا۔

''نہیں باجی''

ڈانسر اختری نے مختصر جواب دیا۔

شمیم نے اس کے ہاتھوں کی ہلکی مالش کی،دونوں پاؤں کو چھوا،ٹخنوں کو دبایا۔دوبارہ مخاطب ہوئی۔

''کہیں درد تو نہیں۔''

''نہیں باجی''

شمیم نواب صاحب سے مخاطب ہوئی۔

''حضور والا آپکی باندی محفل ختم کرنے کی اجازت چاہتی ہے۔''

''پہلے بتاؤ اختری کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی۔''

''آپ کی دعا سے بچ گئی ہے،کسی قسم کی کوئی خراش نہیں۔اس کے باوجود آپکی باندی محفل برخواست کرنے کی اجازت چاہتی ہے۔''

''نہیں۔لڑکے نے جان بوجھ کر نہیں گرایا۔یہ حادثہ تھا۔''

نواب زادہ صاحب نے باراتی کی صفائی میں کہا۔

گانا ختم کرنے کی بجائے۔ڈانسر لڑکی وہیں بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

''باجی۔موڈ نہیں رہا''

شمیم بولی۔

''حضور والا۔اس باراتی کے اس غیر ارادی عمل کو غائبانہ انتباہ جانیے۔اختری اب ڈر رہی ہے، پاؤں ہی تو ہماری روزی ہیں۔''

نائیکہ مزید بولی۔

''حضور والا محفل زیادہ بوجھل ہوگئی ہے۔کوئی معذرت کرلے یہ محفل زیادہ پُر رونق ہو جائیگی۔''

نواب صاحب کے ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی،مگر یہ شرط سنتے ہی تمام باراتی محفل سے اٹھ کر چلے گئے۔نائیکہ کی اشارتاً عائد کردہ شرط تو پوری ہو چکی تھی۔نیازی نے میرے کان میں کہا۔

''تم بیٹھے رہو جانا نہیں۔''

نواب زادہ صاحب اوران کے ساتھی جان گئے کہ یہ ایک باراتی نیازی کا دوست ہے اس لیئے نہیں گیا۔محفل دوبارہ شروع ہوگئی۔نواب صاحب نے دوسرے گانے کی فرمائش کی ڈانسر اٹھی دوبارہ گانا شروع کرنے سے پہلے دیر تک گھنگرو بجاتی رہی۔گانا شروع کیا تو نواب زادہ صاحب نے مزید پیسے بھی منگوا لئے۔نواب زادہ صاحب کے ساتھیوں نے بھی بڑی فراخدلی سے پیسے دینے شروع کردیے۔محفل کو گرمانے کے لیے نواب صاحب کھڑے ہوگئے اور انہوں نے ایک ایک روپے کا نوٹ تمام حاضرین کے سر پر رکھا۔ڈانسر پیسے اٹھاتی اور چلتی گئی۔نواب زادہ صاحب نے ایک روپیہ میری جھولی میں ڈال دیا اور ڈانسر سے مخاطب ہو کر کہا،میرا بھائی ہے۔اختری میرے سامنے کھڑی گانا گاتی رہی اور میرے ہاتھوں کی جانب دیکھتی رہی،لڑکی بولی۔

''گانا ختم ہوا،حضور عطا ہو۔''

ساتھ بیٹھے نیازی نے میرے کان میں کہا۔

''جب تک آپ نوٹ جھولی سے اُٹھا کر خود نہ دیں گے وہ نہیں اٹھائے گی۔وہ نوٹ سر سے یا ہاتھوں میں سے پکڑتی ہے،زمین یا جھولی سے نہیں اٹھائے گی۔''

مجھے اس اصول کا علم نہ تھا۔اس قسم کی محفل میں پہلی بار شریک ہوا تھا۔میں نے جھولی میں رکھا نوٹ دو انگلیوں میں پکڑ کر اسکے سامنے کیا،ڈانسر نے فوراً اُچک لیا اور آگے بڑھ گئی۔نواب زادہ صاحب نے اب دوسری جانب نوٹ رکھے۔آخری نوٹ نیازی صاحب کی رخسار پر رکھ کر کھڑے ہوگے۔ باقی نوٹ اٹھانے کے بعد لڑکی نے نیازی صاحب کے رخسار کی زور سے چٹکی لی اور نوٹ اُٹھا کر چلی گئی۔نواب صاحب اب پیسے بڑی فراخ دلی سے دے رہے تھے۔لیکن محفل میں وہ گرمی نہ تھی جو باراتیوں کی موجودگی میں تھی۔

پنڈال بہت بڑا تھا،لڑکی کی ضد پر سب باراتی اُٹھ کر چلے گئے تھے۔اس بات کا احساس اختری کو بھی ہوگیا تھا۔اس نے گھومتے ہوئے ایک نوٹ میری جھولی میں پھینک دیا۔پھر آنکھ کے اشارے سے نوٹ کی جانب میری توجہ دلائی،مجھے آنکھ ماری،اور ساتھ ہی چٹکی بجائی،جیسے وہ چینج مانگنے کا کہہ رہی ہو۔میں بات کو سمجھ گیا روپیہ اُٹھا کر جیب میں ڈالا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور اپنی دونوں انگلیوں کے درمیان نوٹ کو لہرایا۔میرے ساتھ بیٹھا نیازی بھی اس فراخ دلی کو دیکھ رہا تھا،میرے نوٹ لہرانے پر وہ بول اُٹھا۔

''یار یہ کیا کر رہے ہو۔اتنی بڑی رقم تم۔۔۔''

اس سے پیشتر کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرتا۔وہ نوٹ لڑکی کے ہاتھ میں تھا۔

نواب صاحب نے بڑے غور سے میری جانب دیکھا۔لیکن نیازی کو میرے ساتھ بیٹھے دیکھ کر ان کا غصہ جاتا رہا۔

گائیکہ کا مقصد بھی نواب زادہ صاحب کو جوش دلانا ہی تھا۔جس میں کافی حد کامیاب ہو چکی تھی۔میں اب باراتیوں کی پیروی میں اُٹھ کر جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔میں نے مڑ کر دیکھا۔گائیکہ کا ایک کارندہ میرے پیچھے بیٹھا تھا۔اس نے بغل سے مجھے روپے پکڑائے،روپے کچھ زیادہ محسوس ہوئے،وہ میں نے بغیر گنے جیب میں ڈال لیئے۔اب میں دلیر ہو گیا اور سب سے پہلے دائیں جانب بیٹھے نیازی کے سر پر ایک روپیہ رکھا۔لیکن ڈانسر نہ آئی وہ نواب زادہ صاحب کے سامنے کھڑی گا رہی تھی۔نواب صاحب اُٹھے ان کے بائیں جانب جتنے لوگ دائرہ میں بیٹھے تھے ان کے سروں پر ایک ایک روپیہ کا نوٹ رکھا اور واپس چلے گئے۔لڑکی نے دوبارہ وہ پیسے اکھٹے کرنا شروع کر دیئے۔وہ میرے نوٹ کی جانب توجہ نہ دے رہی تھی۔اس دوران نواب صاحب نے ایک لائن اور نوٹوں کی کھڑی کر دی۔یہی ڈانسر کی چال تھی۔میرا نیازی صاحب کے سر پر رکھا نوٹ وہیں پڑا تھا۔تیسری بار نوٹوں کی لائن کھڑی ہونے سے پہلے ڈانسر نوٹ اٹھا کر نواب صاحب کے پاس چلی گئی۔میں اس طرح نوٹ رکھتا رہا اور ڈانسر اٹھاتی گئی۔نیازی کو اس کا علم نہ ہو سکا کہ میں کیوں اتنے نوٹ لٹا رہا ہوں۔نیازی کہنے لگا۔

''فاروق بھائی اس کی چھوٹی بہن جادو جگاتی ہے۔کسی روز اس کے بالا خانہ جا کر اس کا گانا سنیں گے۔''

نواب صاحب نے اس سے مزید تین گانے سنے اور ہر بول پر نوٹ دیتے رہے۔نواب زادہ صاحب خود ہی بولے۔

''یار ہم میں سے کوئی جائے اور ناراض باراتیوں کو واپس لے آئے۔''

ان کا واضع اشارہ میری جانب تھا۔میں اٹھنے لگا تو نیازی نے روک لیا۔کان میں کہنے لگا

''جانے کی ضرورت نہیں آرام سے بیٹھے رہو زیادہ لوگوں میں گانا کم باتیں زیادہ سننے میں آتی ہیں''

''میں تو اس بہانہ ہوسٹل جا رہا تھا۔''

''ابھی نہیں جانا''

مجبوراً بیٹھ گیا اور بڑے انہاک سے گائیکہ کے گانے سنتا اور ڈانس دیکھتا رہا۔میرے پیسے واپس آتے رہے۔اس طرح محفل میں دوبارہ گرمی آ گئی۔جب پیسے ختم ہونے لگتے تو میں دس روپے کا نوٹ دیتا اونچاس روپے واپس ملتے۔محفل چلتی رہی،صبح صبح آذان سے پہلے محفل ختم کر دی گئی۔میں جب محفل میں آیا،تو میرے پاس سترہ روپے تھے۔اب میری جیب میں پینتیس روپے تھے۔میں نے نیازی سے کہا۔

''یار اب میں جاتا ہوں''

''ہوسٹل کیسے پہنچو گے''

''میری گاڑی باہر کھڑی ہے،میں اسے تلاش کر لوں گا اگر نہ ہوئی تو ٹیکسی لے کر چلا جاؤنگا۔''

نیازی کہنے لگا۔

''اگلے ہفتہ شاہنور سٹوڈیو میں گانا کی ریکارڈنگ ہے۔تم فلاں تاریخ کو بیڈن روڈ والے دفتر صبح نو بجے آ جانا سٹوڈیو چلیں گے۔تمہیں بھی ایک رول دلوا دونگا۔''

صبح کا سورج نکلنے میں ابھی دیر تھی میرے ساتھی نماز کی تیاری کر رہے تھے کہ میں ہاسٹل پہنچ گیا۔

چند دن بعد پریکٹیکل ٹسٹ شروع ہو گئے ختم ہوئے تو سارا دن فارغ ہوتا۔مقررہ روز نواب صاحب کے بیڈن روڈ والے دفتر چلا گیا۔نیازی صاحب میرے انتظار میں تھے،مجھے دیکھتے ہی نواب صاحب سے کہنے لگا چلیں۔نواب صاحب ہمیں لیئے شاہنور سٹوڈیو پہنچے فلم ڈائریکٹر اور اس کا سٹاف نواب صاحب کے انتظار میں تھا۔شمیم کی چھوٹی بہن اختری تیار ہونے چلی گئی۔ڈائیریکٹر نے نیازی کو ایک دوپٹہ پکڑاتے ہوئے کہا۔

''آپ دونوں سامنے بنی منڈیر پر جا کر بیٹھ جائیں۔''

مارچ کی دھوپ میں تپش ذرا کم ہوتی ہے ہم دونوں وہاں جا کر دھوپ میں بیٹھ گئے۔نیازی نے وہ دوپٹہ مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''اسے اوڑھ لو دھوپ کی تپش کم ہو جائیگی۔''

نیازی کے کہنے پر میں نے دوپٹہ کمبل کی طرز میں اوڑھ لیا۔ڈائیریکٹر میرا دوپٹہ درست کروانے

کے بعد اونچی آواز میں پکارا۔

''سا۔۔ب ۔۔۔خا۔۔۔مو ۔۔ش۔۔کیمرہ مین۔ڈانسر۔ریڈی۔لائیٹس آن۔۔''

ڈانسر ہم دونوں سے ایک قدم پیچھے آ کر ایکشن کی صورت میں ایک جانب جھکی کھڑی ہوگئی۔

ڈائیریکٹر بولا۔

''ایکشن۔''

سٹاف نے بورڈ پر لکھا ٹیک نمبر کیمرہ کے سامنے کیا۔سب مشین کے پرزے کی طرح چل پڑے۔

ڈانسر آگے بڑھی اور ہم دونوں کو ایک دھکا دے کر علیحدہ کیا، اور درمیان سے چھلانگ لگا کر چھن چھن گھنگرو بجانے کے بعد بولی 'او پیار کرنے والو'، اور گھوم کر وہ میدان میں آ گئی۔

ایک آواز آئی کٹ۔لائیٹ بجھا دی گئی اور ڈائریکٹر صاحب نے ڈانسر کو مزید چند قدم پیچھے سے ڈانس کرتے ہوئے آنے کی ہدائیت دی اور بولا۔

''خا۔۔مو۔۔ش۔''

اس کے ساتھ ہی پنڈال میں سناٹا چھا گیا۔پھر ڈائیریکٹر بولا۔

''ریڈی۔۔۔لائٹس آن۔ایکشن۔۔''

روشنیاں جل گئیں۔

ڈاریکٹر بولا۔

''ٹیک۔''

ڈانسر نے پھر اپنا ڈانس شروع کیا۔کیمرہ مین نے فلم بنانی شروع کر دی اس دفعہ ڈانسر کا ہاتھ میرے کندھے کی بجائے گردن پر آیا، ڈائیریکٹر بولا۔

''کٹ''

اس طرح تین دفعہ غلط ٹیک ہوئی آخر چوتھی بار وہ گانا شروع کر سکی ''پیار۔کرنے۔والو۔۔۔''

مجھے نیازی پر غصہ آئے جا رہا تھا، میں بولا۔

''یار یہ کیا ہوا۔ایک تو تم نے مجھے لڑکی کا رول دلوایا۔دوسرے ڈانسر سے تھپڑ لگوا رہے ہو''

وہ کان میں آہستہ سے بولا۔

''شیخ صاحب خاموش۔''

تقریباً گھنٹہ کے بعد ڈانسر اپنا گانا مکمل کر سکی، گانا مکمل ہونے کے بعد ایک خیمہ میں کھانے کا پروگرام تھا۔ہم دونوں وہاں چلے گئے۔مال روڈ کے ہوٹل سے کھانا آیا تھا۔ڈائیریکٹر اور اس کا تمام عملہ کھانے میں مصروف تھا۔میں نے دیکھا کہ تمام لوگوں کے ہاتھ میں پکڑی پلیٹیں بھنے مرغ کی بوٹیوں سے بھری تھیں۔جس کسی کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا وہ اسی سے ہونٹ صاف کر رہا تھا۔سب دیگ کے گرد ہی کھڑے تھے۔ان کے کھانے کے طریقے سے گھن محسوس ہوئی۔میں نے اور نیازی نے تھوڑا سا سالن لیکر کھانا کھایا اور ہم دونوں کو نواب صاحب نے اپنی گاڑی میں واپس اپنے دفتر بیڈن روڈ بھجوا دیا۔

چند دنوں کے بعد میرے ایک مہربان دوست سید قربان علی شاہ لاہور آئے۔میں اُنہیں نواب صاحب سے ملانے بیڈن روڈ لے گیا نواب صاحب اپنے دفتر میں ایکٹنگ سٹاف کے ساتھ بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ان کی بیٹی کے علاوہ ایک ایکسٹرا گرل انکے پہلو میں بیٹھی تھی۔ بڑے تپاک سے ملے ہم دونوں کے لیئے پانچ سیر لنگڑا آم منگوائے۔ہم دونوں نے تو ایک ایک آم کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔باقی سب ان کے دیگر ساتھیوں نے کھا لیے۔ان کا آم کھانے کا طریق بھی نرالہ تھا۔وہ ایک آم تھوڑا سا چوس کر پاس رکھ لیتے اور دوسرا پکڑ لیتے۔شاہ صاحب واپسی پر باتوں باتوں میں کہنے لگے۔

''یار تم تو ایک شریف خاندان کے فرد ہو تم ان کنجروں میں کیوں پھنس گئے ہو۔دفعہ کرو ان کو۔''

اس گروپ کی یہ تعریف سن کر میں اس دن کے بعد نواب صاحب اور نیازی سے کبھی ملنے نہ گیا۔

باب پنجم

ابن بطوطہ کی تقلید میں

مئی میں کورس مکمل ہوگیا۔امتحان کے آخری تین پرچے باقی تھے کہ میرے ہمسائے میں ملائشیا کا ایک سیاح آکر رُکا۔ وہ پیدل دنیا کی سیر کو نکلا تھا۔ پہلے تو صرف علیک سلیک تک بات ہوئی جب آخری پرچہ بھی ختم ہوگیا تو اپنے ہمسایہ ملائیشین سے ملنے اسکے کمرہ میں چلا گیا۔ میں نے تکلفاً کہا کہ میرے لائق کوئی خدمت ہوتو بتاؤ وہ فوراًبولا۔

’’سیمنٹ کے اس فرش پر لیٹے لیٹے بہت تھک گیا ہوں اگر کہیں سے کوئی چارپائی مل جائے تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔‘‘

میں نے کہا، لا دیتا ہوں۔لیکن چارپائی کہاں سے لاتا کسی کی منت کرنے کی بجائے اپنی چارپائی اُسے دے دی اور خود فرش پر بستر لگالیا۔ چارپائی لے کر وہ بہت مشکور ہوا۔ایک روز وہ گپ لگانے میرے کمرے میں آیا۔ مجھے فرش پر بستر لگائے دیکھ کر حیران ہوا کہ میں نے اپنی چارپائی اُس کو دے رکھی ہے۔ باتوں باتوں میں اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے مجھے اپنے ساتھ دنیا کی سیر پر چلنے کی دعوت دی۔ اسکی باتوں سے مجھے بھی سفر کا شوق پیدا ہوگیا اور اس کو کہا کہ دیگر امور نمٹانے کے علاوہ ابھی تو پاسپورٹ بھی بنوانا ہے۔اگر آپ کچھ عرصہ مزید پاکستان میں رُکیں تو میں آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ وہ تو انتظار نہ کرسکتا تھا۔اسے اپنے شیڈول کے مطابق ہی چلنا تھا، کہنے لگا۔

’’اپنی فوٹو کی پچاس کاپیاں اور نیگیٹو ساتھ لانا۔ ہر جگہ امیگریشن والے چار فوٹوگراف مانگتے ہیں۔‘‘

میں نے اخراجات کے متعلق سوال کیا۔

’’زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں جب گھر سے چلا تھا تو میرے پاس صرف چالیس ڈالر تھے۔اب میرے پاس دوسو ڈالر کے علاوہ، تین سو ہندوستانی روپے اور کچھ پاکستانی روپے بھی ہیں۔کہیں پیسے خرچ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کھانا کھلانے کے بعد لوگ پیسے نہیں مانگتے۔ ہوٹل والے بھی پیسے نہیں مانگتے۔ پیسے دیں لے لیں گے۔ نہ دیں تقاضہ نہیں کریں گے۔‘‘

میں بڑا خوش ہوا، پیسوں کے بغیر دنیا کی سیر کرونگا اور وہ بھی ایک ساتھی کے ہمراہ۔ ملائیشین چار روز مزید رکا اور کراچی چلا گیا اسے جنرل منیجر ریلوے نے فری پاس دے دیا تھا۔

بس وہ چلا گیا اور میرے دل میں دنیا کی سیر کی کسک چھوڑ گیا۔ امتحان سے فارغ ہوکر گاؤں آگیا۔ملائشین نے ہائیکنگ (Hiking) کا سنہری پہلو کچھ اس طرح سے بیان کیا کہ سب ہراہی ہرا دکھائی دیا۔ ذہن میں کچھ اسی طرح کا نقشہ تھا کہ شہر سے باہر تو پیدل ہی جانا پڑے گا۔اس کے بعد جو کار بھی ملے گی۔ وہ اگر گنجائش ہوئی تو آپکو بٹھالے گی اور آپ کو اگلے شہر یا اپنے گھر لے جائے گی۔ دوتین روز تک تو مہمان رکھنے کے بعد جو ممکن ہوا بطورِ یادگار آپ کو بطور تحفہ پیش کرے گی۔ روزانہ منہ دھونا، شیو کرنا، نہانا، کپڑے بدلنا سخت منع ہے۔البتہ پہننے کے لیے موٹے اور مظبوط کپڑے اور مظبوط جوتے ضروری ہیں۔ایک رُک سیک اُس میں سامان ایک کمبل اور پتلی دری اور تکیہ کا غلاف ہو یا نہ ہو پیٹھ پر بندھا ہونا ضروری ہے۔ جس میں دکھانے کے لیے خشک ڈبل روٹی کے چند توش اور جام کی ایک خالی بوتل، اور ایک موٹی سوئی اور دھاگا بھی تمہارے پاس ہونا چاہیے۔ امتحانات کے بعد گاوں چلا گیا۔ ہچ ہائیکنگ کے خیالات میں گم میں ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا۔ والد صاحب سے اجازت لوں اور پاسپورٹ بنوا کر ملائشین ہچ ہائیکر کے ساتھ جا کر مل جاؤں۔ وہ ایشیاء کے کسی شہر میں ہی ہوگا اُس نے مجھے اپنا شیڈول دیا تھا۔ فلاں روز میں فلاں جگہ اور فلاں ماہ فلاں ملک میں ہوں گا۔اتنے دن افغانستان میں اور اتنے دن ایران میں رُکنے کا پروگرام ہے۔اس کے بعد وہ عراق اور ترکی جائے گا۔

والد صاحب روزانہ کسی نہ کسی کام کے سلسلہ میں گھر سے باہر ہوتے وہ یونین کونسل کے صدر تھے اس وجہ سے اُن کی مصروفیات کچھ زیادہ ہی ہوتیں کبھی تحصیل کونسل اور کبھی ضلع کونسل میں میٹنگ پر جانا پڑتا اور پھر کبھی زمین کی دیکھ بھال کے لیے مزارعین سے بات کررہے ہوتے۔ پانچ وقت نماز مسجد میں جا کر پڑھتے۔ وہ مسجد کمیٹی کے صدر بھی تھے جہاں پر کچھ نئی تعمیر اور توسیع کے

سلسلہ میں اینٹوں اور سیمنٹ کا بندوبست کرنے کے لیے انہیں اکثر چکوال جانا پڑتا۔ گاؤں میں شادی غمی کا بھی خیال ضروری تھا شادی کو تو چھوڑا جا سکتا تھا لیکن گاؤں کے ہر جنازہ میں شریک ہونا ضروری ہوتا اور تین روز تک غمی والے گھر میں گھنٹوں بیٹھنا پڑتا۔ برادری کے مسائل اس کے علاوہ تھے۔ والد صاحب ہر جگہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے دیگر بہن بھائی اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ ایک روز والد صاحب سے اپنی خواہش کے اظہار کا موقع مل ہی گیا۔ ان سے درخواست کی اگر آپ اجازت دیں تو میں دُنیا کی سیر پر چلا جاؤں یہ بھی کہا کہ اپنے اخراجات انتہائی کم رکھنے کی کوشش کروں گا۔

والد صاحب بیسوی صدی کے پہلے عشرے کے آلہ آباد یونیورسٹی کے طالبعلم رہے تھے جہاں ڈگری کلاسز میں قانون کے علاوہ سائنس اور آرٹس کے تمام مضامین ہر طالب علم کو پڑھائے جاتے تا کہ اُن کا طالب علم ہمہ جہت تعلیم یافتہ ہو اور ایک کامیاب زندگی گزار سکے۔ والد صاحب اپنی ملازمت کے دوران ایک نقطہ دان اور بہترین اپیل تحریر کرنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ فرمانے لگے کہ بیٹا "ہچ ہائیکر کا اردو میں ترجمہ کرو میں نے کہا کہ "دُنیا کا پیدل سفر کرنے والا سیاح" پھر بولے نہیں یہ تو تم اپنی ذہنی کیفیت بیان کر رہے ہو۔ ڈکشنری دیکھ کر مجھے کل بتانا۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ والد صاحب سے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ جانا اور خاموش ہو گیا۔ دوسرے روز ہی والد صاحب سے بیرون ملک سیر پر جانے کا ارادہ ملتوی کرنے کا کہہ دیا۔ والد صاحب نے بڑے مشفقانہ لہجہ میں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ بیٹا دشت نوردی تو دشت نوردی ہی ہے۔ کراچی ہو یا لندن، بھکاری کی طرح سڑک پر کھڑے ہو کر بھیک مانگنے والے کا کوئی مقام نہیں ہوتا ہے۔ بھیک لفٹ کی ہو یا روٹی کی، گھٹیا کام ہے۔ بزرگوں کا قول ہے۔

'' منگن بے وقار''

تھوڑے توقف سے محبت بھرے لہجے میں بولے، اچھا تم اپنی سفر کرنے کی اس خواہش کو بھی پورا کر دیکھو پہلے تم پاکستان کی سیر کرو لیکن ایک آوارہ گرد کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک باعزت شہری کی مانند ہر جگہ ٹکٹ خرید کر سفر کرو۔ گھر واپسی کا کرایہ علیحدہ کسی جگہ محفوظ رکھو۔ تا کہ تمہیں کسی وجہ سے مجبوراً گھر لوٹنا پڑ جائے تو تمہارے پاس زائد پیسے بھی ہوں۔ سڑک پر لیٹنے کی بجائے کسی چھوٹے یا بڑے ہوٹل میں قیام کرنا۔ تمہیں سفر کی مشکلات کا اندازہ ہو جائے گا۔ پھر دنیا کی سیر پر بھی چلے

جانا۔

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو ایک نیا تجربہ ہی سہی میں نے جواب میں درخواست کی کہ پہلے آپ مجھے پنجاب کی سیر کی اجازت دیں۔ اس کے بعد سندھ، بلوچستان اور سرحد کی سیر کروں گا۔ والد صاحب نے اس پروگرام کو سراہا۔ میں نے ایک چھوٹا سا بجٹ بنا کر دیا۔ والد صاحب کہنے لگے کہ اس کے علاوہ آپکو کچھ پیسے معرفت پوسٹ ماسٹر ملتان منی آرڈر کر دونگا۔ وہ بھی وہاں پہنچ کر وصول کر لینا۔ میں نے والد صاحب سے کہا کہ چکوال سے میانوالی، ملتان، سے ہوتا ہُوا لاہور اور چکوال واپس آؤں گا۔ اندازہ تھا کہ دو ماہ کا عرصہ گزر جائیگا والد صاحب راضی ہو گئے طے پایا کہ ہر وہ شہر جہاں ایک ہوٹل ہوگا۔ وہاں ایک رات قیام کروں گا اور اس دوران اس شہر میں موجود مساجد اور مزارات پر جاؤں گا اور روزانہ اُنہیں ایک خط تحریر کروں گا، جس میں آنکھوں دیکھا حال اور اگلے تین دن کا پروگرام بھی تحریر کروں گا۔ کہ تیسرے روز میں ممکنہ طور پر کہاں ہوں گا۔

پیر صحابہ کا قبرستان

چکوال تو میرا آبائی وطن تھا اچھا خاصہ دیکھا ہوا۔ اس کے ہر محلّہ اور گلی میں میرا کوئی نہ کوئی ہم جماعت یا دوست رہتا تھا۔ والد صاحب کے اصرار پر، مزارات پر فاتحہ خوانی کرنے گیا۔ چکوال کے مشرق میں پیر صحابہ کے قبرستان میں ایک نوگزہ پیر کی قبر پر گیا۔ محرم کا مہینہ تھا۔ قبرستان میں بہت سے لوگ اپنے عزیزوں کی قبر پر فاتحہ خوانی اور ان پر مزید مٹی اور ریت کا اضافہ کرنے آئے ہوئے تھے۔

ایک میلہ کا سماں تھا۔ چند قبروں پر تازہ پھولوں کی چادریں بچھی تھیں۔ ایک قبر پر تازہ پھولوں کا سہرا بچھا تھا۔ وہ کسی جوان لڑکے کی قبر تھی۔ جو حال میں کسی حادثہ میں فوت ہو گیا تھا۔ چند جوان لڑکے ایک قبر کھودنے میں مصروف تھے ان میں میرے ایک ہم جماعت کا بھانجا بھی تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کون فوت ہو گیا ہے۔ اس نے جواب نہ دیا اور رونے لگ گیا۔ دوسرے لڑکے نے بتایا، اس کے بھائی نے قتل کر دیا تھا۔ اسے پرسوں پھانسی دی جائیگی۔ اس کی خواہش پر پیر صحابہ کے اس قبرستان میں ہم قبر کھود رہے ہیں۔ یہ سُن کر میری طبیعت خراب ہو گئی اور میں محلّہ انوار آباد جہاں، ابھی ابھی عالیشان مسجد تعمیر ہوئی تھی، چلا گیا۔ مسجد کے

بیرونی صحن پر پارہ لگے شیشے لگے تھے۔ دن کے وقت سورج کی روشنی میں سب طرف چکا چوند پیدا کرتے۔

ماتمی جلوس

اُس دوپہر ہی کو تلہ گنگ چلا گیا۔ گیارہ محرم کو سفر کا آغاز اس لیے کیا کہ دس محرم کا جلوس ہر جگہ ختم ہو چکا ہوگا۔ لیکن جب تلہ گنگ پہنچا تو مقامی اہلِ تشیع حضرات نے گیارہ محرم کو دس محرم کا جلوس نکالا ہوا تھا۔ اور لوکل انتظامیہ کو یہ دلیل پیش کی تھی کہ دسویں محرم اس دن ہے۔ جلوس کے دوران تخریبی عناصر نے جلوس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ پہلے دونوں گروپوں کے نوجوان گتھم گتھا ہوئے کسی منچلے نے ایک گملہ سڑک پر زور سے مارا۔ ایک شور ہوا، بہت سی ٹھیکریاں اڑیں اور لوگوں کو لگیں، اس سے زخمی تو کوئی نہ ہوا، بس فساد شروع ہو گیا۔ پہلے لوگوں نے وہ ٹھیکریاں مارنی شروع کیں۔ اتفاق سے ایک غریب ریڑھی والا گلی گلی سبزی فروخت کرتا وہاں آن نکلا۔ ریڑھی کو ایک جانب کھڑا کیئے زنجیر زنی دیکھ رہا تھا۔ کہ فساد شروع ہو گیا۔ ٹھیکریاں ختم ہو گئیں تو کوئی ریڑھی کو گھسیٹ لایا۔ اور لوگوں نے آلو پیاز مارنے شروع کر دیئے۔ بھگدڑ میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ ریڑھی ایک منٹ میں خالی ہو گئی۔ آلو پیاز ختم ہوئے تو اینٹوں ٹکڑے لوگ نے مارنے شروع کر دئے۔ جس سے کئی نوجوان زخمی ہوئے وہ تو مرہم پٹی کے لیے ہسپتال چلے گئے۔ باقی ماندہ لوگ جلوس کے اختتام کے بعد آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے اکٹھے ہونے شروع ہو گئے۔

تلہ گنگ شہر میں میرے ایک ہم جماعت رہتے تھے۔ دریافت کرتا ہُوا اُن کے گھر جا پہنچا۔ اُن کی گلی میں آمدورفت کچھ زیادہ دکھائی دی۔ میں نے اِس طرف کوئی توجہ نہ دی اور ان کے گھر پہنچ کر دروازہ پر دستک دی ایک دس بارہ سال عمر کا لڑکا باہر آیا۔
میں نے اس سے چھوٹے بخاری صاحب کا دریافت کیا کہ کیا وہ گھر پر ہیں؟۔ میرے ہاتھ میں اٹیچی کیس اور بغل میں بیگ دیکھ کر واپس چلا گیا جلد وہی لڑکا واپس آیا، اور بولا۔
’’آپ کا نام پوچھ رہے ہیں۔ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں‘‘
انہیں بتاؤ کہ چکوال سے آیا ہوں نام بتانے لگا تو خیال آیا کہ اس وقت نام بتانا دانشمندی نہیں، نام بتانے کی بجائے خاموشی اختیار کی۔ تھوڑی دیر بعد وہی لڑکا پھر نمودار ہوا اور کہنے لگا۔

’’آج کے واقعہ کے بعد گھر میں میٹنگ ہو رہی ہے آپ کا نام پوچھ رہے ہیں‘‘۔
میں نے نام بتانے سے گریز کیا اور جواب میں کہا کہ دو گھنٹے بعد آجاؤں گا۔
وہاں سے ایک دور کے رشتہ دار کے گھر چلا گیا۔ اگلی صبح میانوالی کی بس پر بیٹھ گیا۔ میانوالی میں ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لیا سامان رکھا۔ اگست کی دھوپ میں تمازت زیادہ تھی۔ کمرہ سے باہر نکلنے کو جی نہ چاہا، تھوڑا استانے کے لیے لیٹ گیا۔ نیند آئی اور سو گیا جب اُٹھا تو موسم مناسب ہو چُکا تھا۔

اللہ والے فقیر

ہوٹل کے مالک سے میانوالی کی تاریخ اور یہاں کے مشہور مزارات کے متعلق دریافت کیا۔ وہ بولا کہ بغداد کے پرایس نامی ایک بزرگ نے اس شہر کو مغلیہ عہد میں آباد کیا(Holy man from Baghdad Prius founded Mianwali in Mughals reign)اس بزرگ کا بیٹا عرصہ دراز تک اس شہر کا حاکم رہا تھا۔ اس شہر میں اولیا اللہ تو بہت ہیں۔ البتہ جناب اللہ والے فقیر کا مزار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہاں حاضری ضروری بتائی۔ اس نے بتایا کہ فلاں جگہ سے آپ کو مزار کے لیئے تانگے مل جائیں گے۔ اللہ والے فقیر کے مزار پر حاضری دینے چلا گیا۔ لاہور کے داتا دربار جتنا بڑا دربار تھا۔ دربار کے ساتھ جڑی ایک مسجد بھی تھی۔ مزار کے ساتھ بازار میں پھولوں اور کھانے بیچنے والی دکانیں کافی تعداد میں تھیں۔ ایک پکی ہوئی چاولوں کی دیگ والا لڑکا مجھ سے چاولوں کی پکی دیگ خریدنے کا اصرار کرنے لگا۔ مزار پر حاضری دی فاتحہ پڑھی اور مزار سے باہر آیا۔ راستہ میں ایک کھڑکی میں ایک شخص بیٹھا تبرک تقسیم کر رہا تھا۔ بہت سے لوگ تبرک لینے کے لئے ایک میں لائن کھڑے تھے۔ میں بھی اس لائن میں کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی میں بیٹھا شخص لائن میں آنے والے ہر شخص کو لنگر سے تبرک کے چاول تقسیم کر رہا تھا۔ میں نے بھی تبرک کے چاول لیے اور کھاتا ہوا واپس ہوٹل کی جانب پیدل ہی چل پڑا۔ مزار سے باہر گلی میں آ رہا تھا۔ دیکھا کہ معتقدین کا ایک گروپ مزار کے اندر جا رہا ہے۔ گروپ کے آگے ایک ملنگ فقیر سبز لمبا کرتا پہنے لمبے بالوں کو جھٹک جھٹک کر دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ایک چھوٹے دائرہ میں دھمال ڈال رہا تھا۔ اس نے انگلیوں میں موٹے سبز رنگ کے پتھروں کی بہت سی

انگوٹھیاں، بازوؤں میں کڑے اور گلے میں انہیں پتھروں سے بنی ڈھیر ساری مالائیں پہن رکھیں تھیں۔گروپ کے درمیان ایک لمبے قد کا آدمی ایک ہاتھ کانوں پر رکھے چیخ چیخ کر سرائیکی زبان میں کوئی نعت گا رہا تھا۔وہ ہر شعر کے آخر میں ''پیرا ہوٗ'' ایک لمبی تان میں پکارتا۔اور اس کے ساتھی ''ہری'' کا نعرہ لگاتے۔گلی کی نکر پر پہنچ کر ایک ٹانگہ میں سوار ہو گیا اور ہوٹل میں آ گیا۔

مغرب کے قریب ہوٹل کی لابی میں ہی بیٹھ گیا۔ہوٹل والے نے تین چار میزیں ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر لگا رکھی تھیں۔چند لڑکے ہنستے مسکراتے آئے اور ایک میز پر بیٹھ گئے۔ابھی لڑکے بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔کہ ایک اسی سالہ بوڑھا شخص سوٹی ٹیکتے ہوئے ایک بچے کی راہبری میں وہاں آیا۔بچے نے بوڑھے شخص کو ایک لڑکے کے پیچھے لا کھڑا کیا۔لڑکا ساتھیوں سے گپ لگا رہا تھا۔اس کا منہ سڑک سے الٹی جانب تھا۔بوڑھا شخص اپنا وزن بھی سنبھال نہ سکتا تھا۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے دیکھے بغیر جوان لڑکے کی پٹائی شروع کر دی۔لڑکا پہلی سوٹی پر ہی غصہ کی حالت میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔لیکن بوڑھے شخص کو دیکھ کر سر کو نیچے کر لیا اور بوڑھے شخص کی سوٹی کو نہ روکا۔سوٹی جسم پر جہاں لگتی اس جگہ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیتا۔بوڑھے نے تین چار سوٹیاں مارنے کے بعد اسے چلنے کا اشارہ کیا۔وہ بوڑھے شخص کے دوسرے ہاتھ کی جانب آیا اور سر نیچے کئے سامنے آ کر اپنا ہاتھ بوڑھے کو سہارا دینے کے لیے بڑھایا۔بوڑھے نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا اور ایک سوٹی اس کے کندھے پر مزید رسید کی۔لڑکے نے ہاتھ پیچھے نہ کیا البتہ دوسرے ہاتھ سے کندھے کو سہلایا۔اور بوڑھے کے آگے چل پڑا۔بوڑھے نے سہارا لینے کے لیئے لڑکے کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں چل دیئے۔

میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ہوٹل منیجر سے بوڑھے شخص اور لڑکے کے متعلق دریافت کہ وہ کون تھے۔منیجر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔رات کا کھانا اسی ہوٹل میں کھایا اور سو گیا۔صبح ناشتہ کیا اور کندیاں کی جانب روانہ ہو گیا۔

میانوالی سے ملتان جاتے ہوئے پہلا سٹاپ کندیاں تھا ذہن میں نقشہ تھا کہ کندیاں بڑا ریلوے جنکشن ہے شہر بھی یقیناً بڑا ہی ہوگا۔ریلوے سٹیشن تو واقعی بہت بڑا تھا۔چار گاڑیوں کے کھڑا ہونے کے لیئے لائینیں بچھی تھیں۔تین پلیٹ فارم ایک بڑی سیڑھی والا پل تینوں پلیٹ فارموں کو ملانے کیلئے بنا تھا۔انتظار گاہ برائے نام ہی تھی۔اٹیچی اور بیگ لئے سیر کے لیے باہر نکلا

خیال تھا کہ اٹیچی کسی ہوٹل والے کے پاس امانتاً رکھ دونگا۔لیکن حیران رہ گیا کہ وہاں شہر، بازار، تانگہ یا لاری اڈہ کچھ بھی نہ تھا۔چند ویران چھپر ہوٹل تھے۔جو ریل کی آمد سے پہلے بارونق ہوتے۔ایک چھپر ہوٹل پر دوپہر کا کھانا کھانے اور چائے پینے کے لیئے بیٹھ گیا۔اس ویرانی کی وجہ دریافت کرنے پر ہوٹل کے مالک نے بتایا کہ شہر یہاں سے ایک میل دُور ہے۔

بڑی پریشانی ہوئی کہ عجیب شہر ہے اتنا بڑا جنکشن اور چھوٹا سا شہر ہے۔اور وہ بھی ایک میل دور ہوٹل میں چار لکڑی کی کرسیاں ایک سیدھی نڑی والا حقہ رکھا تھا۔جس کے ساتھ جلے تمباکو کی راکھ ڈالنے کے لیئے ایک ڈبہ رسی سے بندھا لٹک رہا تھا۔ایک ماچس حقہ کے ساتھ دھاگہ سے بندھی تھی۔چاروں کرسیوں کے درمیان ایک مستطیل شکل کی عمر رسیدہ میز رکھی تھی۔جسے سیدھا کھڑا ہونے کے لیے سہارے کی ضرورت تھی۔حقہ کے دونوں جانب بیٹھنے کے لیے چار پائیاں بچھی تھیں۔چار پائیاں کوندر سے بنی تھیں۔ایک چار پائی پر بیٹھا تو تھکاوٹ کا احساس ہُوا۔چار پائی پر لیٹ جانے کو جی چاہا۔گاؤں سے روانہ ہوئے آج پانچواں روز تھا سکون اور آرام تو گھر میں ہی میسر ہوتا ہے۔ہوٹل والے سے کھانے کا پوچھا۔جواب میں اس نے کہا اَب تو صرف چائے بنا کر دے سکتا ہوں۔جتنا پکایا تھا سب بک گیا ہے۔وہ گندے برتن ایک بالٹی میں ڈالے دھو رہا تھا۔اس نے بتایا کہ ابھی رات کو ایک ٹرین ملتان سے آنی ہے اُس میں سوار ہونے والے لوگ تھوڑی دیر میں آنا شروع ہو جائیں گے محرم کی تعطیلات کا آج آخری روز ہے۔بہت سے ملازم پیشہ لوگ ڈیوٹی پر جانے کے لیئے آ جائیں گے۔اُن کے لیئے رات کو کھانے کا انتظام کرونگا ہے۔شہر جانے کی ہمت نہ ہوئی سارا دن ہوٹل پر بیٹھے گزار دیا۔رات کو اسی ہوٹل سے کھانا لے کر کھا لیا ہوٹل بند کرنے لگا تو میں نے اس سے رات رہنے کے لیے ایک چار پائی کا دریافت کیا۔کہنے لگا۔

''مل جائے گی۔''

بکس اس نے لے کر سٹور میں رکھ دیا۔میرے لیئے ایک چار پائی تندور کے پاس ہی بچھا دی میں تھکاوٹ کی وجہ سے گرم تندور کے پاس ہی لیٹ گیا۔ہوٹل والے سے رات کو حفاظت کے انتظام کا دریافت کیا۔کہنے لگا۔

''گھبرائیں نہیں سب ہوٹل والوں نے مل کر ایک چوکیدار کا انتظام کر رکھا ہے۔ہمارا بہت سارا راشن اور دیگر سامان بھی یہاں رکھا ہے۔رات کو تندورچی بھی یہیں سوتا ہے۔صبح صبح اسے تندور کو گرم کرنا

ہوتا ہے۔ ویسے ریلوے سٹیشن پر رات کو چوکیدار کے علاوہ ایک سٹیشن ماسٹر بھی دفتر میں سوتا ہے۔''

تندور چی تو اپنی چار پائی کھلے میدان میں بچھا کر سو گیا۔ لیکن میں نے تھکاوٹ کی بنا پر گرم تندور کے پاس سونا پسند کیا۔ رات گئے بہت سے آوارہ کُتے ہڈیوں کی تلاش میں وہاں آ گئے۔ ایک ایک ہڈی پر لڑتے اور خوفناک آوازیں نکالتے ایک کُتا دوسرے سے ہڈی چھین کر بھاگا راستہ میں میری چار پائی تھی اُس نے تیز بھاگتے ہوئے چار پائی کے اُوپر سے ہائی جمپ لگائی اور چار پائی پھلانگ گیا۔ دوسرا اسکے پیچھے تھا خیر ہوئی کہ وہ دونوں ہی خاصے صحت مند تھے۔ دونوں دوسری جانب پھلانگ گئے وگرنہ مجھے اُن سے کُشتی کرنی پڑ جاتی۔ تندور چی بھی نزدیک ہی سو رہا تھا اُس نے سوٹی سے ایک کتے کو زور سے مارا۔ کتا چیختا دوسرے ہوٹل کی جانب بھاگا اور دیگر اُس کے پیچھے بھاگے۔ اب ہڈیوں کے حصول کی جنگ کا دائیرہ دیگر ہوٹلوں تک پھیل گیا۔ یہ لڑائی تقریباً آدھ گھنٹہ تک جاری رہی جونہی ہڈیاں ختم ہوئیں وہاں سے کتے دوسرے کسی اور جانب فرار ہو گئے کُتوں نے کافی پریشان کیے رکھا۔ لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے بغیر بستر کے مزے کی نیند سویا صُبح تمام تھکاوٹ دور ہو چکی تھی۔ جلدی بیدار ہُوا منہ ہاتھ ریلوے سٹیشن کے نلکا پر جا کر دھویا تنہائی کا احساس بہت ہُوا خوف ہوا کہ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو جاتی تو واپس گھر کس طرح پہنچتا۔

یہ ایک قاضی ہے

اس کے بعد کلور کوٹ کی جانب بڑھا ریلوے سٹیشن پر ایک ہوٹل والے سے کرایہ کی چار پائی کی بات کی۔ اس نے کہا کہ مل جائے گی۔ اٹیچی اس کے پاس امانتاً رکھ دیا اور خود شہر چلا گیا۔ لیکن کوئی خاص بلڈنگ دیکھنے کو نہ ملی۔ بازار میں گھوم پھر کر جلد ہی واپس آ گیا۔ واپسی پر مجھے ہوٹل کا ماحول کچھ منحوس اور خوف ناک دکھائی دیا۔ اس میں بیٹھے گاہک کچھ عجیب سی شخصیت کے مالک نظر آئے۔ ان کے خدوخال سے اک عجیب وحشت اور ناکامی ٹپک رہی تھی۔ سبھی خاموش تھے ایک ہی گروپ کے ممبر نظر آئے۔ مجھے وہاں دیکھ کر وہ کچھ گھبرا گئے۔ ایک نے میری جانب اِشارہ کرتے ہوئے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔ کہ یہ کون ہے اور اس وقت کیوں آیا ہے۔ وہ بولا کہ یہ ایک قاضی ہے۔ رات اسی ہوٹل میں قیام کرے گا۔ اُن سب کے چہرے کھل اُٹھے۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہوٹل مالک نے مجھے قاضی کیوں کہا۔ اور قاضی کا لفظ سنتے ہی سب کے چہروں پر

رونق کیوں آ گئی۔

گروپ لیڈر جو دور علیحدہ ہی اکیلی چار پائی پر بیٹھا تھا۔ ایک خاموش پریشان بیٹھے شخص سے مخاطب ہوا۔

''تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی تھی کہ تم سیڑھیاں چڑھ گئے۔ ہم سب اچھا کام کر رہے تھے کہ تمہاری حماقت کی وجہ سے ہمیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔''

وہ بولا۔

''بھائیو میں نے تو نیک ہی سوچا تھا۔ کہ آپ سب لوگ نیچے والی منزل کی عورتوں سے زیور کامیابی سے اُتروا رہے ہیں۔ میں اوپر والی عورتوں سے اتروا لیتا ہوں۔''

غضب ناک آنکھوں والا آدمی یہ ڈائیلاگ سُن رہا تھا وہیں سے بولا۔

''اس کا کوئی قصور نہیں غلطی ہم سے ہوئی۔ سیڑھیوں پر ایک نہیں دو شخص ہونے چاہیں تھے۔''

یہ ڈاکوؤں کا گروپ تھا۔ جس نے شہر کے کسی مقام پر ایک ڈاکہ ڈالا۔ اُس گھر کی دو منزلیں تھیں پانچ ڈاکو تھے ایک سیڑھیوں پر کھڑا ہو گیا۔ دو نیچے والی منزل میں گھر کے اندر دروازے پر رُک گئے۔ اور دو نے عورتوں کو ڈرا دھمکا کر ان سب کو کہا کہ زیور اُتار دو اور کمرہ سے منسلک غسلخانہ میں چلی جاؤ۔ نیچے کی منزل والوں کی کاروائی کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے سیڑھیوں پر کھڑا ڈاکو اوپر کمرے میں چلا گیا۔ وہاں ایک مہمان اور دو گھر کی عورتیں بیٹھی گپ لگا رہی تھیں۔ کالا ماسک پہنے جب وہ کمرہ میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر ایک عورت چلائی ہائے جن۔ دوسری کی بھی چیخ نکل گئی۔ وہ سمجھی کہ شاید کوئی جن یا بھوت اندر آ گیا ہے۔ لڑکا اناڑی تھا، یہ اُس کی پہلی مہم تھی۔ ماسک اُتارا اور عورتوں سے مخاطب ہوا۔ میں جن نہیں ڈاکو ہوں تم سب اپنے زیور اتار دو اور اس تھیلے میں ڈالو۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ہوا میں پستول سے فائر کر دیا۔ عورت کی چیخ پر پہلے ہی ہمسائے الرٹ تھے۔ گولی کی آواز سُن کر ہمسایہ حالات کا جائزہ لینے آ گیا۔ حالات جاننے کے لیئے گھنٹی بجائی۔ ڈاکو اپنا لوٹا ہوا مال چھوڑ گولیاں چلاتے فرار ہو گئے۔ اب وہ سب اس ہوٹل میں پہنچ گئے تھے اور سبھی اِس اناڑی پر خفا تھے۔

ان میں سے ایک کو میں نے اپنی جانب گہری نظروں سے گھورتے پایا۔ دل میں ایک انجانا خوف پیدا ہُوا کہ یہ جگہ شہر سے باہر ویرانے میں ہے۔ رات کو ریلوے کے ملازمین بھی شاید نہ

ہوں یہاں سے نکلنے میں ہی عافیت ہے۔خوش قسمتی سے ریلوے اسٹیشن سے سواریوں کے حصول
کی توقع پر ایک بس، جوڈیرہ اسماعیل خان جارہی تھی، آکر رکی۔کنڈیکٹر نے زور سے آواز لگائی
ڈیرہ۔ڈیرہ۔ڈیرہ اُسے فرشتہ رحمت جانتے ہوئے میں نے ہوٹل کے مالک سے اپنا اٹیچی کیس
مانگا۔

''میری بس آگئی ہے میں جارہا ہوں رات نہیں رکونگا''

وہ بکس دینے کو تیار نہ تھا۔جان بوجھ کر پہلے تو کسی اور کام میں مصروف ہوگیا۔پھر وہ برتن دھونے
لگ گیا۔جیسے اس نے میری بات نہیں سنی اور وہ کنکھیوں سے بس کی جانب بھی دیکھ رہا تھا۔اب
اسکی حالت ایک ایسے چور کی تھی جو ہمت کر کے چوری کی کوشش کر رہا ہو اور واردات کرنے سے
پہلے موقع پر پکڑا گیا ہو۔اپنی خفت اور ندامت کو چھپانے کے لیے کہنے لگا۔

''بھائی تم میرے مہمان بنو۔یہیں رکو''۔

اٹیچی سامنے ہی رکھا تھا، میں نے بڑھ کر خود ہی ہینڈل سے پکڑ لیا۔ہوٹل کے مالک نے دعوت کو
دہراتے ہوئے اٹیچی دوسری جانب سے اپنی گرفت میں لے لیا اور خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے
کہنے لگا۔

''بھائی آپ میرے مہمان ہیں۔میں نے گھر میں پیغام بھیج رکھا ہے، ہم رات گھر چلیں گے۔''

میں نے اس کی دعوت کو ٹھکرا دیا اور کہا میری بس آگئی ہے میں جارہا ہوں۔میں نے کنڈکٹر کو
زور سے آواز دی۔

''مجھے بھی ڈیرہ جانا ہے مجھے ساتھ لیتے جانا۔''

کنڈکٹر کو اندر آتے دیکھ کر ہوٹل کے مالک نے بکس کو دوسری جانب سے چھوڑ دیا۔

بس روانہ ہونے کے بعد کنڈکٹر نے مجھے پریشان دیکھ کر وجہ دریافت کی اور میرے جواب
سے پیشتر اُس نے بتایا۔کہ یہ ہوٹل رات کو شہر سے باہر ہونے کی بنا پر چور اُچکوں اور قاتلوں کی
آماج گاہ ہے۔اکثر مسافران کی زیادتی کا گلہ کرتے ہیں۔اس نے مزید بتایا کہ دریائے سندھ
میں اس وقت طغیانی ہے۔کشتیوں کا عارضی پل ہٹا لیا گیا ہے۔بسیں ڈیرہ اسماعیل خان نہیں جا
سکتیں۔وہ دریائے سندھ کے مشرقی کنارے تک جا کر وہیں رک جاتی ہیں۔اس کے بعد
سواریاں لانچ یا سٹیمر کے ذریعہ دریا کو پار کرتی ہیں۔دوسرے کنارے پر ہماری کمپنی کی بس کھڑی

ہے۔وہ اس بس کی تمام سواریوں کو ڈیرہ تک لے جائے گی۔اور ہم دریا کے مشرقی کنارے سے
میانوالی جانے والیاں سواریاں لے کر واپس میانوالی آجائیں گے۔میرا پروگرام تو ڈیرا اسماعیل
خان جانے کا نہ تھا۔میں تو ان بدمعاشوں کے ٹولہ سے جان چھڑانے کے لیئے اس بس میں سوار ہو
گیا تھا۔بس جہاں بھی جاتی چلا جاتا۔یہ تو خوش قسمتی سے ڈیرہ کی جانب جارہی تھی۔ڈیرہ کی
بجائے مشرقی کنارے تک کا ہی ٹکٹ لیا۔ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد گاڑی دریا کے کنارے پہنچ
کر رک گئی۔تمام سواریاں بس سے اتر کر ایک لانچ میں بیٹھ گئیں۔میرے ساتھ آنے والے
مسافروں نے حیرانگی سے میری جانب دیکھا کہ شاید میں کسی غلط فہمی میں ہوں۔ایک مسافر نے
اونچی آواز میں مجھے بلایا۔

''اونڈھے (لڑکے) تم نے ڈیرہ نہیں جانا''۔

میں نے نفی سر ہلایا اور دریا کے کنارے بیٹھ گیا۔

دریا پُورے جوبن پر ٹھاٹھیں مارتا گزر رہا تھا۔پانی پر بنتے دائرے اور بھنور۔اُن کے اندر
بہتے درختوں کی ٹہنیاں غائب ہو رہی تھیں۔یہ وہ مکمل درخت تھے جنھے یہ دریا تیز روانی کی بدولت
اپنے ہمراہ جڑوں سمیت اُکھاڑ لایا تھا۔دریا میں پانی کی مقدار بے انتہا تھی۔دریا کا دوسرا کنارہ
نظر نہ آرہا تھا۔پاس کھڑے ایک مسافر سے پوچھا۔کہ یہ دریا کتنا چوڑا ہوگا۔وہ بولا کہ سٹیمر تو یہاں
سے نظر نہیں آتا۔البتہ آسمان پر وہ لکیر دیکھیں، اس نے دُور آسمان پر دریا کی دوسری جانب ایک
کالی لکیر کی جانب اشارہ کیا۔مسافر کہنے لگا یہ لکیر سٹیمر سے نکلنے والے دھواں کی ہے۔جس کو ابھی
سٹارٹ کیا گیا ہے اور یہ کالی لکیر یہاں سے چودہ میل کے فاصلہ پر ہے۔اُس نے بتایا کہ اس لکیر
تک تو سٹیمر جا سکتا ہے اس سے آگے بھی دریا ہے۔وہاں دریا پایاب ہے مگر رواں دواں ہے۔وہ
بھی دریا کا حصہ ہے۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ اِتنا پانی کہاں سے آرہا اور کہاں جارہا ہے اس دریا میں تو ابھی
مزید پانچ بڑے اور کئی چھوٹے دریاؤں کا پانی شامل ہونا باقی ہے۔اس وقت دریا میں کتنا پانی ہو
جائے گا۔اس کی انتہائی مقدار کو سوچ کر دل میں ایک انجانے خوف نے جھرُجھری لی۔آج کا
سپت سندھو یا اباسین جس پر اتنے ڈیم بھی بن چکے ہیں۔یہ کتنا ہیبت ناک ہے۔

تب بارھویں صدی عیسوی، اس سندھو میں پانی کتنا رہا ہوگا کہ جس کی مقدار اور تیزی کو

دیکھ کر چنگیز خان جیسے بہادر اور اسکے کمانڈر نایان جیسے دلیر سپاہی بھی دریا میں کودنے سے گھبرا گئے تھے۔ نایان جلال الدین خوارزمی کے تعاقب میں تھا۔اسے زندہ گرفتار کرنا چاہتا تھا۔خوارزمی نے چنگیز خان کے پوتے کو ایک جھڑپ کے دوران قتل کر دیا تھا۔جس کے بدلہ میں چنگیز خان نے جلال الدین کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی قسم کھائی تھی۔ نایان دریا میں کودنے سے پہلے چنگیز خان سے اجازت لینے کے لیئے رک گیا۔اس کی نگاہ میں یہ خودکشی تھی۔ چنگیز خان نے بھی دریا کی تیزی اور پانی کو دیکھتے ہوئے اسے دریا میں چھلانگ لگانے سے روک دیا۔لیکن اس نے دیکھا کہ جلال الدین خوارزمی اس پانی کی روانی اور گہرائی کو ٹھوکر مار کر بے دھڑک دریا کو تیر کر پار کر رہا تھا۔ خوارزمی کی اس دلیری کو چنگیز خان نے دیکھا تو حیرت سے اس کے منہ سے نکلا۔

''آفرین ہے ایسے دلیر اور بہادر شخص پر۔''

دریائے سندھ کے کنارے سواریوں کے بیٹھنے کے لیے کوئی مستقل یا عارضی انتظار گاہ نہ تھی۔ کوئی سایہ دار درخت بھی دریا کے کنارے موجود نہ تھا۔ چند چھوٹے کیکر ببول کے درخت قدرتی اگے تھے جن کا سایہ بھی کم گھنا تھا۔ جسے جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا۔ بہت سے مسافر دھوپ میں ہی سر پر کپڑا رکھ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں لانچ کشتی اس کنارے پہنچ گئی۔ لانچ کے سب مسافر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں بھی اسی گاڑی میں سوار ہو کر دریا خان آ گیا۔

یہ ایک چھوٹا کم آبادی والا قصبہ تھا۔ایک ہی بازار تھا۔ اس میں بھی کوئی پلازہ یا دو منزلہ دکانیں یا بڑا ہوٹل نظر نہ آیا۔ ایک چھپڑ ہوٹل پر قیام کیا۔ دریا خان میں مسلسل سفر میں رہنے سے تھکاوٹ اور بخار کا احساس ہوا۔ ہوٹل کے پاس ہی ایک دودھ کی دکان پر بہت سے گاہک گرم دودھ اور جلیبی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے فرسٹ ایڈ بیگ سے اسپرین کی دو ٹکیاں نکالیں اور دودھ والے کی دکان پر چلا گیا۔ میں نے بغیر جلیبی کے گرم دودھ کی فرمائش کی دکاندار کہنے لگا۔

''دودھ نہیں ہے''

میں نے دودھ سے بھری کڑاہی کی جانب اشارہ کیا تو بولا۔

''کھیر چاہیے۔بیٹھو دیتا ہوں۔''

ایک استعمال شدہ کٹورے میں اُس نے تھوڑا سا پانی ڈال کر اُسے صاف کیا دوبارہ پانی ڈال کر

مزید پاک کرنے کی بجائے اس میں دودھ ڈال کر مجھے دے دیا۔ اسپرین کی گولیاں منہ میں رکھیں آدھا دودھ پی کر باقی چھوڑ دیا۔ پیسے دیئے اور واپس ہوٹل آ گیا۔ دوسرے روز ہوٹل کا بل ادا کرنے کے بعد اگلے سفر پر روانہ ہو گیا۔ بخار سے کمزوری ہو گئی تھی۔

کلاس فیلو

مظفر گڑھ جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ بخار کے علاوہ جسم میں درد بھی تھا۔ لیہ میں اُترنے کی بجائے بس میں ہی بیٹھے رہنے کو ترجیح دی اور مظفر گڑھ کا ٹکٹ لیا۔ ایک کلاس فیلو کی دکان کا پتہ کالج ڈائریکٹری میں دیکھا، دریافت کرتا اُس کی دکان تک پہنچ گیا۔ ارادہ تھا کہ رات اُس کے ساتھ بیٹھ کر گپ لگانے سے پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ وہ تھوڑی دیر قبل ہی دکان پر آیا تھا کالج سے فارغ ہو کر اپنے والد صاحب کی دکان پر کام کر رہا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ دکان کے اندر بٹھایا۔ کوک کی ٹھنڈی بوتل منگوا کر پینے کو دی۔ اور مجھے اپنا سامان سٹور کے اندر ایک طرف رکھ دینے کا کہا۔ دھوپ کی کالی عینک لگائے اٹیچی کیس اُٹھائے اندر چلا گیا، سٹور میں اندھیرا کچھ زیادہ محسوس ہوا، عینک اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لی۔ اب سٹور میں روشنی کا اضافہ ہو گیا۔ چند لمحے آنکھیں بند کر کے سٹور کے اندر کھڑا رہا، جب آنکھیں کھولیں تو ہر چیز نظر آنے لگی۔ میں نے عینک کو ایک گتے کے ڈبے پر رکھ دیا۔ اٹیچی کیس کو دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور دروازے کے پیچھے محفوظ طریقے سے رکھا، تا کہ وہ سٹور میں کسی قسم کی رکاوٹ کا باعث نہ بنے۔ باہر آ کر اپنا ہینڈ بیگ بھی اُٹھا لایا۔ اُسے اٹیچی کیس کے اوپر رکھ دیا۔ لیکن اپنا چشمہ ڈبہ سے اٹھانا بھول گیا۔ کچھ دیر گپ لگانے کے بعد کلاس فیلو نے اتنی دور آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے اسے بتایا کہ پنجاب کی سیر کو نکلا ہوں اس کے بعد سندھ جانے کا اردہ ہے۔ میرا کلاس فیلو مظفر گڑھ کی قابل دید چیزوں کی رہنمائی کے لیئے میرے ہمراہ ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ فلاں مسجد کی بیرونی اور اندرونی دیواوں پر پارہ لگے شیشے ایک خاص زاویہ پر لگے ہیں۔ وہ رات کو مسجد اور گلی کی روشنی میں اضافہ کرتے ہیں، اور اشارہ سے بتایا کہ وہ شہر کے اس محلّہ میں ہے۔ ایک افغان اولیا کا مزار اسی بازار کے آخر میں تھا۔ اس تعارف کے بعد وہ مجھے خدا حافظ کہہ کر دکان کی جانب لوٹ گیا۔

میں افغان اولیا کے مزار کی جانب چل دیا۔ بازار کافی کھلا تھا۔ مظفر گڑھ کی دُھوپ

میں تپش زیادہ تھی۔ایک دکان دار نے گاہکوں کو دھوپ سے بچانے کے لیئے دکان کے باہر کپڑے کا سائبان لگا رکھا تھا۔جس کو دیکھ کر اپنا کالا دھوپ کا چشمہ یاد آ گیا۔وہ تو سٹور میں رہ گیا تھا۔میں اُلٹے پاؤں دکان پر آیا۔میرا کلاس فیلو وہاں سے جا چکا تھا وہاں اُس کے والد صاحب اور اُن کا ایک ملازم کام میں مصروف تھے۔میں نے انہیں اپنا تعارف کروایا اور بتایا کہ سٹور میں ڈبے کے اوپر عینک رہ گئی ہے وہ لینے آیا ہوں۔انہوں نے کہا۔

''بیٹا جا کر اُٹھا لو''۔

سٹور میں گیا تو وہاں عینک نہ تھی۔وہیں سے آواز لگائی۔

''چچا جان عینک تو ڈبہ پر نہیں ہے۔''

کلاس فیلو کے والد صاحب نے ملازم سے دریافت کیا۔

''پانچ منٹ پہلے عینک وہاں رکھی تھی اب کہاں ہے''

''میں اندر ضرور گیا ہوں لیکن میں نے عینک نہیں دیکھی۔''

کلاس فیلو کے والد صاحب نے تُرش لہجے اور تیز نظروں سے ملازم کی جانب کئی بار دیکھا پھر اسی لہجے میں اس سے مخاطب ہوئے۔

''میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے وہاں رکھی دیکھی ہے۔میں نے اسے نہیں چھیڑا کہ جس کی ہو گی آ کر اٹھا لے گا۔تم کہتے ہو کہ وہاں نہیں ہے۔دیکھو آگے پیچھے گری ہو گی مل جائے گی''۔

لیکن ملازم نے وہی مختصر سا جواب پھر بڑے اعتماد سے دیا۔

''میں نے نہیں دیکھی ہے اور نہ ہی عینک وہاں کہیں گری پڑی ہے۔''

کلاس فیلو کے والد صاحب نے نوکر کی بات پر عدم یقین کا اظہار کرتے ہوئے سر کو جنبش دی اور غُرا کر بولے۔

''کہاں ہے جا کر دوبارہ دیکھو وہیں گری مل جانی چاہیے۔آگے پیچھے گری ہو گی مل جائے گی۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے کلاس فیلو کے متعلق دریافت کرنے پر انہوں نے فرمایا۔

''وہ ایک ضروری کام سے ملتان گیا ہے۔کل آئے گا۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ میری عینک لیکر ملتان چلا گیا ہے۔اب رات رُکنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

خاموشی سے سامان اُٹھایا اور لاری اڈہ چلا گیا۔ملتان جانے والی بس تیار کھڑی تھی اسی میں بیٹھ گیا۔مظفر گڑھ شہر سے ملتان تک سڑک کے دونوں جانب روئی کے کھیتوں میں عورتیں اور مرد کام کرتے نظر آئے۔عورتوں نے چادر کو ایک جانب کمر سے باندھ رکھا تھا اور دوسری جانب چادر کو کونے سے باندھ کر سر پر اٹکایا ہوا تھا۔اس طرح ایک جھولی بن گئی تھی۔روئی بوٹے سے اتار کر اس میں ڈالتی جاتیں تھیں۔ہر کھیت کے کونے پر ترپال بچھی تھی۔عورتیں اور مرد روئی چن کر اس پر ڈھیر کر رہے تھے۔

ملتان پہنچا بسوں کا اڈہ قبرستان میں قائم تھا اُس کے آخر میں ہوٹل بنا تھا۔ایک منزلہ ہوٹل مستطیل شکل میں تھا۔لمبائی میں بیس پچیس کمرے تھے۔میں اسی ہوٹل میں رک گیا۔یہ ہوٹل کسی بزمِ ادب کے نام سے موسوم تھا۔یہاں پر شاعر اور دیگر لکھاری حضرات ہی ٹھہرتے تھے۔ہوٹل میں انتہائی مناسب کرایہ پر کمرے دستیاب تھے۔اسی ہوٹل میں کھانا کھایا اور سو گیا۔صُبح اٹھ کر ملتان کے مشہور زمانہ قاسم قلعہ پر جانے کے لیے ٹانگہ میں بیٹھا۔کوچوان النگ النگ کا شور کر رہا تھا میں نے اسے کہا کہ مجھے قلعہ پر جانا ہے،بولا۔

''سائیں بیٹھو وہیں چلیں گے۔''

اکثر مقامات پر قلعہ کی بیرونی دیوار کی اونچائی پچاس فٹ سے زیادہ تھی۔سکندرِ اعظم کے حملہ کے وقت ملوئی قبیلہ نے اس قلعہ میں پناہ لی تھی۔قلعہ کی اس دیوار کی جانب گیا جہاں سے سکندرِ اعظم نے قلعہ کی دیوار کو عبور کیا تھا۔اس جگہ کی دیوار سب سے بلند تھی۔اس عمل کی تصدیق کی تختی بھی وہاں لگی تھی۔ابتدا میں یہ قلعہ ملوئی قبیلہ کے نام سے مشہور تھا۔بعد میں اسے قلعہ کوہنہ کا نام دیا گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد پر کمپنی نے قلعہ پر ایک باغ تعمیر کیا اس قلعہ کا نام قلعہ کہنہ کی بجائے کمپنی باغ رکھ دیا گیا۔تقسیم ہند کے بعد اسے مشہور زمانہ مسلم جرنیل محمد بن قاسم کے نام پر قلعہ قاسم باغ کا نام دیا گیا۔

قلعہ کے سب سے اونچے کنارے پر حضرت رکن عالم کا مزار ہے۔وہاں پر حاضری دی۔ یہ مزار قلعہ کے گنبد کی طرح گول اور تین منزلوں پر مشتمل ہے۔پہلی منزل کُھلی دوسری ذرا تنگ اور تیسری پر ایک گنبد ہے۔عمارت کو مزید مضبوط کرنے کے لیے پہلی منزل کی دیواروں کے ساتھ

چھوٹے چھوٹے بُرج ھیں۔ ہر چھوٹے برج کے اوپر مزید ایک چھوٹا پندرہ سے پچیس انچ قطر کا گنبد ہے ۔مزار کے اندر دو بڑی قبریں ھیں۔ باہر بیٹھے ایک خادم سے دریافت کیا کہ کونسی قبر حضرت رکن عالم کی ہے۔اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے مزید ان کی آمد اور ان سے متعلق دیگر سوال کیے۔لیکن اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے مزید سوالات سے بچنے کے لیے اس نے میرے سامنے ایک میلی کچیلی چھٹی کاپی رکھ دی۔ تا کہ میں اپنے تاثرات اس میں تحریر کر دوں اس کاپی کے ساتھ ایک کالی پنسل بندھی تھی ۔ میں نے بھی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اپنے تاثرات اور خواہشات کا ذکر کر دیا۔

ملتان کے متعلق ''گرد گرما گدا و گورستان'' مشہور ہے۔نہری نظام نے گرد تو ختم کر دی ہے۔البتہ گرمی اسی شدت کی ہے۔طلوع آفتاب کے ساتھ ہی گرمی کا احساس ہونے لگ گیا۔ دیواریں دن کے دس بجے ہی گرم ہوگئیں۔ملتان شہر میں مزاروں کی بھرمار دیکھی ۔گدا اور گورستان دونوں ہی دیکھنے کے لیے کافی تعداد میں ملے ۔اندرون شہر کے علاوہ ،نئی آبادی کی ہر گلی محلّہ کے ساتھ ایک پرانا قبرستان جڑا ہے۔ پرانے قبرستانوں میں بہت کم قبریں پختہ نظر آئیں۔ گدا زیادہ تر مزاروں پر بیٹھے دیکھے اکثر مرد اور عورتیں کالے لاچہ پہنے تھیں۔ شاہ شمس تبریزی کا مزار اندر سے تو کافی صاف ستھرا تھا۔ روشیں قیمتی ٹائیلوں سے بنی تھیں۔البتہ صحن کی ہر اینٹ اور ٹائیل تیل سے لتھڑی تھی۔ فضا میں تیل کی خوشبو بہت تھی۔ میں نے ایک متولی سے اس کی وجہ پوچھی تو وہ کہنے لگا۔ کہ شاہ شمس تبریز کا سالانہ عرس چند روز پیشتر ہی ختم ہوا جس کی وجہ سے تیل کی یہ خوشبو ہر جانب پھیلی ہے۔

ملتان میں چھوٹے بازار تو کافی ھیں۔لیکن مین بازار بہت سے بازاروں پر مشتمل ایک لمبا بازار ہے ۔ملتان شہر میں تانگے کے اڈے بھی کچھ زیادہ ہی دکھائی دیئے ۔شہر میں عطر اور خوشبودار تیل اور اونٹ کے چمڑا پر نقش و نگار والے لیمپ شیڈ کی دکانیں بھی کافی تعداد میں ہیں ۔ ملتان شہر میں تین چار قسم کی زبانیں سُننے میں آئیں کبھی اردو دان نظر آتا تو کبھی کوئی رُہتک کی زبان میں بات کرتا دکھائی دیتا۔کبھی دو لوگ سرائیکی زبان میں بات کر رہے ہوتے ۔اکثر لوگوں کی باتیں سمجھ میں نہ آتی۔ میں سوچ رہا ہوتا کہ یہ سرائیکی میں بات کریگا لیکن جواب ملنے پر خلافِ توقع رہتک کی زبان میں جواب ملتا۔سرائیکی لوگوں کا طرزِ تکلم بڑی مٹھاس والا تھا۔تمام لوگ اردو سمجھ

اور بول سکتے ۔میں ایک ہوٹل میں چائے پی رہا تھا کہ خوش قسمتی سے ایک نیا شادی شدہ جوڑا ساتھ والی ٹیبل پر آ بیٹھا۔میاں بیوی دونوں آہستہ آہستہ بات کر رہے تھے۔لیکن مجھ تک ان کی بات پہنچ رہی تھی ۔ بیوی نے بے تکلفانہ انداز میں خاوند کو مخاطب کیا۔

''میں تساں کوں کج گال آکھن چاہندی آں مندے تے نہ کڈ ہیسوں''

(میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتی ہوں آپ ناراض تو نہ ہونگے۔)

''ہاں ڈس کے آہڈی ایں''

(بات کرو کیا کہنا چاہتی ہو)

''ادی کوں تے نہ ڈسیوں''

(بڑی بہن کو تو نہ بتاو گے)

''تیں کوں ادی کج اکھیائے''

(تمہیں بڑی بہن نے کچھ کہا ہے)

انہیں شک ہوگیا کہ میں ان کی باتیں غور سے سن رہا ہوں۔ وہ بات مکمل کیئے بغیر جلدی سے اُٹھ کے چلے گئے۔

رات بھی اُسی ہوٹل میں قیام کیا اور اگلی صبح خانیوال جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ میرا ہوٹل ملتان کے لاری اڈہ کے قریب تھا وہاں پیدل چلا گیا۔ایک بس پر خانیوال کا بورڈ نصب تھا اُسی میں بیٹھ گیا۔بس نے ملتان سے دس میل طے کرنے کے بعد جی ٹی روڈ کو خیر باد کہہ دیا۔اور کچی سے ذرا بہتر چھوٹی سڑک کا سفر اختیار کر لیا۔

یہ مقامی بس راستہ میں آنے والے تمام چھوٹے چھوٹے قصبوں کے اندر سے ہوکر جا رہی تھی۔ان قصبوں میں خال خال بڑی دکانوں کے علاوہ چھوٹی ہٹیاں تھیں۔ان چھوٹی دکانوں کے باہر خام روئی کا ڈھیر تھے۔عورتیں خام روئی لیکر دکان پر آتیں ، دکاندار اندازہ سے اس کی قیمت متعین کرتا اور اس کے عوض عورت کو سودا دیتا۔

ہر چھوٹے شہر، قصبے میں بس کا کنڈیکٹر گاڑی کے سامنے کھڑا ہوکر' کھانیوال، کھانیوال' کا ورد شروع کر دیتا۔ قصبے میں تھوڑی دیر رکتے ، چند مسافروں کو لے کر قصبے سے باہر نکلتے۔ڈرائیور ہر دوسرے تیسرے چھوٹے شہر، قصبہ میں چلا جاتا، پیشتر اِن ہی چھوٹے قصبوں کی سواریاں تھیں۔

خیر میرا تو مقصد ہی پنجاب کی سیر تھا۔لوگوں کی طرزِ زندگی دیکھنے اور گفتگو سننے کا موقع مل گیا۔اگلا سٹاپ خانیوال تھا۔بس رینگتی رینگتی واپس جی۔ٹی روڈ پر چڑھ کر دوڑنے لگی۔یوں ملتان سے تیس میل کا سفر دو گھنٹہ میں طے کیا۔جلد ہی ہم خانیوال کے ریلوے پھاٹک کو کراس کرنے والے تھے کہ پھاٹک والے نے سرخ جھنڈی دکھا دی اور پھاٹک کو بند کرنا شروع کر دیا۔خیال آیا کہ خانیوال تو کنڈیاں جیسا ایک جنکشن ہے۔کیوں نہ ٹرین سے آگے بڑھا جائے۔میں نے کنڈیکٹر سے اٹیچی کیس اُتارنے کا کہا۔اُس نے جلدی سے چھت پر سے بغیر ہچکچاہٹ کے دے دیا۔میں وہاں سے سیدھا پلیٹ فارم کی جانب بڑھا۔

باب ششم

ایک قلی

چار چمکتی کالی لکیریں پلیٹ فارم کی جانب راہنمائی کر رہی تھیں۔دائیں لائن کے درمیان سے آگے بڑھنا شروع کیا۔درمیان میں لکڑی کے سلیپر پر چلنا ذرا مشکل تھا،قدم کو لمبا کرنا پڑتا۔ابتداء میں ہر سلیپر کے درمیانی فاصلہ کے مطابق اپنا قدم بڑھاتا گیا۔چند قدم ہی چلا تھا کہ لمبے ڈگ بھرنے مشکل ہو گئے۔پاؤں سلیپر کے درمیانی پتھروں پر رکھنا شروع کر دیے۔پتھروں پر چلنے سے رفتار میں کمی اور تھکن میں اضافہ ہو گیا۔ریلوے لائن کو چھوڑ دیا اور دونوں لائنوں کے درمیان تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔اس وقت تک دھوپ میں تیزی آ چکی تھی۔ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس اور کندھے پر ہینڈ بیگ کے ساتھ چلنا مشکل ہو گیا۔اٹیچی کو دوسرے کندھے پر رکھ لیا اور دوڑنا شروع کر دیا۔دائیں کندھے پر اٹیچی کیس کی وجہ سے سورج کی شعاؤں سے تو چھٹکارا مل گیا لیکن کندھوں پر غیر متوازن بوجھ کافی تکلیف دہ تھا،چند قدم چلنے کے بعد پٹھوں میں درد محسوس ہونا شروع ہو گیا۔اتنے میں پیچھے سے ٹرین کی آواز آنا شروع ہو گئی،دوڑ کر دوسری جانب والی پٹڑی کو بھی عبور کر گیا تاکہ ٹرین کے گزرنے سے ہوا کے دباؤ کا اثر مجھ پر نہ ہو۔اِس سے پہلے کیمل پور میں یہ تلخ تجربہ ہو چکا تھا،آج پھر وہی صورت تھی میں عقب سے آنے والے انجن سے ڈر گیا۔میں ڈر میں ریلوے کی دوسری لائن سے بھی دس گز دور جا کر کھڑا ہو گیا۔

گاڑی کی رفتار ہر لمحہ سست ہوتی گئی۔نزدیک پہنچ کر گاڑی پلیٹ فارم کی جانب بڑھنا شروع ہو گئی۔تیز چلنے کی بناء پر پسینہ آ گیا لیکن گاڑی پر سوار ہونے کی خواہش پر قلی کی طرح اٹیچی کیس کو سر پر رکھا اور دوڑنا شروع کر دیا۔میں نے ننگے سر پر اٹیچی اُٹھا رکھا تھا جو ہتھوڑے کی طرح

سر پر لگتا۔ ہر جھٹکے سے پہلے میں سر کو نیچے کر لیتا۔ لیکن اس طرح میں چند قدم ہی دوڑ سکا۔ گاڑی کے اندر سے ایک منچلے نے آواز لگائی۔

''چھٹ کر شا بانہیں تے رہ ویسوں۔''

یہ آواز سُن کر میں ایک طرف کھڑا ہو گیا اور گاڑی کو دیکھنا شروع کر دیا کہ شاید وہ میرے سامنے ہی رُک جائے۔ لیکن گاڑی کا آخری ڈبہ بھی گزر گیا، پلیٹ فارم کافی لمبا تھا پھر بھی انجن پلیٹ فارم سے دوسو گز آگے جا کر رُکا۔ میں نے تیز تیز قدموں سے پھر چلنا شروع کر دیا اور ٹرین کے آخری ڈبہ تک رسائی حاصل کر لی۔ خواہش ہوئی کہ اسی آخری ڈبہ میں سوار ہو جاؤں لیکن دروازہ پر کافی رش تھا۔ میں نے اگلے ڈبہ میں جانے کی بجائے ریل پر سوار ہونے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔

پلیٹ فارم پر ایک بینچ پر بیٹھ گیا سانس پھول رہا تھا۔ پیاس کا احساس ہوا۔ ایک نلکے پر گرم گرم پانی کو ہی نعمت جان کر پیا۔ پانی پینے اور بینچ پر تھوڑی دیر ستانے کے بعد خانیوال ریلوے سٹیشن سے باہر نکلا۔ تانگہ پر سوار ہو کر لاری اڈے آیا۔ ایک بس پاکپتن کے لیے تیار کھڑی تھی اسی میں سوار ہو گیا۔

عصر کے قریب پاکپتن پہنچا حضرت بابا فرید شکر گنج کے مزار پر جانے سے پہلے چائے پینے کے لیے ایک ہوٹل پر بیٹھ گیا۔ پاس بیٹھے ایک گاہک سے اپنا تعارف کروانے کے بعد اس سے سوال کیا۔

''اس علاقہ میں پاکپتن کی طرح اور ٹیلے بھی ہیں۔ کوئی اور شہر بھی اسی طرح کے کسی ٹیلہ پر واقع ہے''۔

اس نے بتایا کہ پاکپتن اصل میں پرانے شہر اجودھن پور پر تعمیر ہوا ہے اکثر مکانوں کی بنیادوں کی کھدائی کے دوران پرانے زمانے کے سکے اور برتن ملتے ہیں۔

جب بابا فرید یہاں تشریف لائے تو دریائے ستلج اجودھن پور کی دیواروں کو چھوتا ہوا گزرتا تھا۔ بابا فرید نے اپنی رہائش دریا کے کنارے ہی اختیار کر لی اور اسلام کی ترویج میں مصروف ہو گئے۔ ظلم کے ستائے اور سچائی کی تلاش میں سرگرداں لوگوں نے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ معتقدین کی تعداد میں اضافے کے پیش نظر کشتی والوں نے اپنا پتن آپ کی رہائش کے قریب ہی بنا لیا۔ اجودھن پور کے پاس بنائے گئے نئے پتن کا نام پاک پتن رکھ دیا گیا۔ اگلے سال

ہی دریائے ستلج نے اپنا رخ تبدیل کر لیا۔ لیکن اس شہر کا نام اجودھن پور کے بجائے پاک پتن مشہور ہو گیا۔ میں نے مزید سوال کیا۔

''بابا فرید کے نام کے ساتھ شکر گنج یا گنج شکر کا لقب کیوں ہے؟''

وہ بولا۔

''ایک دفعہ گنے کی فصل کسی بیماری کی وجہ سے تباہ ہو گئی۔ ہندو بادشاہ نے فرمائش کی اگر آپ کا خُدا سچا ہے تو شہر پر شکر کی بارش کرواؤ۔''

بابا فرید نے حکم دیا۔

''پہلے اپنے گھروں اور گلیوں کو دھو کر صاف کرو یہ تمام ناپاک ہیں انہیں پاک کرو۔''

جن لوگوں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی ان کے گھر پر سحری کے وقت شکر کی بارش ہوئی۔

اس نسبت سے گنج شکر کا لقب آپ کے نام کے ساتھ منسلک ہو گیا۔

ہوٹل والے سے رات کو ٹھہرنے کے لیے کرایہ کی چارپائی کا دریافت کیا، اس نے کہا کہ مل جائے گی۔ اپنا اٹیچی کیس اس کی جانب بڑھایا کہ یہ رکھو میں دربار سے ہو کر آتا ہوں۔ اس نے اٹیچی تولنے کے انداز میں پکڑا۔ وہ عام اٹیچی کیس سے بڑا اور مضبوط لکڑی کا بنا تھا جس وجہ سے وزنی بھی کافی تھا۔ ہوٹل والے نے ذرا توقف سے بکس کو اپنے پیچھے رکھ لیا۔ مجھے اُس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار دکھائی دیئے۔ میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اور دربار کی جانب چل دیا۔ چند قدم ہی گیا تھا کہ پیچھے سے ہوٹل کے مالک نے دوڑ کر مجھے بازو سے پکڑ لیا اور ہوٹل واپس چلنے کا کہا میں سخت پریشان ہو گیا۔ حیران تھا کہ اس کو کیا غلط فہمی ہو گئی ہے۔ وہ تحکمانہ انداز میں بولا۔

''کھول اپنا اٹیچی اور مجھے چیک کراو کہ اس میں کیا ہے''۔

میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جیب سے چابی نکالی اور اٹیچی کھولا۔ ہوٹل والے نے کپڑوں کو چیک کیا اس میں تو کچھ بھی نہ تھا۔ اُسے اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے مجھ سے کہنے لگا بھائی معاف کرنا کل کی بات ہے سامنے کے ہوٹل میں ایک شخص زیارت کے لیے آیا اس نے بھی آپ کی طرح ایک کپ چائے پی اور رات ٹھہرنے کے لیئے چارپائی بک کی اور اپنا بکس ہوٹل میں رکھ کر دربار پر سلام کرنے چلا گیا اور مغرب تک واپس نہ لوٹا۔ اس کے بکس کو کھولا گیا تو اس میں ایک بچے کی لاش تھی۔

بڑی کوفت ہوئی کہ بلا وجہ اس نے شک کیا۔ دربار سے واپس لوٹنے پر بے عزتی کا احساس زیادہ تھا۔ ہوٹل والے سے کوئی بات نہ کی بکس اٹھایا اور لاری اڈے کی جانب چل دیا۔

جمعداروں کی بارات

لاری اڈے پر تمام بسیں ایک جانب کھڑی تھیں دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ کوئی بس کسی بھی جانب نہیں جا رہی۔ سنسان اڈا پر میں اسی حالت میں کھڑا آئندہ کا لائحہ عمل سوچ رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آتی دکھائی دی۔ اس پر اوکاڑہ کا بورڈ لگا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے بس کو روکا، بس تھوڑی دُور جا کر رُک گئی۔ میں دوڑ کر بس تک گیا، کنڈیکٹر نے میرا اٹیچی کیس لے کر چھت پر رکھ دیا۔ کنڈیکٹر نے اپنے ساتھ والی سیٹ خالی کروا کر بیٹھا دیا، میں نے کہا مجھے اوکاڑہ جانا ہے، وہ بولا۔

''ہم امین آباد تک جا رہے ہیں، عارف والا وہاں سے چار کوس آگے ہے۔''

''وہاں کوئی ہوٹل تو ہوگا''

''معلوم نہیں ہوسکتا ہے کوئی ہو۔''

میں نے سوچا کہ چلو اک نیا شہر ہی دیکھا جائے ابھی میں کنڈیکٹر سے بات کر ہی رہا تھا کہ آگے بیٹھے ایک شخص نے للکار کر مجھ سے کرایہ طلب کیا۔

''کرایہ دے اوئے۔'' (کرایہ دو)

''کتنے پیسے دوں۔''

''پونے ترے روپیے اُوے'' (پونے تین روپے)

''پاکپتن سے اوکاڑہ کا کرایہ سوا دو روپے ہے آپ مجھے عارف والا سے بھی چار میل پیچھے اُتار رہے ہیں اور کرایہ اوکاڑہ سے بھی آگے کا مانگ رہے ہیں یہ کیوں؟''

اتنے میں آگے دائیں جانب بیٹھی ایک سواری بولی۔

''اوے توں سدی طراں کرایہ دینا ایں کہ میں اُٹھاں'' (تم آرام سے پیسے دیتے ہو کہ میں اُٹھ کر زبردستی لے لوں)

''اچھا دیتا ہوں ناراض کیوں ہو رہے ہو۔''

''ٹکٹ کاٹو۔''

اتنے میں اس سے بھی آگے بائیں جانب بیٹھی ایک اور سواری اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ ایک پہلوان محسوس ہُوا۔ وہ بولا

''باؤ چلاکیاں نہ ساڑھ، تے سدی طراں پیسے کڈھ'' (بابو صاحب زیادہ ہوشیار نہ بنو اور آرام سے پیسے دے دو)

آگے بیٹھا ایک اور شخص گرجدار آواز میں بولا

''ٹکٹ شکٹ کوئی نہیں پیسے کڈھ'' (ٹکٹ کوئی نہیں پیسے نکالو)

میں بہت پریشان ہُو گیا کہ مجھ سے ایسا کیا گناہ سرزد ہوگیا ہے کہ بس میں بیٹھی ہر سواری مجھ سے خفا ہے۔ اسی سوچ میں تھا کہ میرے پاس بیٹھے کنڈیکٹر نے کھڑے ہو کر سواریوں سے کہا۔

''انسان بنو جب آپ لوگوں نے اسے بٹھا ہی لیا ہے۔ تو اَب بات تو تمیز سے کرو۔''

اور مجھ سے مخاطب ہوا۔

''باؤ جی ایہ جمعداراں دی جنج آمین آباد جا رہی ہے۔ اساں ایناں کولوں پوری بس دا آن جان دا کرایہ لتا ہے۔ ہن اے تو ڈے کولوں آن جان دا کرایہ منگدے نے۔''

(بابو جی یہ بھنگیوں کی بارات، امین آباد جا رہی ہے۔ ہم نے ان سے آنے جانے کا کرایہ لیا ہے اب یہ آپ سے آنے جانے کا کرایہ مانگ رہے ہیں۔)

میں تمام بات سمجھ گیا اور ڈبل کرایہ دے دیا۔

بس امین آباد کے سٹاپ پر پہنچ چکی تھی بارات کے ڈھولچی نے جلدی سے اُتر کر اپنے ڈھول پر زور سے تھاپ لگائی اور بارات جلدی سے چھلانگیں مار کر اتری۔ کنڈیکٹر نے جلدی سے بس کی چھت پر چڑھ کر میرا اٹیچی کیس چھت سے لٹکایا۔ وہیں سے بس کی باڈی پر ایک زور کا تھپڑ مار کر ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کو موڑا۔ اس سے پیشتر کہ میں کچھ سوچ سکتا۔ بارات اور بس دونوں اپنی اپنی منزِل کی جانب روانہ ہوگئے۔ میں سڑک پر اکیلا ہی کھڑا رہ گیا۔ میں دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ بس کنڈکٹر نے بڑے وقت پر میری مدد کی، بھنگیوں سے میری جان چھڑائی۔

فقیرنی کی مہمان نوازی

اتنے میں ایک بس پاکپتن کی جانب سے آتی دکھائی دی میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ چلو کم سے کم عارف والا تک تو جاسکوں گا۔ میں نے بس کو رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ ہارن بجاتی موڑ کاٹ کرآگے بڑھ گئی۔بس کا نہ رکنا میرے لیئے پریشانی میں اضافہ کا سبب بن گیا۔ڈوبتا سورج رات کی آمد کی خبر دے رہا تھا۔اس وقت تک سخت تھک چکا تھا۔کھڑا رہنے کی بجائے زمین پر ہی بکس کے ساتھ ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔سائیں سائیں کرتا گھنا جنگل اور سسکیاں لیتے سرکنڈے تنہائی کے احساس کو اجاگر کر رہے تھے۔راجباہ کے کھالے کے چمکتے پانی کی جانب نگاہ دوڑائی اُسے ڈوبتے سورج کی شعاعوں نے سنہرے رنگ میں رنگ دیا تھا۔تنگ موڑ کاٹتی سڑک قد آدم سرکنڈوں کے درمیان گم ہو رہی تھی۔پچھلے بیس دن کے مسلسل سفر نے میرے اعصاب کو پہلے ہی کمزور کر رکھا تھا۔پریشانی کے عالم میں جلدی میں غلط بس پر سوار ہو گیا۔بس میں بیٹھی ،بھنگیوں کی بارات کا بدتمیزی سے پیش آنا ،امین آباد کے بس سٹاپ کی تنہائی اور خاموش ماحول کی پراسراریت نے وحشت میں اضافہ کر دیا۔کسی کتے کے بھونکنے کی بھی آواز نہیں آرہی تھی کہ کسی بستی کی سمت کا اندازہ ہی ہو جاتا۔سوچ میں گم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوا، کہ وہ اس مشکل گھڑی میں میری مدد کرے۔اسی لمحہ ایک پیار بھری آواز آئی۔

''پتر وے پتر کیدی اُڈیک ای ہن تے کوئی گڈی نہیں آنیں۔''

(بیٹا تمہیں کس کی انتظار ہے۔اب تو کوئی گاڑی نہیں آنی۔)

میں نے مڑ کر دیکھا ایک عورت کالی قمیض اور کالا تہمد باندھے راجباہ کی دوسری جانب کھڑی مجھ سے مخاطب تھی۔عورت دوبارہ بولی۔

''پتر کیدی اڈیک ای کیوں گھبرایا ہویا ویں''

(بیٹا کس کی انتظار میں ہو اور کیوں گھبرائے ہوئے ہو)

اِن شفقت اور پیار بھری باتوں نے مجھے کچھ حوصلہ دیا کہ یہ تو ایک ہمدرد قسم کی عورت ہے۔میں نے جلدی سے کھڑے ہو کر عورت کو اپنی بپتا سنادی۔کہ کس طرح میں غلطی سے بھنگیوں کی بارات میں سوار ہو گیا تھا۔بارات کے کسی بھی شخص نے تمیز سے کوئی بات نہیں کی وگرنہ ان سے ہی راستہ پوچھ کر کسی گاؤں میں چلا جاتا۔بس بھی واپس جا چکی ہے۔کوئی اور بس آتی دکھائی نہیں دیتی بکس نہ ہوتا

تو عارف والا پیدل ہی چلا جاتا۔بوڑھی عورت میری بے بسی کی روداد سن کر بولی۔

''رات رہنا ای تے چل وگ آ''

(تمہیں رات رہنا ہے۔چلو میرے پیچھے آجاو)

اس پیشکش کو غیبی امداد جانا۔وہی راجباہ جو مجھے دو منٹ پہلے ایک بڑی نہر دکھائی دے رہا تھا اَب ایک چُھوٹا سا کھالا دکھائی دیا۔جسے میں نے بکس سمیت ایک لمبے قدم سے پار کر لیا۔میرا بکس اس عورت نے مانگا۔میرے انکار پر اس نے کہا۔

''اے مین پھدا۔تینوں وٹاں تے چلنا مشکل تھیسی توں میرے پیچھے وگ آ۔''

(یہ بکس مجھے پکڑا دو کھیتوں کے کناروں پر چلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔تم میرے پیچھے آجاو)

میں نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی۔اٹیچی کیس اسے پکڑا کر اس کے پیچھے ہو گیا۔

امین آباد گاؤں لاری اڈا سے تقریبا ایک کلومیٹر فاصلہ پر تھا۔ماحول میں خاموشی کی وجہ بھی یہی تھی۔گاؤں کی ہر گلی ستر اسی فٹ چوڑی تھی۔گھر پہنچ کر اس نے چارپائی اپنے گھر کے باہر سڑک پر بچھا دی۔ایک تکیہ بھی لا دیا۔میں نے کہا اور کسی چیز کی ضُرورت نہیں گرمیاں ہیں۔خالی چارپائی پر ہی سو جاؤں گا۔

اس عورت کے گھر کے پاس تندور تھا۔عورتیں سر پر پرات اور چنگیر میں روٹیاں رکھے میرے پاس سے گزر رہی تھیں۔میں نے تندور سے منہ دوسری جانب کر لیا تا کہ گذرنے والی عورتوں کو کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔

بوڑھی عورت میرے سامنے آکر زمین پر بیٹھ گئی۔اب اس کا منہ تندور کی جانب تھا۔مجھ سے اس لہجہ میں بات کرنے لگی گویا میں اس کا بیٹا یا چُھوٹا بھائی ہوں۔اس دوران وہ ہر گزرنے والی عورت سے مخاطب ہو کر کہتی۔

''بھینوں ساڈے اج پُروَنے آیئے نے۔''

اور میری جانب اشارہ کرتی۔

''ہک روٹی تے دیندی ونج''

(بہن ہمارے گھر آج مہمان آیا ہے۔ ایک روٹی تو دیتی جاو)

جواب میں ہر عورت یہی کہتی۔

''اساں تے اج پوریاں ای پکائیاں نے''

(ہم نے آج ضرورت کے مطابق پکائی ہیں)

مجھے بڑی شرم آئی کہ اس عورت نے مجھے بھیک مانگنے کا ایک ذریعہ بنالیا ہے۔

میں نے جیب سے پیسے نکالے اور بڑھیا سے کہا۔

''مائی یہ لو پیسے اور دکان سے آٹا لے آؤ اور پکالو۔''

لیکن وہ نہ مانی

''نہیں بچیا سُکھا لا بہہ۔ میں ہن اے روٹی لیاندیاں آں۔''

''مائی میں تو کھانا پاکپتن سے کھا آیا ہوں میرے لیے نہ لانا''

میں نے اس کے سامنے جھوٹ کا سہارا لیا۔ تا کہ میں اس پر کسی قسم کا بوجھ نہ بنوں۔ میں نے تو شام کی چائے بھی نہ پی تھی۔ اس کے باوجود وہ چند خشک لکڑی کی مانند سخت تندوری روٹی کے ٹکڑے اور سادہ پانی میں نمک اور سرخ مرچ ملا کر لے آئی۔ میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے ایک لقمہ دانتوں کے تلے بمشکل توڑا جو آہستہ آہستہ گندم کی روٹی بن گیا۔ اور باقی ٹکڑے اور سالن اسے واپس کر دیا۔ تندور تو ٹھنڈا ہو چکا تھا اُسی عورت نے اپنے بیٹے کو بلایا اُسے کہا۔

''بگلی تے کٹورا گھن ونج تے ودیفہ لے آ''

(بغلی اور کٹورا لیکر جاؤ اور وظیفہ لے آو)

اس نے پیچھے سے آواز دے کر اسے یاد کرایا۔

''ہے کٹورے وچ سلونا بھی منگ لایاویں''

(کٹورے میں سالن مانگ لانا)

وہ لڑکا گیا اور آدھ گھنٹہ کے بعد کپڑے کی بغلی موٹا کیے دونوں ہاتھوں میں ایک بڑا کٹورا پکڑے واپس آیا۔ دونوں ماں بیٹا وہیں زمین پر بیٹھ گئے اور دونوں نے وہیں کھانا کھایا۔ بڑھیا مجھے مخاطب ہو کر بولی۔

''آ بچیا بسم للہ کر۔''

مجھے بھوک تو سخت لگی تھی لیکن میں نے پہلے کی طرح پھر انکار کر دیا۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں ماں بیٹا زمین پر چادر بچھا کر لیٹ گئے۔ ابھی سورج طلوع ہونے میں کافی دیر تھی۔ کہ میں اُٹھ کر

چارپائی پر بیٹھ گیا ایک تار برانڈ کا سگریٹ جو اسی بڑھیا سے خریدا تھا سلگایا اور پینا شروع کر دیا۔ سگریٹ سخت کڑوا تھا تھوڑا سا پی کر پھینک دیا۔

میرا منہ تندور کی جانب تھا۔ میں نے دیکھا کہ دو آدمی سُرخ رنگ کا ریشمی لاچہ باندھے اور اُسی رنگ کا ایک اور لاچہ گلے کے گرد لپیٹے ہاتھوں میں ایک کلہاڑی لیے تیز تیز قدموں سے آ رہے ہیں۔ بڑھیا بھی اُنہیں دیکھ کر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ جب ہمارے پاس سے گزرے، بڑھیا بولی۔

''وے تسیں تے جانجی نیں، کل کڑی ویا گئے سو''

(آپ لوگ تو باراتی ہو جو کل لڑکی بیاہنے گئے تھے۔)

''کڑی رس کے نانکے وت گئی اے۔ تساں کسی کڑی نوں لنگدیاں تے نہیں ڈٹھا''

(لڑکی ناراض ہو کر ننہال چلی گئی ہے۔ تم نے کسی لڑکی کو گزرتے تو نہیں دیکھا۔)

''اُچی سرگی ویلے ترے بندھے لنگے سن جناں وچوں ہک کڑی وی سی ول کھٹ چا نہر ول وت گئے سن۔''

(سحری سے بہت پہلے تین لوگ گزرے تھے ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ جلدی جلدی نہر کی جانب جا رہے تھے۔)

''او دریا ٹپ گئے ہوسن۔''

(کیا دریا پار کر گئے ہونگے)

''نا اجے تے او۔ نہر وی نہ ٹپے ہوسن دریا تے ول دُورائے''

(نہیں ابھی تو وہ نہر بھی پار نہ کر سکے ہونگے دریا تو کافی دور ہے۔)

اُن دونوں نے فوراً ہی نہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہی موٹا آدمی جس نے مجھے بس میں کھڑے ہو کر غصہ سے مخاطب کیا تھا۔ اپنے چار پانچ ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے گزرا۔ میں نے راستہ سے ہٹ جانا ہی مناسب جانا۔

گلیاں اور مکان اس وقت تک صاف نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔ بڑھیا سے بکس اور بیگ لیا اور لاری اڈا چلا آیا۔ چلنے سے پہلے میں نے چند سکے جیب سے نکال کر تکیہ کے نیچے رکھے اور سگریٹ کی دونوں ڈبیاں جان بوجھ کر بھول آیا۔ عارف والا کے قریب ہونے کی وجہ سے کوئی بھی بس تھوڑے فاصلہ کے سفر کی سواری لینے کو تیار نہ تھی۔ سب ہی ہارن بجا کر آگے بڑھ جاتیں

آخر دور سے ایک ٹریکٹر آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے روکا۔ اسے اپنا مسئلہ بتایا، اور عارف والا تک لے جانے کے لیے کہا۔ ٹریکٹر ڈرائیور نے مجھے مڈگارڈ پر بیٹھ جانے کا کہا، بکس اور بیگ اس نے فریم کے اوپر رکھ دیا۔ وہ عارف والا ٹریکٹر کی مرمت کے سلسلہ میں جا رہا تھا۔ ٹریکٹر کا مڈگارڈ ٹائروں کی مانند گول تھا۔ جہاں بیٹھنا ممکن نہ تھا کوئی سیٹ یا کوئی ہینڈل بھی نہ لگا تھا۔ جس کا سہارا لے کر کھڑا ہو سکتا۔ میں نے ٹائروں کے درمیان کُھلی جگہ پر لوہے کے راڈ پر پاؤں جما لیے اور مڈگارڈ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ٹائیروں اور مڈگارڈوں کے درمیان جگہ تو کافی تھی تاہم جب ٹریکٹر تیز دوڑتا، ہچکولوں سے اس کا ٹائر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے چھو جاتا اور انگلیوں میں رگڑ سے جلن پیدا ہوتی۔ باری باری ہاتھ باہر نکالتا۔ پاؤں اُکھڑ جاتے تو کبھی ایک ہاتھ کبھی دوسرا اور کبھی دونوں ہاتھ مڈگارڈ کے اندر ڈال مڈگارڈ پر اپنی گرفت مظبوط کر کے اپنا بیلنس درست کر لیتا۔ تقریباً پون گھنٹہ میں ہم عارف والا پہنچ گئے۔ تھوڑا سا عارف والا کے بازار میں گھوما پھرا۔ کوئی خاص چیز دیکھنے میں نہ آئی۔ یوں بھی میں بہت تھک تھا۔ گھر سے نکلے آج انیسواں دن تھا۔

کٹوی

دوپہر کا کھانا ایک ہوٹل میں کھا رہا تھا کہ ایک اور صاحب بھی میری ٹیبل پر کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں ایک سیاح ہوں اور پنجاب کی سیر کر رہا ہوں۔ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے دعوت دی کہ میں پاس ہی چونیاں شہر ہے وہاں ضرور جاوں۔ اس نے بتایا کہ چونیاں میں اسکا افیوں کا ٹھیکہ ہے۔ نماز جمعہ سے پہلے دکان بند کر آتا ہوں۔ دکان کے سامنے ایک ہوٹل ہے کھانا کھا کر دکان کی چھت پر ایک چارپائی رکھی ہے وہیں سو جانا۔ ہوٹل مالک میرا اچھا دوست ہے۔

میں تھوڑی دیر عارف والا رُک کر چونیاں چلا گیا۔ مغرب ہونے کو تھی کہ ٹھیکہ افیون کی دکان پر پہنچ گیا۔ ایک تنگ گلی کے اونچے برآمدے پر ''ٹھیکہ افیون'' کا بورڈ آویزاں تھا۔ ہوٹل بھی سامنے ہی تھا۔ ہوٹل والے سے بات کی اپنا تعارف کروایا کہ افیون ٹھیکہ دار نے مجھے بھیجا ہے۔ یہاں اس کی دکان کی چھت پر ایک چارپائی رکھی ہے وہیں سو جاؤں گا۔ ہوٹل مالک نے کھلے دل

سے مجھے خوش آمدید کہا۔ اٹیچی کیس پکڑ کر اندر کمرے میں رکھ لیا۔ میں ہوٹل کے ہال کمرہ میں ہی بیٹھ گیا۔ اور ملازم کو کھانا لانے کو کہا۔ میز پر بیٹھ کر اپنے ہم جماعت طلباء کی لسٹ نکالی کہ دیکھوں، شاید چونیاں میں کوئی ہم جماعت رہتا ہو ملاقات کر لوں۔ لسٹ میں ایسے لڑکے کا نام تحریر تھا۔ جسے میں اور میرے تمام ہم جماعت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے۔ ہم سب اسے 'کٹوی' (ہنڈیا) کہتے۔ وہ ایک آوارہ منش بدمعاش لڑکا تھا۔ میں نے ہوٹل کے ملازم سے پوچھا۔

''تم اس نقوی نامی لڑکے کو جانتے ہو۔ وہ یہیں کا رہنے والا ہے''

''ہاں جانتا ہوں، ساتھ ہی رہتے ہیں۔ بلاؤں!''

''نہیں کوئی ضرورت نہیں۔''

منہ سے نکلے الفاظ تو واپس نہیں آ سکتے تھے۔ ایسے واقعات خود بخود رونپذیر ہو جاتے ہیں۔ اس میں کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جلد ہی میں نے دیکھا کہ وہ لڑکا نقوی ہوٹل آیا اور مجھے دیکھتے ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔ اب میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس عمل کا ممکنہ ردعمل کیا ہو سکتا ہے۔ میں اب پریشان تھا کہ یہ کیا مصیبت میں نے اپنے لیے کھڑی کر لی۔ آ بیل مجھے مار، کالج میں آخری روز میں نے اس لڑکے کی اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ پٹائی بھی کی تھی۔ میں اُٹھ کر ایک طرف کونے میں دبک کر بیٹھ گیا تاکہ وہ دوبارہ مجھے دیکھ نہ سکے۔ لیکن میرا وہ ہم جماعت نقوی گلی سے گذرا مجھے دزدیدہ نگاہ سے دیکھا اور واپس چلا گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بدچلن لڑکا اب اکیلا نہیں آئے گا۔ ہوٹل کا ملازم میرے لیے کھانا لے آیا، ابھی میں نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ میرا ہم جماعت نقوی اپنے ایک اور ساتھی کے ہمراہ ہوٹل میں آ گیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔

''فاروق بھائی تم یہاں پر کیسے آئے، چلو تم میرے گھر چلو۔''

مجھے اس کی باتوں میں منافقت کی بو آئی۔ تقدیر کی ستم ظریفی کہ آج میں اُس کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے اس سے لاہور کے واقعہ کی معذرت کی۔ نقوی نے اس پر کوئی خاص ردعمل کا اظہار نہ کیا۔ میں ساری بات سمجھ گیا۔ میرا شک اب یقین میں بدل گیا کہ آج نقوی اپنی آخری روز کی پٹائی کا بدلہ لینے کے موڈ میں ہے۔ میں چونیاں میں تن تنہا تھا۔ سمجھ نہ آیا کہ کیا کیا جائے۔ میں اس کے ساتھ جانے کو تیار نہ تھا۔ لیکن وہ ضد کر رہا تھا کہ میں اُس کے ہمراہ اسکے گھر جاوں اور کھانا بھی

وہیں کھاوں ۔ایک انجانا سا خوف میرے دل میں تھا۔خیال آیا کہ ہوٹل والے سے مدد طلب کی جائے۔میں نے نقوی کو کہا کہ میں کھانا کھا رہا ہوں۔آپ کے لیے چائے منگواتا ہوں۔ میں چائے کا آرڈر دینے کے بہانے اُٹھ کر کاؤنٹر پر چلا گیا اور ہوٹل کے مالِک کو مختصراً بتایا، کہ میں نے لڑکے کی کیوں اور کس طرح پٹائی کی تھی۔ ہوٹل کے مالک نے کہا کہ فکر نہ کرو میں بندوبست کر لوں گا۔چائے آئی تو میں نے چائے میں چٹکی بھر نمک ڈالتے ہوئے کہا، کہ چائے پیو اور میرا نمک کھاؤ۔ بدمعاش لوگوں کی ایک خوبی ہوتی ہے۔کہ وہ جس کا نمک کھاتے اِس کو دھوکا نہیں دیتے۔ دونوں میں سے کسی نے میری نمکین چائے کا ایک گھونٹ بھی نہ لیا اور ضد کرتے رہے کہ ہمارے ساتھ چلو۔کافی اصرار کے باوجود میں ان کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہُوا۔میں نے انہیں بتایا کہ میں ہوٹل والے کا مہمان ہوں۔سامنے افیون کا ٹھیکیدار میرا دوست مجھے اس ہوٹل والے کے پاس چُھوڑ کر پتوکی گیا ہے۔کل صُبح جب وہ آئے گا تو میں آپ کے گھر آجاؤں گا۔

ہوٹل کا مالِک میز پر آیا۔اس لڑکے سے بولا۔

’’اٹھ ایتوں تے لیجا اپنا ایں یار نوں۔کل سویرے میں اس نوں تے ٹھیکیدار نوں تیرے پیو دی ہٹی تے لے آساں تے جو کج تساں ادے نال کرنا ہویا تے کرلیا جے۔‘‘

(اٹھو اور اپنے دوست کو بھی ساتھ لے جاو میں صبح اسے اور ٹھیکیدار کو لیکر تمہارے باپ کی دکان پر آ جاونگا۔پھر تم نے اس کے ساتھ جو کرنا ہوا کر لینا)

یہ بات سننا تھا کہ وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے اور پھر ہوٹل کا مالِک کہنے لگا

’’کوئی بات نہیں تم اَب میرے مہمان ہو۔تم میرے گھر چلنا یہ جگہ محفوظ نہیں۔چھت پر سیڑھی کا دروازہ بھی نہیں ہے۔رات کو میرے جانے کے بعد یہ لوگ پھر آجائیں اور ہوسکتا ہے تمہیں نقصان پہنچائیں۔‘‘

رات وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔وہ میرے ساتھ چارپائی لگا کر گلی میں سو گیا۔معلوم نہیں کب نیند آئی اور میں سو گیا۔رات کے پچھلے پہر بارش آ گئی وہ گھر کے اندر گیا اور جلد واپس آ کر بولا کہ چارپائی اُٹھاؤ، بستر لپیٹ کر بغل میں دباؤ اور چلو ہم اندر کمرہ میں چلتے ہیں۔ جب بستر اُٹھایا تو سرہانے رکھی قمیض کی جیب سے میرا شناختی کارڈ زمین پر گر گیا۔کٹوی میرا ہم جماعت صبح کاذب کے وقت بارش سے پہلے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ٹھیکہ افیون کی چھت پر گیا۔ مجھے وہاں نہ پا کر اس

ہوٹل مالک کے گھر آیا۔گلی میں دو چارپائیاں دیکھ کر واپس چلا گیا۔صُبح چونیاں سے بس پکڑی اور سیدھا لاہور آ گیا حالانکہ میرا پروگرام کھڈیاں جانے کا بھی تھا۔لیکن مستقل سفر نے بہت تھکا دیا تھا میں نے پتوکی، رائیونڈ، کوٹ رادھا کشن اور کھڈیاں جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا۔

باب ہفتم

گیسٹ ہاوس

تین دن تک گھر سے باہر نہ نکلا چوتھے دن جب تھکاوٹ دُور ہوئی دنیا کی سیر کا بھوت تو اتر چکا تھا۔ خاموشی سے نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ فزیکل ایجوکیشن کالج کے زمانے میں میرے دوست سید قربان علی شاہ کہا کرتے کہ ڈائریکٹر ایجوکیشن لاہور ریجن چوہدری محمد صادق سے ان کے فیملی مراسم ہیں ان سے متعلق کوئی کام ہو تو بتانا۔

لاہور سے ان کے گھر ڈسکہ پہنچ گیا وہاں اُن دنوں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی شاہ صاحب سے ملاقات ہوئی، دیکھتے ہی اُنھوں نے سوال کیا۔

”کیوں آئے ہو؟ واپس جاؤ۔ شہر میں داخل ہونے اور باہر جانے پر پابندی ہے۔“

میں نے ان کو آنے کی وجہ بتائی۔، تو انہوں نے فوراً ایک کاغذ مجھے دیا اور آنکھیں بند کر کے بولے، کاغذ آگے کرو۔ بند آنکھوں سے اس پر کچھ تحریر کیا آنکھیں کھولیں اور کہا۔

”ڈسکہ کی فضا میں ہیضہ کے جراثیم ہیں۔ ابھی یہاں سے نکل جاؤ اور رات سیالکوٹ کے کسی ہوٹل میں قیام کرنا۔ صبح ہوٹل سے فلاں محلّہ میں گھر جا کر یہ خط بڑے چوہدری صاحب کو دینا۔ نیز احتیاط کرنا یہ رقعہ ڈائریکٹر صاحب کے بڑے بھائی کے نام ہے، اُن کو ہی دینا۔ ان کا ایک بیٹا سیاسی ورکر ہے وہ یہ رقعہ لیکر خط چچا کے نام لکھ دیگا۔ چوہدری صاحب اس کے خط کو پڑھتے بھی نہیں اور ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔“

میں اسی وقت اٹھا اور سیالکوٹ چلا گیا۔ حسب ہدائیت صبح چوہدری صاحب کے گھر چلا گیا خوش قسمتی سے ان کے بڑے بھائی صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ گھر کے باہر کھڑے کسی سے

بات کر رہے تھے۔ رقعہ پڑھ کر دریافت کیا کہ شاہ صاحب کی کیا مجبوری تھی۔ میں نے بتایا کہ آنکھوں کا آپریشن کروایا ہے کل پٹی کھل جائے گی۔ فرمایا، دو روز بعد میں لاہور جا رہا ہوں وہاں مجھے ڈائریکٹر صاحب کے دفتر کے سامنے ملنا۔

میں یہ پیغام لے کر واپس ڈسکہ آ گیا۔ شاہ صاحب کو تمام حقائق سے آگاہ کیا۔ کہنے لگے۔ اب تم لاہور جاو۔ میں خود لاہور صبح دس بجے تک پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ تیسرے روز علیٰ الصّبح ڈائریکٹر ایجوکیشن کے دفتر کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ شاہ صاحب دس بجے سے پہلے وہیں پہنچ گئے۔ ہم نے ایسی جگہ کا انتخاب کیا۔ جہاں سے ہر آنے جانے والے کو دیکھا جا سکتا تھا۔ دو بجے کے قریب دونوں بھائی واکس ویگن میں آتے دکھائی دیئے۔ شاہ صاحب اُٹھ کر سامنے آئے۔ ڈائریکٹر صاحب نے انہیں دیکھتے ہی گاڑی روک لی۔ ڈائریکٹر صاحب نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے ہمیں ساتھ لیا اور کمرے میں چلے گئے۔ علیک سلیک کے بعد شاہ صاحب نے ڈائیریکٹر صاحب کو اپنی آمد کی وجہ بتائی۔

”اس بچے کی ملازمت کے لیے حاضر ہُوا ہوں“۔

چوہدری صاحب نے جواب دینے سے پہلے ایک ڈائری نکالی اور شاہ صاحب کو کہا،

”میرے پاس دو پوسٹیں خالی ہیں۔“

پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”فلاں روز ہم انٹرویو لے رہے ہیں تم اُس دن آ جانا۔“

اور میرا نام بھی اُسی ڈائری میں شاہ صاحب کے نام کے ساتھ لکھ لیا۔

میں مقررہ روز انٹرویو کے لیے دفتر پہنچ گیا۔ میرے تمام ہم جماعت انٹرویو دینے کے لیے آئے۔ اب اگلا مرحلہ نتیجہ کا تھا۔ نتیجے کے انتظار میں دفتر کے چکر لگانے شروع کر دیئے۔ چوتھے دن کلرک نے بتایا کہ فائل آ گئی ہے۔ اور تمہارا نام کامیاب ہونے والوں میں ہے۔ کل آ کر بہاولپور کے آرڈر لے لینا۔

میں وہاں سے سیدھا اپنے بہنوئی عبدالعزیز کے گھر آیا۔ اُس سے پیسے ادھار لئے اور رنگ محل جا کر چند مزید جوڑے سلے سلائے کپڑوں کے خریدے۔ اپوائنٹمنٹ آرڈر لیا اور فیصل آباد والی ہمشیرہ سے ملنے چلا گیا۔ میرے بہنوئی کے والد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ مجھے حسبِ خواہش

سرکاری ملازمت مل گی ہے۔ ابھی تو کالج سے فارغ ہُوا ہے۔ میں اُسی رات چناب ایکسپریس سے بہاولپور چلا گیا۔

دوسری صبح کالج میں پرنسپل صاحب کو اپنی آمد کی تحریری اطلاع دی اور ہیڈ کلرک سے کہا کہ چندروز کے لیے میرے رکنے کا کوئی بندوبست کردیں بعد میں خود انتظام کرلوں گا۔ اس نے کہا کہ فلاں صاحب جو ریاست بہاول پور کے چیف سیکریٹری بھی رہے ہیں۔ انہیں بچے کے لیے ٹیچر کی ضُرورت ہے۔ ان کے پاس مہمان خانے کا بندوبست بھی ہے۔ آپ وہاں چلے جائیں وہیں پر فی الحال قیام کریں۔ بچے کو بھی ایک گھنٹہ پڑھا دینا۔ اس میں کیا حرج ہے۔ اگلے ہفتہ کے دوران مکان دیکھ لینا۔ شام کو کالج سے سائیکل رکشہ لیکر سیٹلائیٹ ٹاؤن کے اے بلاک چلا گیا۔

اس بلاک میں شہر کی اشرافیہ ہی رہائش پذیر تھی۔ تمام بڑے محلات اس بلاک کی زینت تھے۔ ایک کنال کا تو کوئی مکان ہی نظر نہ آیا۔ چار کنال کے محلات اس بلاک کے چھوٹے مکانوں میں سے تھے۔ اس بلاک کی سڑکیں بہت کشادہ تھیں۔ سڑک کے دونوں جانب قطار میں لگے اُونچے اُونچے سرو ہریالی اور خوبصورتی میں اضافہ کررہے تھے۔ سڑکوں کے کنارے پھولوں کی کیاریاں تازہ کھلے ہوئے پھولوں سے لدی تھیں۔ نواب آف بہاولپور کا محل بھی اسی بلاک میں تھا۔ تیس کنال پر محیط محل کی بیرونی دیواریں تقریباً بارہ فٹ اونچی بنی تھیں۔ اِن پر سفید رنگ چمک رہا تھا۔

محل کے گیٹ پر موجود ایک چوکیدار سے چوہدری صاحب کے گھر کا دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں سے تین گلیاں پیچھے مغرب میں چوتھا یا پانچواں مکان ہے۔ رکشے والے کو وہاں تک جانے کا کہا۔ چوہدری صاحب کے گھر کے سامنے اترا۔ بیرونی دیوار صرف چار فٹ اونچی تھی۔ اور جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ میں بنگلہ میں داخل ہونے میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی کُتا اجنبی بُو پا کر حملہ آور نہ ہوجائے۔ لیکن کہیں سے کسی کتے کے غرانے کی آواز آئی نہ کوئی چوکیدار وہاں نظر آیا۔ گھنٹی کے بٹن کو گیٹ کے دونوں ستونوں پر تلاش کیا، لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا۔ ٹوٹا ہوا گیٹ پہلے سے ہی کُھلا تھا اندر داخل ہوگیا۔ ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی شاید کوئی چوکیدار نظر آجائے۔ دائیں جانب ایک کنال کا بڑا لان، جس میں سبز گھاس بڑے سلیقے سے تراشیدہ تھی۔ اِسی لان کے گرد ڈیڑھ فٹ چوڑی اور دو فٹ اونچی باڑھ بھی بڑی سلیقے سے تراشی ہوئی دکھائی دی۔ ہر چار فٹ

کے فاصلے پر چارپائی کے پایہ کی مانند ایک گول نشان بنا تھا۔ برآمدہ کے سامنے ایک چھوٹا سا سبز ٹہنیوں کا محراب بنا تھا۔ جس میں دو آدمی آسانی سے لان میں آجاسکتے تھے۔ ایک جانب ایک کرسی اور ایک بڑی لان کی چھتری رکھی تھی غالبًا کوئی صاحب دھوپ کی تمازت سے لطف اندوز ہو کر جاچکے تھے۔ روش کے دوسری جانب دائیں ہاتھ پر سنگترے کے پودوں پر بلبلیں حملہ آور تھیں۔ میں آگے بڑھا اور برآمدے کے قریب کھڑے ہوکر چوہدری صاحب کو نام سے پکارا۔ اندازہ تھا کہ ریٹائیرڈ چیف سیکرٹری صاحب کے گھر میں ملازمین کی ایک فوج موجود ہوگی کوئی تو آواز سُن کر آہی جائے گا۔ میں نے دیر تک انتظار کیا کوئی آدمی باہر نہ آیا۔

آٹھ فٹ چوڑا برآمدہ مکان کو دو اطراف سے گھیرے تھا۔ برآمدہ زمین سے کافی اونچا تھا۔ برآمدہ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے چھ سات سیڑھیاں عبور کرنی پڑتیں۔ ہر سیڑھی کی اونچائی خلاف معمول زیادہ تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سیڑھیوں کو اس طرز بنانے اور بڑھانے کی وجہ بہاولپور میں صحرائی زہریلے سانپوں کی بہتات ہے۔ برآمدے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے نیچے دیکھ کر ہر سیڑھی پر پاؤں رکھنا پڑتا۔ برآمدے کے ستون گول تھے۔ البتہ ہر ستون کا پایہ مربع شکل کا تھا۔ برآمدے کے دونوں کونوں میں ایک ایک کمرہ بنا تھا۔ برآمدہ کے درمیان ایک جالی کا دروازہ نصب تھا۔ جو مکان کی غلام گردش میں کُھلتا۔ یہ غلام گردش پرانے زمانے کی شاہانہ باقیات میں سے ایک تھی۔ غلام گردش کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ مکان کا اندرونی حصہ دھوپ کی تمازت سے بہت کم متاثر ہوتا اور تمام کمرے نسبتاً ٹھنڈے رہتے۔ شادی بیاہ میں تو خاص طور پر غلام گردش بڑے کام آتی۔ ان غلام گردشوں میں عورتوں کو علیحدہ بٹھانے کا انتظام بھی کیا جاسکتا تھا۔

غلام گردش میں کھلتے اس دروازہ پر میں نے دستک دی۔ کافی انتظار کے بعد ایک بڑھیا نمودار ہوئی اور میرے آنے کا مقصد دریافت کرنے کے بعد واپس چلی گئی۔ اور دو نیم شکستہ آرام کرسیاں لیے دوبارہ نمودار ہوئی۔ اور ہکلاتے ہوئے بولی۔

’’آپ تشریف رکھیں چوہدری صاحب آتے ہیں۔‘‘

یہ دونوں آرام کرسیاں بید سے بُنی تھیں جو کثرت استعمال سے اب اپنی مضبوطی کھو چکا تھا۔ اکثر جگہوں پر بید کا جال ڈھیلا ہوچکا تھا۔ بید درمیان میں جُھک کر فرش کو چھونے والا تھا۔

ایک لمبا دبلا شخص شلوار قمیص پہنے غلام گردش سے پاؤں کو زمین پر پٹختا نمودار ہوا۔ میں نے

اُٹھ کر سلام کیا اپنا تعارف کروایا اور اُسے بتایا کہ کالج ہیڈ کلرک نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اُ
نہوں نے اچھا کہہ کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی دوسری کُرسی پر بیٹھ گیے۔ مجھ سے مخاطب ہوئے۔
''کہاں کے رہنے والے ہو، کب سے ملازمت میں ہو کون سا مضمون پڑھاتے ہو''
ایک ہی سانس میں انہوں نے بہت سے سوال کر ڈالے۔ اس سے پیشتر کہ میں جواب دیتا اُنہوں
نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ بھمبر آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔ میں نے بتایا کہ
میرے نانا وہاں وکالت کرتے تھے وہ آپ کے ہم نام تھے۔ وہ میرے نانا کے شناسا نکلے۔ اُنھوں
نے بتایا انکے والد اور میرے نانا آپس میں دوست بھی تھے دونوں کا تعلق وکالت سے تھا۔ چوہدری
صاحب اُن کی شخصیت سے بڑے مرعوب دیکھائی دیئے۔ اُن کے متعلق انہوں نے بتایا کہ وہ
بڑے ملنسار، خوش گفتار صاحبِ ذوق وکیل تھے۔ اکثر کسی نہ کسی بہانے وکلاء اور جج صاحبان کو گھر
دعوت پر بلاتے رہتے۔ اُنہوں نے پوچھا۔
''ان کی تیسری بیوی سے ایک بیٹا اور بیٹی ہوئی۔ کیا وہ بیٹی آپ کی والدہ ہیں؟''
میں پریشان ہو گیا۔ چوہدری صاحب میرے ننہال کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ میں نے
وضاحت کی کہ میں وکیل صاحب کے چھوٹے بھائی کا نواسہ ہوں۔
وہ فوراً بولے ''اچھا تو آپ شیخ ہدایت اللہ کے نواسے ہیں۔''
میں نے اثبات میں سر ہلایا، بولے۔
''وہ انتہائی شریف آدمی پانچ وقت کے نمازی، پرہیز گار تھے۔ وہ ملازمت کے سلسلے میں بھمبر سے
چلے گئے تھے۔''
اتنا گہرا تعارف ہونے کے بعد اُنہوں نے اپنائیت کے طور پر اپنی بیگم صاحبہ کو بلوا بھیجا۔ ذرا باہر آؤ
میں آپکو پرانے دوست کے نواسے سے ملواتا ہوں۔ اُن کی بیگم صاحبہ سفید چادر لپیٹے نمودار ہوئیں۔
میں احتراماً کھڑا ہو گیا چوہدری صاحب بیگم سے مخاطب ہوئے۔
''اگر تمہیں یاد ہو بھمبر میں میرے، ہم نام وکیل شیخ حبیب اللہ صاحب ہوا کرتے تھے۔''
اُن کی بیگم نے فوراً جواب دیا۔
''کیا وہی شیخ صاحب جو آپ کے والد صاحب کے گہرے دوست اور موسیقی کے بڑے دلدادہ
تھے۔ مجھے یاد ہے، کیا نام تھا، وہ اُس مشہور خوش الحان گائیکہ کو نکاح کر کے گھر لے آئے تھے۔''

چوہدری صاحب نے جواب میں کہا۔
''ہاں ہاں وہی شیخ صاحب، لیکن یہ اُن کے چھوٹے بھائی شیخ ہدایت اللہ صاحب کے نواسے ہیں۔
جو بڑے بھائی کے بالکل برعکس بڑے نمازی اور پرہیز گار تھے''
اتنا مجھے یاد نہیں بیگم صاحبہ بولیں۔ ہم جلد ہی بہاولپور آ گئے تھے۔ سُنا تھا کہ شیخ صاحب نے اپنی
تینوں بیویوں کو طلاق دے دی تھی۔ خود ہی کہنے لگیں کہ بیٹا تم ہمارے بچوں کی طرح ہو اور ہمارے
گھر میں ایک فرد کی حیثیت سے رہو۔
چوہدری صاحب ملازمت کے سلسلہ میں بہاولپور تشریف لائے تھے ریٹائیرمنٹ کے بعد
ان کی سوچ اور اندازِ فکر اور گفتگو میں ریاستی اثر نمایاں تھا۔ اب یہیں سیٹل ہو گئے تھے۔ چوہدری
صاحب کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا بیٹا بنک آف بہاولپور میں کیشئر تھا۔ چھوٹا بیٹا وفاقی سول
سروس مقابلہ کے امتحان کی تیاری کے سلسلہ میں لاہور اپنی خالہ کے ہاں رہائش پذیر تھا۔ جبکہ اُن
کی بیٹی ایک سول جج سے بیاہی تھیں۔ وہ ان دنوں بچّوں کی گرمیوں کی تعطیلات گذارنے اپنے
والد کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اُن کو ایک بچے کیلئے ٹیوٹر کی ضرورت تھی۔
انہوں نے میرے لیئے مہمان خانہ کا ایک کمرہ خالی کروا دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا مربع شکل
کمرہ تھا۔ جس کے اندر ایک نواری پلنگ، ایک چھوٹی گول میز اور ایک کرسی رکھی تھی۔ باتھ روم
کمرہ سے جڑا تھا۔ مغرب سے پیشتر میں اپنا بستر اور دیگر سامان لے آیا چوہدری صاحب کے
بڑے بیٹے نے کمرے کی ترتیب میں میری مدد کی۔ پلنگ کی نوار کو درست کروایا۔ کمرے میں رکھی
کُرسی کو کمرے سے باہر نکلوا کر اُسے بھی تبدیل کرنے کا کہا۔ یہ بوسیدہ کرسی چوہدری صاحب کے
زیرِ استعمال تھی۔ میں نے دوسری کرسی کی فرمائش کی تو اُن کے بڑے بیٹے نے بتایا۔
''گھر میں آرام کُرسی تو صرف یہی ہے۔ جب کبھی ابو باہر لان میں یا برآمدہ میں آ کر بیٹھتے ہیں تو
اسی کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ بڑی بابرکت کرسی ہے ابو جب ڈپٹی سیکرٹری ہوا کرتے تھے تو وہ یہی
دو کرسیاں لاہور سے خرید کر لائے تھے۔ ایک لان میں ہوتی دوسری اُن کے بیڈروم میں۔ اُن کے
بیڈروم والی کرسی مرمت کے لیے دوکان پر گئی ہے، واپس آئیگی تو آپ کے کمرہ میں بھجوا دوں گا۔
آپ ہمارے ساتھ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہیں۔''
کالج انیسویں صدی کے آخری عشرہ میں قائم ہونے والے کالجوں میں سے ایک تھا۔ اس

کا پہلا پرنسپل ایک سپورٹس مین تھا۔اس نے کالج میں ایک جمنازیم بنوادیا۔سپورٹس کا دفتر بھی اسی جمنازیم کے اندر بنا تھا۔ میں اپنا فالتو وقت جمنازیم میں ہی گزارتا ۔ کالج کے پرنسپل صاحب گیارھویں جماعت کوانگریزی پڑھاتے ۔انہونے اپنی دو میں سے ایک کلاس انگریزی پڑھانے کے لیےمیرے حوالے کردی اور فرمایا کہ فی الحال ان کو پڑھا دیا کریں۔

بنک کالج کی ہمسائیگی میں تھا۔ چوہدری صاحب کا بیٹا اور میں اکثر دو پہر کا کھانا اکٹھے کھاتے گپ لگاتے اور گھر آتے ۔ایک روز ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے کہ بنک منیجر ان کے کمرہ میں تشریف لائے ۔ چوہدری صاحب کے بیٹے نے اُن سے میرا تعارف کرواتے ہوئے فرمایا۔

’’آپ ساتھ والے کالج میں بطور پروفیسر اپنی پہلی تعیناتی پر تشریف لائے ہیں۔آپ میرے بھانجا کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں۔آپ کا قیام اور طعام ہمارے ساتھ ہی ہے‘‘

بڑی کوفت ہوئی کہ قیام اور طعام تعارف کا کون سا حصہ ہوتا ہے۔ان دنوں کالج پروفیسر پیسے لیکر ٹیوشن پڑھانا اپنی توہین سمجھتے تھے۔اپنا یہ تعارف سُن کر بڑی سبکی محسوس ہوئی لیکن خاموش رہا کیونکہ یہ سچ تھا۔منیجر صاحب سے تعارف حاصل کرنے کے بعد میں نے بنک میں جانا چھوڑ دیا۔

مجھے کالج میں تیسواں دن تھا کہ ایک پروفیسر صاحب مجھے تلاش کرتے ہوئے جمنازیم والے دفتر پہنچ گئے ، کہنے لگے پرنسپل صاحب نے فرمایا ہے، کہ آپ آج رات کوئٹہ ایکپریس سے ڈگری ٹینس ٹیم کے ہمراہ لاہور جائیں ۔ یہ پیسے میں نے بنک سے نکلوائے ہیں لہٰذا آپ وصول کریں ۔ پیسے کم تھے رسید زیادہ پیسے کی بنوا رکھی تھی۔ میں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ پروفیسر صاحب فرمانے لگے۔کہ باقی پیسے میں پرنسپل صاحب کو دے آیا ہوں، جا کر تصدیق کر لیں۔البتہ جانے سے پیشتر پرنسپل صاحب سے ملتے جانا۔ کچھ دیر بعد پرنسپل صاحب کو ملنے چلا گیا وہ ایک آرام کرسی پر نیم دراز کرکٹ میچ کی کمنٹری سماعت فرما رہے تھے۔فرمانے لگے کہ میرے لیے ایک ٹی سیٹ لاہور سے لیتے آنا اور کچھ کیلے بھی۔ میں خاموش ہو گیا رات کو ٹیم کے ہمراہ کوئٹہ ایکسپرس سے لاہور چلا گیا دوسرے روز میچ کھیلا ہم پہلا میچ ہی ہار گئے دوسرے روز وہاں سے واپس آ گئے ۔ کیلے اور ٹی سیٹ اپنی جیب سے خرید کر لے آیا۔ابھی کمرے میں پہنچا ہی تھا کہ ایک اور پروفیسر صاحب تشریف لائے فرمایا کہ پرنسپل صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ وہاں گیا تو پتہ چلا کہ کشتی کی ایک ٹیم لاہور میچ کھیلنے جا رہی ہے۔ مجھے اُس کے ہمراہ جانا ہے۔ آنے جانے کا خرچ

پہلے ہی کالج کلرک نے نکلوا رکھا تھا۔حسب سابق پیسے کم دیئے اور رسید زیادہ کی لی۔کلرک نے ایک پیغام بھی دیا کہ گھبرائیں نہیں میں بل بنوا کر پاس کروا دونگا۔کلرک سے پیسے لیے لڑکوں سے تعارف کیا اور شام کی گاڑی سے واپس لاہور روانہ ہو گیا۔ جانے سے پیشتر پرنسپل صاحب نے فرمایا میرے لیے ایک ڈنر سیٹ لے آنا یہ تو میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا کہ بازار سے چیزیں خرید کے لاؤں اور مفت پیش کروں۔لاہور سے واپسی پر ڈنر سیٹ لے آیا اور پرنسپل صاحب کے گھر بھجوا دیا۔ابھی میں دفتر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ پرنسپل صاحب نے پھر بلا بھیجا کہ ہاکی کی ٹیم لاہور جا رہی ہے اُس کے ہمراہ ہو جائیں۔ میں نے لاہور جانے سے معذرت کر لی کہ مجھے تھکان کی وجہ سے بخار ہے لہٰذا میں آرام چاہتا ہوں۔ پرنسپل صاحب نے دوبارہ مجھے کبھی کسی ٹیم کے ساتھ نہ بھیجا۔

میں قبل از دوپہر گھر چلا گیا۔ چوہدری صاحب کی بیگم کو جب معلوم ہوا کہ مجھے تھکان کی وجہ سے بخار ہے۔تو وہ کمرہ میں آ گئیں میرے لیے گرم دودھ اور اسپرین منگوا کر دی۔اور پاس ہی کرسی پر گپ لگانے بیٹھ گئیں۔خود ہی بولیں۔

’’مجھے بچے بھو پڑامی کے نام سے پکارتے ہیں‘‘

کہنے لگی۔

’’بچے بہاولپور آسانی سے نہیں پکار سکتے جب کبھی بچے یہاں آتے ہیں تو بات کرتے ہوئے بہاولپور کی بجائے آسانی کے لیے بھوپڑ کہتے ہیں۔‘‘

اس کے بعد وہ ذاتی باتیں پوچھنے لگیں۔کہ آپ کی شادی یا منگنی ہوئی ہے کہ نہیں اور اپنا تعارف کروایا۔

’’بڑے بیٹے کی شادی میں نے اپنی بھتیجی سے کی اور چھوٹے کی لاہور میں خالہ کے گھر کروں گی۔وہ بیٹا ایم۔اے اکنامکس کرنے کے بعد سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔اور آج کل لاہور میں اپنی خالہ کے ہاں مقیم ہے‘‘

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد خود ہی بولیں۔

’’برآمدہ کے دوسرے کمرہ میں میری بھتیجی رہتی ہے۔وہ یہاں کالج میں تھرڈ ائیر کی سٹوڈنٹ ہے۔ اُس کا والد فوت ہو چکا ہے۔ میں اُسے یہاں لے آئی ہوں۔اب اُسے یہاں رکھ کر پڑھا رہی ہوں۔بس اُس کے لیے ایک معقول رشتہ کی تلاش ہے۔‘‘

میں خاموشی سے اُن کی باتیں سُنتا رہا اور انہیں کوئی جواب نہ دیا۔ ایک روز میں کالج نہ گیا اور گھر ہی رُک گیا وہ پھر میرے کمرے میں آ گئیں۔ اپنی ماضی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے بولیں۔

''چوہدری بڑا ظالم اور کنجوس شخص تھا۔ وہ اُن کا دور کا رشتہ دار تھا۔ والد صاحب میرا رشتہ دینے کو تیار نہ تھے۔ البتہ میری امی کے اصرار پر والد صاحب نے ہاں کر دی۔ خود ہی بولیں کہ یہ مکان جس میں ہم رہتے ہیں میری ایک انگشتری کی قیمت کا ہے۔ اور یہاں کا سینما چار چوڑیوں کی قیمت میں بنا سمجھو''۔

میں حیران ہوا یہ کیسے ممکن ہے کہ انگوٹھی میں مکان اور چار چوڑیوں میں سینما گھر بن گیا ہے۔ میں نے سوالیہ انداز میں ان کی جانب دیکھا، فرمانے لگیں۔

''جب ہم یہاں آئے تو بہاولنگر میں زمین بہت سستی تھی اور اُن دنوں انگریزوں نے صحرا کو آباد کرنے کے لیے دریائے ستلج سے نہر نکال کر زمین کو فروخت کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اپنے تمام زیورات فروخت کر کے بارہ مربع زمین خریدی پھر اُس کی آمدنی سے یہ مکان اور سینما بھی بنوایا۔''

کچھ وقفہ کے بعد فرمانے لگیں۔

''آپ ہمارے گھر کے فرد ہیں جب کبھی سینما کی خواہش ہو تو مجھ سے پاس لے لینا۔''

ایک روز دو پروفیسر صاحبان نے سینما جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے بیگم چوہدری سے فری پاس لیے۔ رات کو جب آٹھ بجے سنیما جانے لگا تو میں نے اطلاع دینے کے لیے بچے کو آواز دی۔ وہ نہ آیا پھر ایک نوکر کو آواز دی وہ بھی نہ آیا۔ تنگ آ کر میں نے غلام گردش کا دروازہ کھٹکھٹایا، کوئی جواب نہ ملا۔ حیران تھا کہ اتنی خاموشی تو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، زور سے بچے کو آواز دی۔ اتنے میں برآمدے کے دوسرے مہمان خانہ کا دروازہ کُھلا۔ اندر سے بیگم چوہدری کی بھتیجی جو کہ تھرڈ ائیر کی طالبہ تھی باہر آئی اور آنکھیں نیچے کیے کانپتی آواز میں بولی۔

''کیا بات ہے۔''

میں نے جواب میں دریافت کیا۔

''آج تمام گھر والے کہاں گئے ہیں۔ کوئی آواز بھی نہیں آ رہی ہے۔''

''سب ایک شادی میں گئے ہیں۔''

میں نے اسے بتایا۔

''میں سینما دیکھنے شہر جا رہا تھا۔ میں نے سوچا اطلاع کر دوں۔ لیکن کیا آپ اکیلی گھر پر ہیں؟''

''ہاں، باقی تمام افراد شادی میں گئے ہیں''۔

''اس کا مطلب ہے کہ آپ کو گھر پر اکیلا چھوڑ گئے ہیں۔''

اس نے صرف 'جی' کہا اور خاموش ہو گئی۔

''اچھا میں نہیں جاتا، انہوں نے آپ کو تنہا چھوڑ کر زیادتی کی ہے۔''

''نہیں نوکر تو گھر پر موجود ہیں۔''

''وہی نوکر جو میرے اتنے زور سے بولنے اور دروازہ کھٹکھٹانے کے باوجود نہیں آئے۔''

میں نے اس دن سینما کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ میں اپنے پروفیسر صاحبان کو اپنے پروگرام کی منسوخی کی اطلاع بھی نہ دے سکا تھا۔ دوسرے روز انہوں نے گلا کیا۔ میں نے وجہ بتائی تو وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

ایک ماہ گزرنے کے بعد تنخواہ پر گھر کے ایک فرد کی طرح مٹھائی لا کر دی۔ چوہدری صاحب چیف سیکریٹری ریٹائیرڈ رات کو میرے کمرے میں آ گئے۔ پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر مجھ سے ذاتی سوال بھی کرنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اُنہوں نے موضوع کو بدلا سوال کیا کہ آپ کو اس ماہ کتنی تنخواہ ملی ہے۔ میں نے سچ سچ بتا دیا بظاہر چوہدری صاحب بڑے خوش ہوئے۔ پھر فرمانے لگے کہ چلو آپ میرے نواسے کو شام کے وقت ایک گھنٹہ پڑھاتے ہیں۔ اس کے عوض آپ کی رہائش آ گئی۔ جس طرح یورپ میں اپنے کھانے کا بل ہر آدمی خود ادا کرتا ہے آپ بھی ہمیں PAYING GUEST کی طرح کھانے کا خرچ ادا کر دیا کریں اور آرام سے رہیں۔ اُن کا یہ مطالبہ سُن کر میں بڑا پریشان ہو گیا۔ ان کی شخصیت کا محل دھڑام سے نیچے آ گیا۔ اُسوقت پاکستان میں تو PAYING GUEST کا کوئی رَواج نہیں تھا۔ آخر ایک آدمی کے کھانے کا ان پر کتنا بوجھ آ گیا کہ بیچارے پیسے مانگنے آ گئے۔ حیرانی ہوئی چوہدری صاحب کے چہرے کی جانب دیکھا کہ شاید ان کو احساس ہو گیا ہو کہ اُنھوں نے غلط بات کر دی ہے۔ اُن پر کسی بچے کی تعلیم یا شادی کا کوئی بوجھ بھی نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ یقیناً وہ غلط بات کرنے پر پشیمان ہوں گے۔ اُن کے چہرے کی جانب دیکھا اُن کے چہرے پر ندامت کے کوئی آثار نہ تھے۔ یُوں محسوس ہُوا کہ میرے سامنے چوہدری چیف سیکریٹری نہیں، ہوٹل کا ایک ویٹر کھڑا ہے۔ جو کھانے کا بل

مانگ رہا ہے۔ہوٹل میں کھانے اور رہائش کا بل دینا تو ضروری ہوتا ہے۔انکار کیوں کیا جائے مجھے ایک مہمان کی حیثیت سے ایک اعلیٰ درجہ کے ہوٹل کی جُملہ مراعات میسر ہیں،نوکر چوکیدار، کمرہ کی صفائی، باعزت رہائش دونوں وقت کا کھانا، دوپہر کا کھانا کالج میں پہنچتا ہے۔ان تمام سہولیات سے مستفید ہو رہا ہوں۔اب بل کی ادائیگی ضروری محسوس ہوئی۔کانوں میں چوہدری صاحب کے بیٹے کا تعارف گونجا۔آپکا قیام اور طعام ہمارے ساتھ ہے۔جی میں آیا کہ عرض کروں کہ رہائش اور کھانے کے بل کا تو آپ نے پہلے کوئی ذکر نہ کیا تھا۔بلکہ آپ اور آپ کی بیگم نے تو گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہنے کی دعوت دی تھی۔اَب ایک ماہ کے بعد کیوں ضرورت محسوس ہوئی۔تاہم بحث کرنے کی بجائے اپنے آپ کو تھوڑی تسلی دی اور چوہدری صاحب سے بس اتنا دریافت کیا کہ کتنے پیسے دوں۔فرمایا ہونے تو زیادہ چاہیں لیکن سو روپیہ سے کم کیا ہوں۔اتفاق کی بات کہ چند دن پیشتر میں نے بہاولپور کے ایک اچھے ہوٹل سے رہائش کے علاوہ کھانے کا دریافت کیا تو اس نے پچاس روپے ماہوار رہائش اور پچاس روپیہ ماہوار کھانے کے مانگے تھے۔میں نے چوہدری صاحب سے کہا۔

’’چوہدری صاحب ہونے تو تیس روپے چاہیں چلو آپ کے لیے پچاس پیش کرتا ہوں۔‘‘

چوہدری صاحب سٹپٹا گئے۔فرمانے لگے چلو نوے دے دو۔آخر اَسی روپے پر سودا طے ہو گیا۔مزید بحث کرنے کی بجائے میں نے فوراً جیب سے اَسی روپیہ نکال کر انہیں پیش کیے۔چوہدری صاحب جو میرے کمرے میں گپ شپ کے لیے تشریف لائے تھے، پیسے لے کر فوراً اُٹھے اور رسمی سلام ودعا کے بغیر چلے گئے۔یہ حقیقت واضح ہوئی کہ میں تو ان کا گاہک، اور ان کے مہمان خانے میں رہنے والا ایک کرایہ دار ہوں۔بڑی کوفت ہوئی کہ ایک پروفیسر ہوتے ہوئے ایک پرائمری ٹیچر کا پیشہ کیوں اختیار کیا۔

رات بھر کانوں میں چوہدری حبیب اللہ کے بیٹے کا بنک منیجر سے متعارف کروانے کی آواز ’میرے بھانجے کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور ان کا قیام اور طعام ہمارے پاس ہی ہے۔‘ کانوں میں گونجتی رہی انہی خیالات میں کروٹیں بدلتا رہا۔ہر بار چوہدری صاحب اور ان کے بیٹے کے روّیے کے متعلق نئے نئے خیالات ذہن میں آتے رہے معلوم نہیں کب نیند آئی۔

صبح اٹھا اور پھر جس طرح چوہدری صاحب اپنا بل وصول کرنے کے بعد بغیر رسمی سلام ودعا

اور شکریہ کے واپس گئے۔اسی طرح دوسری صبح میں ایک رکشہ لے آیا، میں اپنا سامان رکھ رہا تھا کہ چوہدری صاحب کی بیگم اپنی بیٹی کے ہمراہ وہیں آ گئی۔وہ ایک عقل مند عورت تھی تمام ماجرا اُس کی سمجھ میں آ گیا تھا، کہنے لگی۔

’’بیٹے کو پڑھانے کے لیے آجانا۔ٹیوشن فیس کے علاوہ رکشہ کا کرایہ بھی دوں گی، بہتر تھا کہ آپ ہمارے ساتھ قیام فرماتے۔‘‘

میں نے بیگم صاحبہ سے بس اتنا کہا کہ پروفیسر تو ایف اے اور بی اے کی ٹیوشن پڑھانا اپنی ہتک تصور کرتے ہیں۔آپ کے دوہتے کو ایک بھانجا سمجھ کر پڑھایا۔آپ کے گھر میں ایک فرد کی طرح رہا۔پہلی تنخواہ ملنے پر مٹھائی لا کر دی۔لیکن۔۔۔؟۔ اتنا کہہ کر رکشہ میں بیٹھ گیا۔

دعائے خیر

بہاولپور سے دو ماہ کے بعد میرا تبادلہ منٹگمری کالج ہو گیا۔وہاں بھیرہ سے تعلق رکھنے والی پراچہ فیملی سے گہرے مراسم ہو گئے۔پراچہ صاحب حبیب بنک میں ملازم تھے۔انکا والد کسی ٹرانسپورٹ کمپنی میں ملازم تھا۔اُنکی والدہ کے کہنے پر میں دوست کی ہمشیرہ سے شادی کے لیئے تیار ہو گیا۔اس نے اپنی ہمشیرہ سے دو تین ملاقاتیں بھی کروائیں۔لڑکی تھی تو میٹرک پاس لیکن اس کو ملک کی سیاست پر کافی عبور تھا۔خوبصورت تو نہ تھی نقش بھی مردانہ تھے۔ہاں اُس کی دلنشین آواز کانوں کو بھلی لگتی ہر ملاقات میں میری خواہش ہوتی کہ وہ باتیں کرتی رہے اور میں سنتا رہوں۔ والدہ سے ایک بار ملی۔والدہ میری خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے اس رشتہ پر تیار ہو گئیں۔لیکن والد صاحب آڑے آ گئے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔بچی کا تعلق شیخ فیملی سے نہیں لہذا مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔میں والد صاحب کو کسی قیمت پر بھی ناراض نہ کر سکتا تھا۔

والد صاحب یونین کونسل کے ممبر تھے۔وہ ہر تیسرے ماہ چکوال پینشن لینے اور یونین کونسل کی میٹنگ میں شامل ہونے جاتے۔وہ اکثر چکوال اکیلے ہی جاتے، ایک بار وہ والدہ کو بھی ساتھ لے گئے اور پندرہ روز کے بعد وہ واپس لوٹے تو والدہ نے یہ خبر سنائی کہ وہ میری منگنی کر آئی ہیں۔ میں نے والدہ سے دریافت کیا کہ آپ لوگ کس کے ہاں دعائے خیر کہہ آئے ہیں۔

’’برادری کے لوگ ہیں اور راولپنڈی میں ہی سیٹل ہیں۔وہ محکمہ میں بڑے افسر ہیں۔شیخ رحیم بخش

صاحب ریٹائیرڈ انسپکٹر پولیس کے چھوٹے بھائی ہیں۔''

رحیم بخش صاحب کا نام سنتے ہی ایک دلیر اور بہادر مسلمان کا چہرہ سامنے آ گیا۔ ملازمت کے دوران وہ ایک کشتی مقابلہ میں ڈیوٹی پر تھے۔ مقابلہ دیکھنے پر ٹکٹ تھا۔ یہ مقابلہ ایک سکھ پہلوان اور ایک مسلمان پہلوان کے درمیان تھا۔ سکھ پہلون نے مسلمان پہلوان کو دس منٹ کی کشتی کے بعد چت کر دیا۔ وہ اُس مسلمان پہلوان کی شکست کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں وردی اتاری اور سکھ پہلوان کو مقابلہ کی دعوت دی ۔ اور اسے دو منٹوں میں چت کر دیا۔ یہ اس پولیس افسر کے چھوٹے بھائی تھے۔ والدہ نے بتایا کہ لڑکی کے چار بھائی ہیں دو فوج میں کمیشنڈ افسر ہیں باقیوں کو میں نہیں جانتی۔ ویسے ان میں سے کوئی منگنی پر نہ آیا تھا۔ والد صاحب جو یہ سب باتیں سن رہے تھے بولے۔

''بیٹا تمہیں یاد ہوگا، جب تم ایف اے میں پڑھتے تھے تو میرے پاس خط آیا تھا کہ اُنہیں بیٹی کے لیے رشتہ چاہیے۔ تم سے پوچھا تھا اور تم نے انکار نہیں کیا تھا، یہ وہی لوگ ہیں۔''

تین ماہ بعد والد صاحب چکوال گئے تو واپسی پر شادی کی تاریخ لیکر آ گئے۔ اگلے سال میرا تبادلہ ملتان کالج آف ایجوکیشن میں کر دیا گیا۔ میں وہاں ایک سال رہا۔ اس کالج میں اپنے ایک ہم جماعت سے میوچل ٹرانسفر کروا کر راولپنڈی اصغر مال کالج آ گیا۔

باب ہشتم

سفر وسیلہ ظفر

اسلام آباد سے نزدیک ہونے کی بناء پر ترقی کی خواہشات بھی بڑھ گئیں۔ تقریباً ہر ماہ انٹرویو دیتا۔ فوج میں سیلیکشن کے لیے کوہاٹ کی کئی بار سیر کی۔ میڈیکل ٹیسٹ تقریباً ہر ماہ ہی ہوتا ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ائیر فورس اور نیوی دونوں نے مجھے کمیشنڈ افسر کی ٹریننگ کے لیئے چن لیا۔ ایرفورس میں آٹھ روز اوور ایج نکلا۔ بات کمانڈر ان چیف تک گئی لیکن رعائیت نہ ملی۔ نیوی والوں کا پروگرام مشرقی پاکستان میں شکست کی بنا پر ختم کر دیا گیا۔ صوبائی سول سروس میں عمر بتیس سال تھی۔ صوبائی سروس میں امتحان دیا۔ نتیجہ آیا میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوا۔ مگر میرٹ لسٹ میں میرا اٹھائیسواں نمبر تھا جبکہ اکیس پوسٹیں تھیں۔ میرے تمام دوست احباب کو پُختہ یقین تھا۔ کہ نمبر زیادہ دور نہیں، کسی بھی وقت حکومت پنجاب کی جانب سے سلیکشن کی چٹھی آ جائے گی۔ سب کا خیال تھا کہ بہت سے امیدوار صوبائی کے علاوہ مرکزی مقابلہ کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے ہونگے۔ وہ سب مرکز میں ملازمت پسند کریں گے۔ پنجاب میں آنے کی بجائے مرکز میں جائیں گے، اس طرح تمہارا نمبر آ جائے گا۔ دوست احباب مجھے ہر وقت تیار رہنے کا کہتے۔ ایک دوست خبر لایا کہ ستائیس نمبر تک کو بلا لیا گیا ہے۔ لیکن میرا تو اٹھائیسواں نمبر تھا۔ اور مجھے نہ بلایا گیا۔ اب میں صوبائی سول سروس میں بھی اوور ایج ہو گیا۔

میں نے ہمت نہ ہاری مشرق وسطٰی کی ریاستوں سے لے کر افریقہ کے تپتے صحراؤں کی ملازمت حاصل کرنے کے لیئے انٹرویو دینے شُروع کر دیے۔ ابتداء میں ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد بیک وقت صومالیہ اور یوگنڈا کی ٹیموں نے چن لیا۔ ایک

روز چیئر مین سپورٹس بورڈ سے ایک معمولی بات پر تلخی ہوگئی ۔ میں نے اُنہیں سالانہ کھیلوں میں انتظامات کا مشترکہ معائنہ کرنے کی دعوت دی ۔ جواب میں اُنھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اگلے روز ان کا نائیجیرین ایمبیسی میں بیرون ملک ملازمت کے لیئے انٹرویو تھا۔ وہ انٹرویو دینے کے بعد بھی انسپیکشن کرنے کو تیار نہ ہوئے میں نے یُوں ہی کہہ دیا۔

’’مجھے بھی کل وہیں انٹرویو کے لیے جانا ہے،بہتر ہے کہ ہم دونوں انتظامات کا جائزہ لے کر اکھٹے ہی انٹرویو دینے چلے جائیں‘‘۔

وہ پھر بھی نہ مانے۔ وہ کسی قسم کا کوئی رسک لینے کو تیار نہیں تھے فرمانے لگے آپ جائیں اور آپ کا کام میں نہیں آونگا۔ وہ طلوع آفتاب کے ساتھ ہی نائیجیرین ایمبیسی پہنچ گئے میں نے اکیلے ہی انتظامات چیک کیئے۔ اپنے سرٹیفیکیٹ لیے ایک دوست کو ساتھ لیا اور ایمبیسی پہنچ گیا۔ ایمبیسی کے استقبالیہ سے درخواست فارم مانگا تو معلوم ہوا کہ اس وقت تک مطلوبہ فارم ختم ہو چکے ہیں ۔ میرے ساتھی چوہدری حنیف صاحب جو میرے ساتھ آئے تھے ،کی جان پہچان والے ایک دوست بھی انٹرویو کیلئے وہیں کھڑے تھے ۔ ایک اضافی خالی فارم اُن کے پاس موجود تھا۔ وہ اپنا فارم جمع کروا چکے تھے۔ دوسرا فارم اُنھوں نے اپنے کسی اور دوست کے لیے حاصل کر رکھا تھا۔ ان کا وہ دوست اس وقت تک نہ پہنچ پایا تھا۔ چوہدری محمد حنیف صاحب وہ اضافی فارم لے کر ایمبیسی کے نزدیک کسی دفتر میں گیے اور دس بارہ نقول کروالائے ۔ ہم دونوں فارم جمع کروانے کے لئے استقبالیہ میں گئے ۔معلوم ہُوا کہ انٹرویو بورڈ کے چیئر مین فارم اکٹھے کر کے انٹرویو والے کمرہ میں جا چکے ہیں۔ چوہدرری حنیف صاحب اور میں چیرمین انٹرویو بورڈ کے کمرہ میں اُن کے پاس چلے گئے ۔ پہلے تو اُنھوں نے درخواست فارم لینے سے انکار کیا۔ بعد میں ہمارے اصرار پر کہ آپ ہمیں سیلیکٹ کریں یا نہ کریں فارم رکھ لیں۔ اُنھوں نے ہم دونوں کے فارم لے کر بنڈل کے نیچے آخر میں رکھنے کی بجائے اوپر ہی رکھ دیئے ۔ میں فارم جمع کروا کر باہر نکلا ہی تھا کہ چپڑاسی نے آواز لگائی۔

’’شیخ غلام فاروق پلیز کم‘‘۔

نمبر ون پر میں ہی چلا گیا۔ چیئر مین انٹرویو بورڈ کو اپنی تعلیمی اسناد دکھائیں اور مختلف کھیلوں میں حاصل کردہ ٹریننگ کی اسناد بھی پیش کیں ۔ جواب میں چیئر مین نے ایک دو سوال کیئے جب

اسے معلوم ہُوا کہ میرے پاس فارسی ادب میں گریجویشن کی سند بھی ہے۔ اور میں نے ایم۔اے۔ انگریزی ادب میں کیا ہے۔ حیرانگی سے اُس نے مجھ سے انگریزی کی بجائے فارسی زبان میں بات کی۔

’’آغا تو گریجویشن در زبان فارسی کردہ ای و لیک ماسٹر در زبان انگریزی این چنیست‘‘

(آپ نے گریجویشن تو فارسی ادب میں کیا ہے ۔ اور ایم اے انگریزی زبان میں اس کی وجہ کیا ہے۔)

میں نے فارسی زبان میں اس کو جواب دینے کے بعد، اُلٹا سوال فارسی زبان میں کیا۔

’’آغا تو نمائندہ مملکت خود در ایران بودی کہ چنیں قدر شستہ گفتگو در زبان فارسی می کنی‘‘

(جناب والا کیا آپ اپنی حکومت کی جانب سے مملکت ایران میں ایمبسیڈر رہے ہیں کہ فارسی زبان میں اتنی اچھی گفتگو کر سکتے ہیں؟)

اس نے میرا فارسی میں سوال کرنے کو بڑا سراہا۔ اور فوراً ہی انگریزی میں بولا۔

’’میں آپ کو سینئر ایجوکیشن آفیسر لیتا ہوں‘‘

وہ اُٹھا اور دروازہ میں کھڑے ہو کر دوسرے کمرہ میں کسی سے انگریزی میں مخاطب ہوا۔

’’جناب فارم جلدی بھیجیں مجھے ایک فارم اس شریف آدمی کو دینا ہے۔‘‘

وہ ایک فارم لایا۔ وہ فارم مجھے دیتے ہوئے بولا۔

’’یہ فارم پُر کر کے اسناد کی نقول کے ہمراہ، دو روز تک ایمبیسی میں جمع کروادیں۔‘‘

میں باہر آ گیا میرے بعد دوسرے نمبر پر چوہدری حنیف صاحب تھے انہیں بلایا گیا اور اُنہیں بھی چُن لیا گیا۔ میرے چیئر مین سپورٹس بورڈ جو کہ کافی سینئر تھے جب اُن کی باری آئی تو اُنھوں نے بڑے فخر سے کہا کہ میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ جواباً چیئر مین انٹرویو بورڈ نے فرمایا کہ ہمیں تو پروفیسرز کی ضُرورت ہے اور انہیں انکار کر دیا۔ شاید وہ یہ سمجھے کہ یہ صاحب تو اسسٹنٹ ٹو پروفیسر ہیں جو لیکچررز کو لیبارٹری میں لیکچر کے دوران ہر قسم کی امداد دینے پر مامور ہوتے ہیں۔ اس قسم کی جہالت پر مبنی مثالیں نائیجیریا میں پہنچ کر بھی کافی سننے میں آئیں۔ سیلیکشن بورڈ نے تین چار لوگوں کو سینئر ایجوکشن افسر گریڈ دس میں لیا باقی سب کو ایجوکیشن افسر گریڈ نو یا اُس سے نیچے جونیئر ایجوکیشن افسر گریڈ آٹھ میں چن لیا۔ کسی کو بھی پرنسپل ایجوکیشن آفیسر گریڈ بارہ

یا چیف ایجوکیشن آفیسر گریڈ تیرہ نہ لیا۔ایک روز نائیجرین ایمبیسی سے دریافت کرنے پر معلوم ہُوا
کہ بہت سے منتخب شدہ پروفیسرز کے ٹکٹ کی ادائیگی پی۔آئی۔اے کو کر دی گئی ہے۔ایمبیسی میں
آ کر اپنا نام لسٹ میں تلاش کر لیں۔اگلے روز میں ایمبیسی چلا گیا۔لسٹ کو چیک کیا تو دیکھا پہلے
صفحہ پر پہلا نام میرا ہی تھا نائیجریا ایمبیسی نے پاکستان انٹرنیشنل ائیرلائن کو اسلام آباد
کراچی، روم (Rome)، لیگاس (Lagos) روٹ کے ٹکٹ کی ادائیگی کر دی تھی۔ میں نے
دوسرے روز جا کر پی ائی اے سے ٹکٹ بنوا لیے۔

نائیجیریا جانے سے پیشتر میرے سامنے بہت سے مسائل حل طلب تھے میری غیر حاضری
میں بچوں کی تعلیم کا جاری رہنا۔چکوال کے مکان میں تو والد صاحب رہائش پذیر تھے البتہ اسلام
آباد والے مکان کا مستقل انتظام کرنا۔ملازمت سے متعلقہ مسائل کا حل کرنا ضروری تھا۔میرا
ارادہ تو حکومت پنجاب کی نوکری کو خیر باد کہنے کا تھا۔کیوں کہ نائیجیریا میں جو تنخواہ ملنی تھی وہ پاکستان
میں ملنے والی تنخواہ سے دس گنا تھی۔میں نے بڑے بھائی جان عبدالغفور سے بات کی، وہ ایک منجھے
ہوئے تجربہ کار سرکاری ملازم تھے۔انہوں نے میرا حکومت پنجاب کی ملازمت کو چھوڑنے کے
فیصلہ کو درست فیصلہ نہ کہا۔کہنے لگے چھوڑنے کی بجائے ڈیپوٹیشن یا ایکس پاکستان رخصت بمعہ
تنخواہ، نصف یا بغیر تنخواہ کے حاصل کرو۔نائیجیریا جا کر حالات کے مطابق فیصلہ کرو۔وہاں رہ بھی
سکتے ہو کہ نہیں۔دوست احباب نے بھی یہی مشورہ دیا۔اسی طرح مکان فروخت کرنے کی دو تین
پراپرٹی ڈیلروں سے بات کر دی۔وہ گاہک بھی لے آئے، جس نے ایک معقول آفر بھی دی۔سودا
تقریباً طے ہو چکا تھا، کہ ایک پروفیسر جو اس سے پیشتر کبھی نہ آیا تھا، وہ اتفاق سے ملنے آ گیا۔جب
اسے معلوم ہوا کہ میں اپنا مکان بیچ رہا ہوں وہ مجھے علیحدہ لے گیا اور مکان کو فروخت نہ کرنے کی
رائے دی۔اور اس کے علاوہ مکان کا انتظام سنبھالنے کا وعدہ بھی کیا۔چنانچہ میں نے مکان کے
گاہک اور ڈیلر سے سوچ کر فیصلہ کرنے کی مہلت مانگ لی۔مکان ایک جاننے والے کو معمولی
کرایہ پر دیدیا۔اب مسلہ محکمہ سے رخصت کا تھا۔اپنے دفتر سے درخواست منظور کروا کے
لاہور سیکریٹریٹ چلا گیا۔سیکشن آفسر صاحب نے درخواست وصول کرنے کے بعد سات دن بعد
آنے کا کہا۔ساتویں دن انہوں نے ڈیپوٹیشن منظوری کا خط دستی پکڑا دیا۔PIA کے دفتر سے ٹکٹ
پہلے ہی بنوا چکا تھا۔بچّوں کے پاسپورٹ بنوائے۔نائیجیرین ایمبیسی سے ویزا لگوایا۔بچّوں کو اُن

کے نانا کے گھر چھوڑا اور اگلے ہفتے نائیجیریا کے لیئے روانہ ہو گیا۔

موت کا سایہ

اسلام آباد سے کراچی کے لیئے جہاز سے روانہ ہوا۔یہ میرا ہوائی جہاز کا پہلا سفر تھا۔جہاز
کی روانگی سے پیشتر ایک ائیر ہوسٹس نے ہمیں خوش آمدید کہا، سیٹ بیلٹ باندھنے کا طریقہ
سمجھایا، بتایا جہاز تیس ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے، ایک گھنٹہ پچاس منٹ بعد کراچی
ائیرپورٹ پر اُترے گا۔ابھی سیٹ بیلٹ باندھ رہا تھا کہ جہاز محو پرواز ہو گیا۔وہی دبلی پتلی
ائیر ہوسٹس دوبارہ نمودار ہوئی، اس کے ہمراہ ایک اور ائیر ہوسٹس بھی تھی۔دونوں ائیر ہوسٹسز نے
مل کر مسکراہٹوں اور بڑے سلیقہ سے ہر مسافر کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ دی۔ابھی ہم کھانے
سے فارغ ہی ہوئے تھے، ائیر ہوسٹس نے پبلک ایڈریس سسٹم پر اعلان کیا کہ تھوڑی دیر میں ہم
کراچی کے ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں لہذا سیٹ بیلٹ باندھ لیں۔بڑا پریشان ہوا کہ یہ
ائیر ہوسٹس اتنی جلدی کراچی پہنچنے کی بشارت سنا رہی ہے۔سیٹ بیلٹ باندھ ہی رہا تھا کہ جہاز پستی
کی جانب سرکنا شروع ہو گیا۔چند منٹوں بعد کراچی کا ہوائی اڈہ دکھائی دیا اور ہوائی جہاز نے ایک
ہلکے سے جھٹکے کے بعد رن وے پر دوڑنا شروع کر دیا۔

ائیرپورٹ انکوئیری کاونٹر پر دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ روم کے لیے جہاز رات کے
ایک بجے روانہ ہوگا۔شہر میں کسی عزیز یا کسی دوست کے پاس جانے کی بجائے، وہیں ائیرپورٹ پر
رک گیا۔یہ RCD فلائٹ تھی جو تہران بیروت اور بغداد کو چھو کر روم جاتی۔روم کے ائیرپورٹ
پر ہم صُبح کے تقریباً 10 بجے پہنچے۔جہاز اترنے کے لیے نیچے آیا اور قریب تھا کہ اس کے ٹائرز مین کو
چُھو لیں جہاز اوپر اُٹھ گیا اور پندرہ منٹ کی پرواز کے بعد دوبارہ اترنے کے لیے نیچے آیا۔اس دفعہ
پھر رن وے کو چُھونے سے پیشتر ہی اوپر اٹھ گیا میرا جہاز کا یہ دوسرا اور غیر ملکی پہلا سفر تھا۔مجھے تو
علم ہی نہ تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔میں سمجھا کہ جہاز کا فضا سے زمیں پر اترنے کا یہی طریقہ ہوگا۔
جہاز کو رن وے پر اتارنے سے پہلے چند بار ریہرسل کرنی ہوگی۔یا کپتان ہمیں روم کی فضائی
سیر کرا رہا ہے۔میں روم شہر کا دوسری بار فضائی نظارہ دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔کہ اگلی اور پچھلی نشستوں
سے کلمہ پڑھنے کی آوازیں آنی شُروع ہوئیں۔میں یہ سمجھا کہ مسافر اپنا سفر بخیریت ختم ہونے پر کلمہ

پڑھ رہے ہیں۔ پیچھے ایک اچٹتی نگاہ دوڑائی دیکھا کہ چند مسافروں کے رنگ فق تھے۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ چند مسافروں نے اونچی آواز سے کلمہ کا ورد شُروع کر دیا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک نوجوان انگریز عیسائی بیٹھا تھا۔ اُس نے پیشانی سے لیکر سینے تک اور ایک کندھے سے دوسرے کندھے تک شہادت انگلی سے صلیب کا نشان بنایا۔ وہ جلدی جلدی انگریزی زبان میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ غالبًا بائبل کے چند فقرے تھے کبھی اونچی آواز اور کبھی نیچی آواز میں دہرا رہا تھا۔

اتنے میں کپتان کی آواز مائکروفون پر سُنائی دی۔

''حضرات متوجہ ہوں''

لیکن ہر ایک کو اپنی ہی سوجھی ہوئی تھی۔ اس کی جانب کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ سب اونچی آواز میں کلمہ یا بائیبل پڑھ رہے تھے۔ کپتان نے مسافروں سے مخاطب ہو کر تسلی دی گھبرائیں نہیں جہاز میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوا بس رن وے پر سیدھا نہیں آ رہا تھا، ہم تیسری کوشش کے لیے اوپر اٹھ گئے تھے۔ اس دفعہ اُمید ہے کہ جہاز سیدھا آ جائے گا، اور ہم ایئر پورٹ پر خیریت سے اتر جائیں گے۔ اس اعلان کے بعد جہاز میں ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ اَب کوئی بھی مسافر خاموش نہ تھا چند مسافروں نے اونچی آواز میں زور زور سے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا اور بعض مسافر بدحواس ہو کر بے ربط بولے جا رہے تھے۔ جہاز مچھلی منڈی بن گیا۔ ہر طرف سے ہر قسم کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے سامنے چھوٹی سی سیٹ پر ایک ایئر ہوسٹس خوف زدہ بلی کی طرح دُبک کر خاموشی سے اس طرح سے بیٹھی تھی کہ وہ چھوٹی سی سیٹ بھی اس کے لیے بڑی ہو گئی تھی۔ اس ایئر ہوسٹس نے جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے اپنے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا رکھا تھا۔ اس کے پھیلتے سکڑتے نتھنے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ گھبرائی ہوئی ہے۔ اور اس کے آنسو ٹپکنا چاہتے ہیں جنہیں روکنے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہے۔ اس نے سر پر دوپٹہ درست کیا اس نے اپنے تاثرات چھپانے کی کوشش میں منہ کو جہاز کی چھت کی جانب کیا اور اپنے چہرہ کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔ اُس وقت تک اس کی دونوں آنکھوں میں نمی پھیل چکی تھی۔ اب وہ کچھ پڑھ کر سر کو دائیں بائیں ہلکا سا جھٹکا دیتی، جیسے وہ پھر بھول گئی ہو، جسے وہ خوف کے عالم میں بار بار یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ کبھی کبھار اس کا پورا جسم لرز اٹھتا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹ کبھی کھلتے کبھی بند ہو جاتے۔

سیٹ بیلٹس تو سب نے باندھ رکھی تھیں۔ جس کی وجہ سے کوئی بھی اپنی سیٹ سے گھبرا کر نہ اُٹھ سکتا تھا۔ وگرنہ معلوم نہیں کیا ہو جاتا۔ اگر بہت سے مسافر دروازے کے پاس یا کاک پٹ پر اکٹھے ہو جاتے تو جہاز کا بیلنس خراب کر کے پائلٹ کے لیے مصیبت کا باعث بن جاتے۔

کپتان کے اعلان کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ جہاز میں سمت بتانے والے آلہ میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ جہاز غلط سمت میں اترے تو بلڈنگ سے ٹکرا جائے گا یا وہ کھیتوں میں چلا جائیگا جہاں بہت سے درخت اگے تھے۔ دونوں صورتوں میں جہاز کے ڈھانچہ کو نقصان پہنچنے کے علاوہ مسافروں کی موت یقینی تھی۔ اسی ناگہانی موت کو سوچ کر کہ تمام مُسلمان موت سے پہلے کلمہ کا ورد کر رہے تھے اور میرے ساتھ بیٹھا عیسائی چہرہ پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔ کپتان کے دلاسے کے باوجود مسافروں کی گھبراہٹ میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ پہلے تو معصومانہ اندازِ میں ہر قسم کی منفی سوچ سے بے خبر روم شہر کی فضائی سیر کر رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ مسافر کلمہ کا ورد کیوں کر رہے ہیں۔ ایئر ہوسٹس کی حالت دیکھ کر گمبھیر خطرے کا احساس ہوا۔ اَب حوصلہ مند ایئر ہوسٹس کی بجائے وہ ایک معصوم بھولی بھالی لڑکی بن گئی تھی۔ خیال آیا کہ شاید وہ بازی جو میں نے قسمت سے لگائی ہے، شاید اِس لڑکی کی طرح میں بھی ہار رہا ہوں۔ بیگم بچیوں اور ننھے بیٹے کے چہرے سامنے آئے میرے بغیر وہ اس دنیا میں تنہا رہ جائیں گے۔ اپنے خوابوں کا محل گرتا محسوس ہوا۔ اب میرا بھی برا حال ہو گیا۔ رنگ فق اپنے آپ کو دل میں کوسنا شُروع کر دیا۔ کہ جلدی میں مجھ سے بھی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ یقینی موت سامنے دکھائی دینے لگی۔ میں جلدی میں سیٹ سے اُٹھا لیکن سیٹ بیلٹ نے مظبوطی سے جکڑ رکھا تھا سیٹ بیلٹ کھولنے کا سوچا لیکن ذہن ماوف تھا۔ کچھ بھی سوجھ نہ رہا تھا۔ بیلٹ کھولنے کی کوشش کی وہ الٹا تنگ ہو گئی۔ کلمہ پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے بھی ان کی تقلید میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ میری آنکھیں نم آلود تھی۔ دو آنسو میری آنکھوں سے گرے۔ اپنی بے وقت موت پر رونا آ گیا۔ اُسی لمحہ میری نظر کھڑکی پر گئی دیکھا کہ ہم رن وے کو چھونے والے ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اتنے میں جہاز نے اپنے ٹائر زمین پر لگا دیئے اور جہاز رن وے پر دوڑنے لگا۔ مسافروں نے خُوشی میں زور زور سے تالیاں بجانی شُروع کر دیں اور دیر تک بجاتے ہی رہے۔

میرے سامنے بیٹھی ایئر ہوسٹس نے ایک لمبا سانس لیا اس کی آنکھوں میں چمک لوٹ آئی تھی۔

اس کے لبوں سے مری مری آواز نکلی

''اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

جہاز کے رکتے ہی پٹاخ پٹاخ سیٹ بیلٹ کھلنے کی آوازیں آئیں۔مسافر اپنی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے ۔ راستہ مسافروں سے بھر گیا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ سب سے پہلے جہاز سے اترے۔تمام مسافر اسی کوشش میں جہاز کے رُکنے سے پیشتر جہاز کے دروازہ کے پاس اکھٹے ہوگئے۔ جونہی دروازہ کھلا ۔ پرائمری جماعت کے بچّوں کی طرح جو سکول سے چھٹی کی گھنٹی بجنے پر، دوڑ کر کلاس روم سے باہر نکلتے ہیں، مسافر اپنا اپنا دستی سامان اٹھائے ایمر جنسی سیڑھیاں پاٹتے دوڑ کر اترے۔ زمین پر پاؤں لگتے ہی تمام سیڑھی کے پاس ایک دائرہ بنا کر کھڑے ہوگئے۔

کپتان صاحب اپنے جُملہ سٹاف سمیت وہیں آ گئے ۔ایک انگریز مسافر نے کپتان سے جھگڑنا شُروع کر دیا۔

''یہ تو بکواس کمپنی ہے میں اَب اس میں مزید سفر نہیں کروں گا میرے پیسے واپس کرو۔''

بکواس کا لفظ سنتے ہی کپتان تلملا اُٹھا، غصے سے بولا۔

''آپ ائیر پورٹ پر کھڑے ہیں یا کہ کھیتوں میں؟ جہاز میں سمت بتانے والی گھڑی میں نقص پیدا ہوگیا تھا۔لیکن اتنے بڑے جہاز کو پانی یا کھیتوں میں اتارنے کی بجائے ، میں نے اپنے تجربہ اور مہارت کی بناء پر ائیر پورٹ پر سیدھا اُتارا ہے۔ جہاز میں سوار کسی مسافر کو خراش تک نہیں آئی اور کہتے ہو کہ گھٹیا کمپنی ہے۔ آپکو جانا ہے تو جائیں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

پی آئی اے کا نمائندہ بس لے کر جہاز کے پاس آ گیا۔ وہ روم اترنے والی سواریوں کو لاونج میں لے آیا۔ مجھے اور ایک عراقی مسافر کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا۔ ہوٹل کے مالک نے ہم دونوں کو ایک ہی کمرہ میں ٹھہرا دیا۔ بہانہ یہ کیا کہ اس کے پاس دو کمرے خالی نہیں ہیں۔

جیسا دیس ویسا بھیس

دوسرے روز ہم دونوں نے ٹیکسی لی اور روم کی سیر کو چل دیئے۔ ٹیکسی والا پہلے تو ہمیں پرانے شہر روم کے کھنڈرات دکھانے لے گیا۔ وہاں ٹوٹے ستُون کھڑے تھے۔ چند ستونوں پر محراب بھی نظر آ رہے تھے۔گلیاں کشادہ اور سیدھی تھیں۔کھنڈرات کے ساتھ ساتھ چمکتے

پتوں والے قطار اندر قطار پام کے درخت تھے۔ڈرائیور نے بتایا ان درختوں کے پتے کئی ماہ تک ضائع نہیں ہوتے، ان کی تازگی برقرار رہتی ہے۔عہد قدیم میں سیاح واپسی پر ان درختوں کے پتے بطور یادگار اپنے ہمراہ لے جاتے۔روم کا ٹیکسی ڈرائیور ایک بہترین گائیڈ تھا۔اسے روم کی تاریخ پر مکمل عبور حاصل تھا۔میرے عراقی ساتھی کے ایک سوال پر ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا شہر کا پرانا نام لیٹیم (Latium Vetus) ہے،اس کی ابتدا نویں صدی قبل مسیح گاؤں 'لطینی' (village of the Latini) کے طور پر شروع ہوئی، یہاں اطالوی قبیلہ 'لیٹینز' (Latins) آباد تھا۔وہ ہمیں موجودہ شہر روما لے گیا۔ ہر مکان کے دروازے تقریباً آٹھ فٹ اونچے اور ڈیڑھ انچ موٹے نقش نگار والے تھے۔ ہر مکان سڑک سے چار فٹ اونچا بنا تھا۔ گھروں کے باہر بنے ستون کھنڈرات کے ستونوں سے چُھوٹے تھے۔گھر کا بیرونی دروازہ برآمدہ میں کھلتا۔شہر سے گزرتے ہوئے ایک پل پر سے گذرے۔ٹیکسی والے نے بتایا یہ دریائے 'ٹائبر' (The Tiber) اطالوی زبان میں ٹرائیویر (Italian Tevere) ہے۔ جو شہر کے وسط سے گزرتا ہے۔اس کے پانی کا رنگ چمکیلا سرمئی ہے۔گاڑی کو رکوا کر دیکھا تو وہ ایک چُھوٹا دریا دکھائی دیا۔ گہرائی کا تو علم نہ ہوا البتہ چوڑائی میں وہ نہر اپر چناب کے برابر تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور نے ایک کھنڈر کے سامنے گاڑی روک لی۔اس نے بتایا کہ اس اوپن ائیر سٹیڈیم کو کلوزیم (Colosseum) کہتے ہیں۔اس میں اب ٹوٹے ہوئے محراب اور ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں ہی رہ گئیں تھیں۔سٹیڈیم جسکا نام رومن بادشاہوں کے خاندان کے نام پر فلاوین ہے (Flavian Amphitheatre) اس میں بھوکے شیر اور باغی غلام اپنی اپنی زیست کی لڑائی لڑتے۔ شیر کو کئی روز تک کھانے سے محروم رکھا جاتا شیر اپنی بھوک مٹانے کے لیے غلام پر پوری طاقت سے جھپٹتا۔غلام کے ہاتھ میں ایک نیزہ اور ایک جال دے دیا جاتا غلام کو اپنی جان بچانے اور شیر کو جال میں قابو کرنے کا کہا جاتا۔اسے شیر کو بہ امر مجبوری مار دینے کی بھی اجازت تھی۔تماشہ بین شیر اور غلام کے ہر ٹکراو پر چیخ چیخ کر غلام کا حوصلہ بڑھاتے۔ یہ انسان اور حیوان کا مقابلہ زیست دیکھنے کے لیے اٹلی کے تمام قبائل کو دعوت دی جاتی تھی، اور باہر سے آنے والے روما کے مہمان ہی تصور کیے جاتے۔بعض اوقات تو یہ مقابلہ پانچ منٹ میں ختم ہو جاتا یا شیر غُلام کے ٹکڑے کر رہا ہوتا یا غُلام شیر کے جسم کو نیزے سے چھید رہا ہوتا۔دوسری صورت میں اگر موقع ملتا تو

شیر کو جال میں پھنسا کر بادشاہ وقت کے حضور پیش کرتا اور بطور انعام اپنی آزادی کی درخواست کرتا۔ بادشاہ اُس کی درخواست قبول کرتا یا نہ کرتا یہ بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا۔ گلیڈی ایٹر بھی غلاموں یا شیر سے مقابلہ کرتے۔ ہر گلیڈ یٹر (Gladiator) کو شیر یا غلام سے مقابلہ کی تربیت دی جاتی۔ یہ گلید یٹرز کمانڈو کی مانند فوج کا حصہ اور شمشیرزنی کے ماہر ہوتے۔ وہ باغی غلاموں یا شیر کو منٹوں میں جال میں پھنسا لیتے۔ ایک وقفہ کی خاموشی کے بعد بولا، بڑے بے وقوف لوگ تھے اپنے سب سے بہادا اور تربیت یافتہ فوجی کو چند لمحوں کی خوشی سے لطف اندوز ہونے کے لیئے غلام یا شیر سے مقابلے کی نظر کر دیتے۔ کبھی کبھی گلیدی ایٹر غلام یا شیر کے ہاتھوں مارا بھی جاتا۔ گو اس کے بدلے میں غلام یا شیر کو بھی مار دیا جاتا۔

ڈرائیور نے پتھروں کے ایک ڈھیر کی جانب اشارہ کر کے بتایا۔ کہ اس جگہ پر ایک بڑا چبوترا بنا تھا۔ بادشاہ وقت اور اس کے مہمان یہ مقابلہ نزدیک سے یہاں بیٹھ کر دیکھتے۔ اس نے سٹیڈیم کی دوسری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں پر کمرے بنے تھے جہاں مقابلہ سے پیشتر شیر اور غلام کو علیحدہ علیحدہ کمرہ میں بند کر دیا جاتا۔ اور مقابلہ کے وقت کمرے کا دروازہ کھولا جاتا۔ سٹیڈیم سے آگے سڑک چار گُنا کشادہ ہوگئی چند کھنڈر بھی سڑک کو احاطہ کئے ہوئے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ پرانے زمانے کے محلات تھے، جن کا بڑا حصہ گرا کر سڑک میں شامل کر دیا گیا ہے۔ شہر کی جیوری یہیں اپنی میٹنگ منعقد کرتی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ ساتویں صدی عیسوی میں افریقہ کے پررونق اور عالیشان شہر کارتھیج کو تباہ کر دینے کا فیصلہ بھی رومن جیوری نے یہیں بیٹھ کر کیا تھا۔

ٹیکسی ڈرائیور ہمیں ایک پرانے قبرستان میں لے گیا جہاں پر تمام قبریں پُختہ تھیں۔ قبروں کے سرہانے سنگِ مرمر کے کتبے نصب تھے۔ ہر کتبہ پر مدفون خاندان کے افراد کی ایک تصویر کندہ تھی۔ ان میں سے ایک ممبر کی تصویر مدہم بنی تھی جیسے اس نے باریک ململ کا نقاب اُوڑھ لیا ہو۔ نقاب کے باوجود چہرہ کی پہچان ممکن تھی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ یہ قبرستان قبل مسیح کا ہے اور اس زمانے کے رَواج کے مطابق مرنے والے کی شکل دھندلی بنائی جاتی جس سے قبر میں مدفون اور اسکی فیملی کی شناخت ہو جاتی۔

اس کے بعد وہ ہمیں ایک بڑے چرچ میں لے گیا ایک بڑے ہال میں بیس فٹ اونچی

چھت کے تینوں اطراف روشندان بنے تھے۔ ہر روشندان میں ایک بزرگ شخصیت کی سہ جہات تصویر کا کتبہ نصب تھا۔ ہر تصویر کے چہرے سے پاکیزگی اور عظمت عیاں تھی۔ گائیڈ نے مزید بتایا کہ یہ تمام تصاویر پوپ اول سے لیکر موجودہ پوپ تک کی ہیں۔

اس کے بعد ڈرائیو ہمیں ویٹی کن سٹی لے گیا۔ مربع شکل کی قلعہ نما عمارت دو مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے بتایا کہ انتظامی طور پر یہ ایک آزاد ریاست کا درجہ رکھتی ہے۔ آبادی اور رقبہ کے لحظ سے دنیا کی سب سے چھوٹی ریاست۔ اس کا انتظام ایک سیکریٹریٹ کرتا ہے۔ ان کی اپنی پولیس اور انصاف کی عدالتیں ہیں۔ اندر جانے والی سڑک پتھروں سے بنی تھی، ہمیں اندر پیدل جانا پڑا۔ ڈرائیور گاڑی کو ایک جگہ پر کھڑی کر آیا اور ہمارے ساتھ ہو گیا۔ یہ کھلی گلی پچاس ساٹھ فٹ کے قریب چوڑی تھی۔ گلی کے دونوں جانب اونچی دیواریں بنی تھیں۔ گلی کے ختم ہونے سے پیشتر دیوار سے ملحق دائیں جانب ایک زینہ بنا تھا۔ زینہ کے بعد دو فٹ اونچائی پر دو بڑے دروازے نصب تھے۔ باہر دو چوکیدار ویٹی کن سٹی کی صلیب کے نشان والی وردی پہنے لمبے لمبے ڈنڈے ہاتھوں میں لئے کھڑے تھے۔ میں نے فوٹو کے لیے اُن کے ساتھ کھڑے ہونے کی درخواست کی لیکن وہ بت بنے خاموش کھڑے رہے دوسری بار میں نے گائیڈ سے کہا کہ وہ ان سے اِٹلی کی زبان میں بات کرے۔ لیکن وہ پھر بھی ایک بت کی طرح ساکن گونگے بہرے خاموش ساکت کھڑے رہے۔

مجبوراً ڈرائیور سے آگے بڑھنے کا کہا۔ پچیس تیس گز آگے سڑک کو دونوں جانب سے ملاتی بیس فٹ اونچائی پر ایک بڑی محراب بنی تھی جو ایک میدان میں کھلتی۔ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار پچیس دسمبر کو پوپ کا خطاب سننے کے لیئے اکٹھے ہوتے۔ اس میدان میں دو لاکھ کے قریب لوگ بیک وقت بڑی آسانی سے سما سکتے تھے۔ اس میدان کی دائیں جانب ایک آٹھ منزلہ عمارت نظر آئی۔ اس بلڈنگ کی ہر منزل کی پچیس کے قریب کھڑکیاں میدان میں کھلتیں۔ گائیڈ نے بتایا کہ اوپر کی دو منزلیں پوپ کی ذاتی استعمال میں ہیں اور دیگر تمام میں ویٹی کن کی سیکریٹریٹ کا عملہ بیٹھتا ہے۔ پوپ کے ذاتی استعمال کی منزلوں میں سفید رنگ کی ایک کھڑکی کی جانب گائیڈ نے اشارہ کیا اور بتایا کہ پچیس دسمبر کو پوپ یہاں کھڑے ہو کر عوام کو خطاب کر کے کرسمس کی مبارک باد دیتے ہیں۔

اس میدان کے سامنے بیس فٹ اونچا اور ایک فٹ بال گراونڈ کی لمبائی جتنا لمبا ہال بنا تھا۔ اس ہال کے اندر اٹلی کے عظیم مصور مائیکل اینجلو نے دس سال تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی زندگی کو تصاویر کی صورت پیش کیا ہے۔ اس گرجا گھر کو سسٹین چیپل (Sistine Chapel) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے اندر ہر وقت کہیں نہ کہیں عبادت ہو رہی ہوتی ہے۔ گرجا گھر میں چھ فٹ مربع کے چند کیبن بنے تھے۔ جن کے باہر مختلف یوروپی ممالک میں بولی جانے والی زبانوں کے نام تحریر تھے۔ عبادت گذار یہاں مراقبہ میں بیٹھتے۔ میرے ذہن میں تجسس پیدا ہوا کہ تنہائی میں بیٹھا جائے۔ ایک کیبن پر لفظ پولش تحریر تھا۔ اس کے اندر کوئی شخص بیٹھا نظر نہ آیا میں اس کے اندر چلا گیا۔ ایک جانب چھوٹا ڈائس بنا تھا۔ اُس پر سر جھکا کر مراقبے میں بیٹھ گیا۔ کافی دیر تک خاموش اس توقع پر بیٹھا رہا کہ شاید کوئی آواز آئے۔ کچھ دیر بعد میں خاموشی سے اُٹھ کر باہر آ گیا۔ گرجا گھر میں عبادت ختم ہونے کے بعد پادری صاحب ڈائس پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے کچھ فاصلہ پر پادری صاحب کے دائیں اور بائیں دو قطاریں بنالیں، اور بڑے ادب سے کھڑے ہو گئے۔ باری باری دونوں لائینوں میں سے ایک فرد آگے بڑھتا، پادری صاحب ایک چھوٹی سفید رنگ کی پتلی سی ٹکیہ ایک چمٹی میں پکڑ کر اُس کی زبان پر رکھ کر چند الفاظ دہراتے۔ میں عبادت میں ان کے ساتھ شامل نہیں تھا پھر بھی میں ایک لائن میں کھڑا ہو گیا۔ بہت سے لوگ جو میری طرح عبادت میں شریک نہ ہوئے تھے میرے پیچھے آ کر کھڑے ہوتے گئے۔ میں لائن میں کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔ جو یہ لوگ اپنی زبان پر رکھوا کر اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کرتے ہوئے خوشی خوشی آگے بڑھ رہے ہیں۔ میں پریشان تھا کہ یہ شراب میں ڈوبی کوئی چیز نہ ہو جسے کھانے کی میرا مذہب اجازت نہ دیتا ہو۔ میں اسی کشمکش میں تھا کہ جان سکوں کہ یہ سفید ٹکیہ کیا ہے کہ میری باری آ گئی۔ پادری صاحب نے بڑی محبت اور شفقت سے میری جانب دیکھا۔ لیکن میں نے دوسری لائن میں کھڑے شخص کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میری اس حرکت پر پادری صاحب پریشان ہو گئے۔ وہ متانت، بزرگی جو پہلے اُن کے چہرے سے عیاں تھی یک لخت غائب ہو گئی چمٹی پکڑنے والے ہاتھ میں لرزش آ گئی معلوم نہیں انہیں کیا وہم ہوا۔ دوسرے شخص کی آمد پر اُنہوں نے وہی متانت اور پاکیزگی دوبارہ چہرہ پر لانے کی ناکام کوشش کی۔ ان کی پریشانی کو بھانپتے ہوئے میں دوسری بار اپنی باری آنے پر ڈائس

کے سامنے جا کر نگاہیں نیچے کیے منہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ پادری صاحب نے بڑی شفقت محبت اور دعائیں پڑھتے ہوئے چمٹی سے ایک ٹکڑا پکڑ کر میری زبان پر رکھ دیا۔ وہ اُبلے چاولوں کی بنی آلو کے چپس جتنی پتلی پھیکی روٹی تھی۔ پادری صاحب میری واپسی پر بہت خوش دکھائی دیئے۔ ان کا وہم دُور ہو گیا تھا۔ گائیڈ نے بتایا کہ روٹی کا یہ ٹکڑا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لاسٹ سپر (Last Supper) کی یادگار ہے۔ لوگ اسی کے تبرک کو حاصل کرنے کے لیے دُنیا کے ہر کونے سے سے یہاں آتے ہیں۔ ویٹی کن سٹی میں کافی وقت صرف ہو چکا تھا گائیڈ نے کہا کہ نیچے بیسمنٹ میں چند پوپ حضرات کی لاشیں رکھی ہیں وہ آپکو دکھاتا لیکن آپ کے جہاز کی روانگی کا وقت قریب ہے، اور ہم ایئر پورٹ سے بہت دُور ہیں۔ بہتر ہے کہ واپس چلیں۔ عراقی ساتھی بھی اَب کوئی خاص دلچسپی نہ لے رہا تھا۔ خیال آیا معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے۔ میں نے گائیڈ کو نیچے چلنے کا کہا۔ شیشے کے بڑے شوکیسوں میں دبلے پتلے لاغر بزرگوں کی ممیاں رکھی تھیں۔ سبھی عمر میں اَسی سال سے کسی طور بھی کم نہ تھے۔ ان کے پاوں راہگذر کی جانب تھے۔ سر پر صلیب کے نشان والی ٹوپی اور پاوں میں کھسہ نما جوتا پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں کی جانب ہر ایک تختی پر پوپ کا نام اور تاریخ وفات اور وقت اور اس کے کارہائے نمایاں درج تھے۔ میں مُسلمان ہونے کی وجہ سے عیسائیت سے مکمل لاعلم تھا۔ میں نے صرف نام ہی پڑھا اور دیگر تفصیلات کو چھوڑ دیا میرا گائیڈ اور عراقی ساتھی بھی جلدی میں تھے۔ مناسب یہی جانا کہ باقی پھر کبھی موقع ملا تو دیکھ لیں گے۔

مغرب سے پیشتر ہم ہوٹل میں تھے ہوٹل پہنچنے پر کرایہ کی ادائیگی پر ڈرائیور سے بحث شُروع ہو گئی۔ وہ ہم سے کرایہ ڈالرز میں مانگ رہا تھا اور ہم اسے طے شدہ چوبیس ہزار لیرے دے رہے تھے۔ ڈالر میں ادائیگی سے اسے دو ہزار لیرا زیادہ مل جاتے۔ میرا عراقی ساتھی اس ڈرائیور سے جھگڑ رہا تھا کہ ڈالر نہیں لیرے دیں گے۔ استقبالیہ میں بیٹھا ہوٹل کا ملازم بھی ٹیکسی ڈرائیور کی حمایت میں بولنے لگا کہ آپ نے یہی طے کیا تھا۔ جب کہ وہ ہمارے جانے کے بعد ڈیوٹی پر آیا تھا۔ مجبوراً ہمیں اسے دو ہزار لیرے مزید دینے پڑے۔

باب نہم

اُوک چُوک لیگاس براستہ کانو

ایک گھنٹہ بعد ائر پورٹ چلا گیا۔ روم کا ائیر پورٹ بقعہ نور بنا تھا۔ ائر پورٹ پر بہت سے چھوٹے بڑے جہاز کھڑے تھے لیگاس (Lagos) کے لیے بورڈنگ شُروع ہو چکی تھی۔ میں نے کاونٹر پر ٹکٹ پیش کیا کاونٹر پر کھڑے صاحب نے ٹکٹ کے علاوہ سات ڈالر ائیر پورٹ ٹیکس مانگا۔ میں نے کہا کہ میں تو ٹرانزٹ پسنجر ہوں مجھ پر ٹیکس نہیں لگتا۔ لیکن پھر بھی وہ ٹیکس لینے پر بضد تھا۔ اتنے میں نائیجیریا ائیر کی ائیر ہوسٹس وہاں سے گزری میں نے اسے مدد کے لیے بلایا۔ اس نے ایک افسر کو بلا کر سارا ماجرا بیان کیا لیکن اس کے کہنے کے باوجود مجھے سات ڈالر مزید دینے پڑے میں نے ائیر پورٹ ٹیکس کی رسید مانگی تو اس نے انکار کر دیا اور میرے دس ڈالر کا اکلوتا نوٹ لیکر باقی کے تین ڈالروں کے لیرے پکڑا دیئے۔

صُبح کاذب کے وقت ہم نائیجیریا کے شمالی ائیر پورٹ کانو پہنچے باہر نکل کر دیکھا، ہر شے اندھیرے کے غلاف میں لپٹی نظر آئی۔ دور افق پر بھی کوئی روشنی کی لکیر نہ تھی۔ امیگریشن آفس تک راستہ دکھانے کے لیئے ایک ہزار وولٹ کا ایک بلب روشن کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دُور دُور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ یہ گھپ اندھیرا زندگی میں پہلی بار نظر آیا جہاز سے اُتر کر نائیجیریا کی سرزمین پر کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ اُٹھائے، درود شریف پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ مجھے اس ملک میں خیریت سے رکھے اور باعزت واپس لوٹنے کا موقع فراہم کرے۔ اس دعا کے بعد واپس جہاز کے اندر چلا گیا کانو میں آدھ گھنٹہ رُکنے کے بعد جہاز نے لیگاس کا سفر اختیار کیا۔

دو گھنٹے کی مزید اُڑان کے بعد جہاز لیگاس ائیر پورٹ پر لینڈ کر گیا۔ امیگریشن کاؤنٹر پر

لائن میں کھڑا تھا کہ مائیکروفون پر آواز آئی کہ کوئی صاحب محکمہ تعلیم میں جائن کرنے کیلیئے اس جہاز سے تشریف لائے ہوں تو ریسپشن کاونٹر پر رپورٹ کریں۔ میں نے لائن چھوڑ دی اور وہاں چلا گیا۔ ایک صاحب نے مجھ سے کاغذات لیے اور فرمایا کہ آپ یہیں رُکیں میں کلیئر کروا کے آتا ہوں کاغذات کلیر کروانے کے بعد سامان لینے میں اس نے میری مدد کی۔ صُبح کا سورج ابھی نمودار نہ ہُوا تھا کہ ائیر پورٹ سے سامان اُٹھائے باہر نکلا۔ دس بارہ حبشی مزدور میری جانب لپکے۔ وہ سب کالے گہرے رنگ کی پھٹی قمیصیں اور پتلونیں پہنے تھے۔ یوں محسوس ہُوا گویا ایک غول مجھ پر حملہ آور ہوا ہے۔ حبشی اتنی تعداد میں پہلی دفعہ دیکھے تھے۔ ہاتھوں میں پکڑا سامان وہیں پھینکا اور واپس ایئر پورٹ لاونج کی جانب بھاگا۔ مجھے واپس جاتا دیکھ کر میرا رہبر وہیں رک گیا۔ میں لاونج کے نزدیک پہنچا تھا کہ اس کی آواز آئی۔

''جنٹلمین کوئی چیز رہ گئی ہے؟ مجھے بتائیں میں جا کر لے آتا ہوں''۔

یہ سنا تھا کہ میں سنبھل کر وہیں رُک گیا۔ خوف دُور ہو چکا تھا۔ وہ سب لوڈر تھے۔ میرے میزبان نے اُنہیں بھگا دیا تھا۔ میزبان مجھے ہوٹل میں لے آیا۔ میرا تمام سامان کمرہ میں پہنچانے میں میزبان نے میری مدد کی اور دوسرے روز آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اگلے روز انتظار کیا لیکن وہ صاحب تشریف نہ لائے اُسی ہوٹل پر مسٹر جان جیری بھی میری طرح وزارت تعلیم کے نمائندے کا انتظار کر رہا تھے۔ مجھ سے وہ ایک روز پیشتر امریکہ سے آیا تھے۔ ہم دونوں نے پروگرام بنایا کہ صُبح دس بجے تک میزبان کا انتظار کیا جائے اگر کوئی نہ آیا تو ہم خود ہی منسٹری آف ایجوکیشن چلے جائیں گے۔ اگلے روز ہم پروگرام کے مطابق محکمہ تعلیم کے دفتر کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ ہوٹل کے باہر سڑک پر پہنچے ہی تھے کہ ہمیں ایک ویگن مل گئی۔ جو لیگاس سے 'یابا' نامی محلّہ جا رہی تھی۔ میرے ساتھی نے لکھ لیا کہ ہم سیمنٹ فیکٹری سے 'یابا' جا رہے ہیں 'یابا' پہنچنے پر ڈرائیور نے اشارہ سے ہمیں سمجھایا کہ سامنے بس سٹاپ سے آپ کو جزیرہ 'عکوئی' کے لیے بس ملے گی وہیں پر محکمہ تعلیم کا دفتر بھی ہے۔ اتفاق سے ہم کھڑے ہی ہوئے تھے کہ جزیرہ 'عکوئی' کی بس آ گئی۔ ہم دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ بس کنڈکٹر جب ٹکٹ دینے کے لیے ہمارے پاس آیا، تو اس نے بتایا 'عکوئی' جزیرہ وہاں سے سترہ میل کے فاصلہ پر ہے اور یہ بس بعد دوپہر تین بجے تک وہاں پہنچے گی۔ اُس وقت تک تمام دفاتر بند ہو چکے ہوں گے۔ وہاں پر آپ کو صرف چوکیدار ہی ملے گا۔ بہتر ہے کہ آپ یہیں اُتر

جائیں۔اس نے بس رُکوا کر ہمیں وہیں اُتار دیا۔ دونوں واپس پیدل ہی 'یابا' کے ویگن سٹاپ کی جانب چل دیئے۔ دونوں آدھ گھنٹہ تک چلتے رہے۔لیکن کوئی ویگن سٹاپ نظر نہ آیا۔ جب چلتے چلتے تھک گئے۔تو مسٹر جان جیری نے ایک راہ گیر سے پوچھا کہ 'یابا' کا ویگن سٹینڈ کدھر ہے جواب میں اُسنے کہا کہ آپ 'عابا' کے ویگن سٹینڈ کا پوچھ رہے ہیں یا 'یابا' کے کا؟ 'عابا' تو یہاں سے چالیس میل دُور ہے وہاں بسیں جاتیں ہیں ویگن نہیں جاتی آپ پہلے صحیح بتائیں کہ آپ کو جانا کہاں ہے۔ یہ کہہ کر وہ ہمارا جواب سنے بغیر آگے بڑھ گیا۔اس کے بعد جس سے بھی پوچھا اُس نے وہی سوال دہرایا کہ آپ 'عابا' کا پوچھ رہے ہیں کہ 'کابا' کا؟ اَب 'یابا' سے ملتے جلتے ایک اور نام 'کابا' کا بھی اضافہ ہوگیا۔

کسی حد تک وہ درست بھی تھے۔'یابا' میں تو ہم کھڑے تھے۔ہمیں زیادہ سے زیادہ ویگن سٹینڈ کا پوچھنا چاہیے تھا لہٰذا وہ سب یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے تلفظ کی غلطی ہے۔ہم 'یابا' میں کھڑے ہو کر 'عابا' یا 'کابا' کے ویگن سٹینڈ کا ہی پوچھ سکتے ہیں۔'کابا' شہر تو لیگاس کے شمال میں بیس میل کے فاصلہ پر تھا۔اور 'عابا' لیگاس کے مشرق میں چالیس میل کے فاصلہ پر تھا۔دونوں مختلف ریاستوں میں تھے 'عابا' میں 'ایبو' اور 'کابا' میں 'یوربا' قبیلہ رہتا تھا۔لیکن کسی نے ہمیں یہ نہ بتایا کہ ہم جہاں کھڑے ہیں وہ ''یابا'' ہے اور ویگن سٹینڈ پچھلی گلی میں رہ گیا ہے۔ہم پھر آگے چل پڑے۔میں پیدل چل چل کر نڈھال ہوگیا۔پچھلے دس بارہ سال سے میں نے پیدل اتنا لمبا سفر نہ کیا تھا۔میرا جی اب کہیں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔جیری جو ساتھ آرہا تھا بولا۔مسٹر فاروق بس ایک ہی سٹاپ آگے گئی تھی اتنا تو وہ آگے نہ گئی تھی۔دونوں ایک جگہ رک گئے۔چاروں طرف نگاہ دوڑائی کوئی ویگن کہیں سے آتی یا کہیں جاتی نظر نہ آئی۔تھوڑا رکنے کے بعد پھر چلنا شُروع کر دیا بھوک سخت لگ رہی تھی۔گھڑی دیکھی پاکستان وقت کے مطابق بعد سہ پہر چار بج رہے تھے۔کوئی ہوٹل نظر نہ آیا کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر کچھ کھا پی لیتے ،جیری ہر راہگیر سے راستہ پوچھ رہا تھا۔میں نے ایک صاحب کو اپنی جانب آتے دیکھا۔جو لباس کے لحاظ سے دیگر اشخاص سے مختلف دکھائی دیا۔اس نے اپنے لباس پر ایک اضافی چغہ بھی پہن رکھا تھا، ہمارے پاس آیا اور انگریزی میں سوال کیا۔

''آپ کو جانا کہاں ہے؟''

جیری نے اسے کہانی تفصیلاً سنائی کہ ہم کیوں یہاں آئے لوکل بس نے ہمیں اتار دیا۔کس طرح سے

ہم واپسی کا راستہ بھول چکے ہیں جس ہوٹل میں ہمیں ٹھہرایا گیا ہے اُسکا نام بھی غیر معروف ہے۔ سیمنٹ فیکٹری کا نام بھی یاد نہیں۔آخر لیگاس میں یابا کے نزدیک کتنی سیمنٹ فیکٹریاں ہوسکتی ہیں۔ ہم سے ویگن والے نے دس 'کوبؤ' لیے تھے۔اُس نے کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں میں آپ کو ہوٹل میں چُھوڑ آتا ہوں۔آپ اس وقت لیگاس کے محلّہ یابا میں نہیں لیگاس کے محلّہ 'سرولیرے' میں پھر رہے ہیں۔یابا یہاں سے تین میل پیچھے رہ گیا ہے۔دونوں محلے اسی سڑک 'اکورو ڈو' پر واقع ہیں۔اس نے ایک ٹیکسی والے کو روکا اور ہمیں گاڑی میں بیٹھنے کا کہا میں نے اسے کہا ہم ویگن سے ہی واپس جائیں گے۔لیکن وہ نہ مانا اور ہمارے ساتھ گاڑی میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔اس نے ڈرائیور کو اپنی زبان میں منزل سمجھائی۔راستہ میں اس نے بتایا کہ اس کا تعلق شمالی نائیجیریا کے ہونسہ قبیلہ سے ہے اور وہ مُسلمان ہے۔اور لیگاس میں ٹھیکہ داری کرتا ہے۔

اس نے بتایا کہ لیگاس میں یوربا اور ایبو قبیلہ کے لوگ آباد ہیں ان دونوں قبیلوں کے لوگوں کی یہ خوبی یا خامی ہے کہ وہ کسی کو نہ درست رائے دیتے ہیں نہ ہی صحیح راستہ بتاتے ہیں۔الٹا بھٹکے ہوئے لوگوں کو ذلیل وخوار کرنے کو برا نہیں سمجھتے۔اور آپ ان کے بتائے راستہ سے اَپنی مَنزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔بات میرے ذہن میں رہ گئی۔نائیجیریا میں ہمیشہ اپنی مَنزِل خود تلاش کرو۔

ہونسہ قبیلہ کا فرد ہمیں لیکر سیمنٹ فیکٹری پہنچا وہاں سے ہم نے ڈرائیور کو ہوٹل کا راستہ بتایا ہوٹل پہنچ کر ہم ڈائننگ ہال میں بیٹھ گئے۔اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کونسی شراب آپ کے لیے منگواؤں۔میں نے اسے بتایا کہ میں تو مُسلمان ہوں شراب نہیں پیتا اور نہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ آپ کے لیے منگوا سکوں۔اس نے جواب میں کہا کہ میں بھی مُسلمان ہوں آپ کے لیے بئیر منگواؤں وہ تو الکحل سے پاک ہوتی ہے۔میں نے دوبارہ انکار کر دیا اور پھر اس نے جیری سے یہی سوال کیا اور دونوں نے مل کر شراب پی اور ایک دوسرے کی صحت اور آسانی مشکلات کی دعا بھی کی۔

میں ان کی محفل سے اُٹھ کر کمرے میں چلا گیا، میرے کمرے میں کوئی اور صاحب آرام فَرما تھے، کاؤنٹر پر آیا سوال کیا کہ میرے کمرے میں کون ہے اور میرا سامان کہاں ہے۔استقبالیہ ملازم نے بتایا کہ اس نے سامان امریکی کے کمرہ میں شفٹ کر دیا ہے۔دوسرے روز میزبان آیا

میں نے شکایت کی کہ میری غیر حاضری میں میرا سامان دوسرے کمرہ میں اجازت کے بغیر کیوں شفٹ کیا گیا۔ وہ ہوٹل مینجر پر بہت ناراض ہُوا اور اُس نے مجھے دوسرے ہوٹل میں شفٹ کر دیا۔

شکار کا گوشت

اس ہوٹل میں میرا ساتھی قبرص کا ایک یونانی عیسائی تھا۔ قبرصی کو کسی ایئر کمپنی نے اپنے مہمان کے طور وہاں ٹھہرایا ہوا تھا۔ اس ہوٹل میں سات روز تک قیام کیا۔ ہم دونوں اُکثر کھانے پر اکٹھے ہوتے ایک روز دونوں صُبح ناشتہ کر رہے تھے کہ کچن سے بال جلنے کی بو آنی شُروع ہو گئی۔ صُبح صُبح ناشتہ کے وقت بالوں کے جلنے کی بو غیر متوقع تھی۔ قبرصی نے میری توجہ اس جانب مبذول کروائی۔ نیز کہا کہ جا کر دیکھو کہ بو کہاں سے آ رہی ہے۔ میں نے ابھی ناشتہ ختم نہیں کیا تھا۔ میں نے قبرصی کو کہا۔

''میں ابھی فارغ نہیں ہُوا۔ تم جا کر دیکھ آؤ۔''

قبرصی اُٹھ کر کچن میں چلا گیا مگر اُبکائیاں کرتا واپس لوٹا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟''

قبرصی سنک پر کھڑا الٹی کر رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ کچن کی جانب اشارہ کیا۔ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ خود جا کر دیکھو۔ میں دیکھنے کے لیے کچن میں چلا گیا۔ دیکھا کہ باورچی کلو بھر وزن کا ایک چوہا چولہے پر رکھ کر اس کے بال صاف کرنے کے بعد اُس کا پیٹ صاف کر رہا تھا۔ قبرصی تو باہر ڈائنگ روم میں الٹی کر رہا تھا۔ میں باورچی خانہ میں کھڑا ہو گیا۔ ایسے محسوس ہُوا کہ پہلے جتنا گوشت اس ہوٹل میں کھایا یا اس سے پہلے بھی کسی نائیجیرین ہوٹل میں کھایا یا نائیجیریا ائیر میں کھایا وہ سب کسی غلیظ چیز چوہے چھپکلی وغیرہ کا تھا۔ باورچی بڑا پریشان ہُوا وہ سمجھ گیا کہ ہم دونوں کیوں الٹی کر رہے ہیں۔

فوراً بولا۔

''یہ آپ لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ یہ صرف ہمارے ملازم ہی کھائیں گے۔''

معدہ جلد خالی ہو گیا پر تھوڑی دیر تک ابکائیاں لیتا رہا۔ نڈھال ہو گیا اٹھا تو ٹانگوں میں کمزوری محسوس ہوئی۔ چہرہ پسینہ سے شرابور اور ناک بہہ رہی تھی۔ کچن سے باہر ڈائننگ روم تک خود ہی ہمت کر کے آ گیا۔ میز پر سر ٹیک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر گذر جانے کے بعد طبیعت ذرا سنبھلی تو کمرے

میں آ کر لیٹ گیا۔ قبرصی تو پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

محکمہ تعلیم کا نمائندہ جب آیا تو اس سے معذرت کے لیے باورچی اور ہوٹل کا مالِک پہلے سے استقبالیہ پر اس کے منتظر بیٹھے تھے۔ وہ ان دونوں کو ہمراہ لے آیا۔ میری حالت دیکھ کر سخت پریشان ہُوا اور واپس ریسپشن پر چلا گیا۔ دفتر میں کسی سے بات کی پھر اس نے مینجر صاحب سے انگریزی کی بجائے کسی اور زبان میں بات کی۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔ لہجے کی تندی وتلخی سے محسوس ہُوا کہ وہ ان پر خفا ہو رہا ہے۔ ہوٹل مینجر نے پچھلے سات دنوں کا مینو مجھے اور محکمہ کے نمائندے کو دکھایا۔ اور انگریزی میں بات شروع کر دی تا کہ میں بھی سن لوں۔

''ملاحظہ فرمایں شکار کا گوشت پورا ہفتہ میں کبھی نہیں آیا''

''تو آج کیوں ہے۔''

پچھلے ہفتہ میں گائے کا گوشت خود لایا۔ خدا کی قسم میری زبان پر اعتبار کریں۔ اُس نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔

''اور آج کیا ہے۔ یہ موٹا چوہا آج آپ کیوں لائے۔''

اس چوہے کو ہمارے جونیئر نے آج صبح جنگل سے پکڑا ہے۔ یہ ہمارے ملازم کھائیں گے۔

''اچھا اگر انہیں ہی کھانا ہے تو وہ اسے یہاں کیوں لائے۔''

یہ ان کی غلطی ہے مہمانوں کے ناشتہ ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ میں انہیں ملازمت سے فارغ کر رہا ہوں۔

میں ان کی انگریزی اور دلیل سن کر محظوظ ہو رہا تھا۔ وہ بغیر کسی جھجک کے الٹی سیدھی انگریزی میں اپنا مافی الضمیر بیان کر رہے تھے۔

نمائندہ واپس ہوٹل کے استقبالیہ میں گیا اور جلد ہی لوٹ آیا۔ کہنے لگا کہ اس نے لیگاس میں فایف سٹار ہوٹل میں کمرہ بک کروا دیا ہے۔ وہ ہوٹل دفتر کے پاس ہی ہے اس نے سامان ٹیکسی تک لیجانے میں میری مدد کی۔ مجھے نئے ہوٹل کے کمرہ میں چھوڑ کر دفتر چلا گیا۔

یہ خوبصورتی سے سجا اعلیٰ فرنیچر والا کمرہ تھا جس میں ایک ٹی وی سیٹ بھی رکھا تھا۔ یہ ایک شاہانہ رہائش تھی۔ ڈبل بیڈ کے ساتھ سائیڈ ٹیبل تھی۔ جس پر خوبصورت ٹیبل لیمپ سجا تھا۔ درمیانی فرش پر ایک قالین اور کونے میں ڈسٹ بن کے علاوہ ایک الماری کے ساتھ ٹیبل پر ایک انٹر کام رکھا

تھا۔ یہ پانچ منزلہ ہوٹل تھا جس میں ڈبل بیڈ کے کئی کمرے تھے۔ ناشتہ کا ایک لمبا مینو تھا۔ ایک روز کے مکمل آرام کے بعد طبیعت سنبھل گئی۔ سادہ ناشتہ کیا اور دفتر آ گیا۔

سکوٹو سے بیڈا

میری فائیل پہلے سے ہی تیار ہو چکی تھی میں نے اپنے کوائف کی تصدیق کے لیے سرٹیفیکٹس کی نقول اور چار فوٹو گراف فائیل میں لگائیں۔ فائل مکمل ہو جانے کے بعد میں نے فائل متعلقہ افسر کو پیش کی۔ سپرنٹنڈنٹ نے دفتر کے بند ہونے سے پیشتر جہاز کا ٹکٹ اور میرا پاسپورٹ دے کر مجھے نائیجیریا کے شمالی صوبہ سکوٹو میں رپورٹ کرنے کا حکم دیا۔ ایک گاڑی دی جو پہلے مجھے ہوٹل لے گئی، اور پھر وہیں سے ائیر پورٹ چھوڑ آئی۔ دوپہر کی فلائٹ سے سکوٹو پہنچا۔ ائیر پورٹ پر لینے کے لیے تو کوئی نہ آیا تھا۔ میں نے ایجوکیشن منسٹری کے لیئے ایک ٹیکسی لی اور دفتر پہنچ گیا۔ فیڈرل گورنمنٹ کا نمائندہ لیزان افسر دفتر میں میرا منتظر تھا۔ میرے آنے کی اطلاع لیگاس ہیڈ آفس نے اسے پہلے سے کر دی تھی۔ اُسنے مجھے گاڑی میں سکوٹو کے فور سٹار ہوٹل ’’سکوٹو ہوٹل‘‘ لے جا کر ٹھہرا دیا۔

سکوٹو شہر شمالی صوبہ سکوٹو کا ہیڈ کوارٹر اور صحرائے اعظم کی جنوبی سرحد پر واقع بڑا شہر ہے۔ اس کے بعد ریگستان کا خشک اور بے آب گیاہ علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ایک مُسلم اکثریتی صوبہ ہے۔ ان کے دفتری اوقات بڑے عجیب تھے۔ تمام دفاتر طلوع آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد شُروع ہو جاتے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کام کے بعد، ایک گھنٹہ ناشتہ کا وقفہ ہوتا، دو گھنٹہ کام کرتے، اور آدھ گھنٹہ چائے کا وقفہ ہوتا اور پھر دو گھنٹہ کام کرنے کے بعد دفتر میں بیٹھے سائلوں کو دوسرے روز آنے کا کہہ کر دفتر کو بند کر دیتے۔ کام کی نوعیت اور مرحلہ کو ملحوظ خاطر نہ لایا جاتا۔ چپڑاسی بھی دفتر میں بیٹھے افسر کو وقت یاد کراتے اور اس سے اجازت کے بغیر ہی دفتر کی کھڑکیاں اور روشنیاں بند کرنا شروع کر دیتے۔ البتہ افسر کی مصروفیت کو دیکھتے ہوئے اُس کو دفتر کی چابیاں پکڑا، کر الوداع کہہ جاتے۔
اب میں بھی ہوٹل سے اُس وقت نکلتا جب دفتر میں ناشتہ یا چائے کا وقفہ ہوتا نتیجتاً جونہی پہنچتا دفتر دوبارہ کھلنے کا وقت شُروع ہو چکا ہوتا، یا ہونے کے قریب ہوتا۔ اس طرح کام کروانے میں آسانی ہوتی۔ سرکاری ملازم اپنے افسر بالا کا ہر حکم، غلط ہو یا صحیح بلا اعتراض مانتے۔ ہر نائیجیرین کو

ملازمت جائن کرنے سے پیشتر فوجی تربیت لینا لازمی تھا جس کی تکمیل کے بعد اُن سے ایک حلف لیا جاتا جس میں باقی شرائط کے علاوہ تحریر تھا۔
’’میں افسران بالا کا ہر حکم مانوں گا لیکن ان کا غلام نہیں بنوں گا۔‘‘
اس کے باوجود وہ ہر کام بڑی تابعداری سے کرتے۔

ایک دفعہ ہم دو پاکستانی دفتر میں وقفہ کے دوران شہر کی سیر کو چلے گئے۔ لاری اڈہ بازار میں تھا میرا ساتھی اندر اڈہ دیکھنے کے لیے ایک گیٹ میں داخل ہُوا گیٹ کیپر نے روک دیا گیٹ کیپر نے ایک بورڈ کی جانب اشارہ کیا۔
تحریر تھا باہر جانے کا راستہ۔
’’یہ تو گاڑیوں کے لیئے ہے۔‘‘
وہ نہ مانا مجبوراً ہمیں دوسرے راستے سے اندر جانا پڑا۔ وہاں پھر روک دیا گیا۔
’’ماسٹر اندر جانے کے لیئے ٹیکس دو‘‘
’’یہ ٹیکس تو بس یا ٹرک کے لیئے ہے ہم تو پسنجر ہیں
’’ماسٹر پیسے دو یا اندر نہ جاؤ‘‘
مجبوراً ہمیں ایک ایک کوبو (سینٹ) دے کر اندر جانے کی اجازت ملی۔ اڈہ میں ایک ٹرک سامان سے لدا کھڑا تھا۔ آخر میں تین فٹ جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ ٹرک ڈرائیور نے خالی جگہ پر لکڑی کا مضبوط تختہ رکھ دیا۔ اس پر سواریوں کو بٹھا دیا۔ سواریوں کی حفاظت، اور آرام کے لیئے ایک لمبا لوہے کا پائپ ٹرک کے آر پار لگا دیا۔ سواریوں نے اس پائپ کو ہاتھوں سے تھام لیا اور وہ سب اَب آرام میں تھے۔ ٹرک ڈرائیور کی سیٹ لکڑی کا ایک تختہ تھی جس کے اوپر کوئی گدی نہ رکھی تھی، کہ اس سخت تختہ پر ڈرائیور نیند کا شکار نہیں ہوتا۔ تھوڑی دیر بازار میں گھومنے کے بعد واپس آ گئے۔ شہر کے اندر جگہ جگہ پر تحریر تھا۔
’’نیم کا درخت لگاؤ اور صحرا کو روکو۔‘‘
اَب ہم دونوں روزانہ شہر چلے جاتے ایک ماہ تک ہوٹل میں ٹھہرانے کے بعد سکوٹو سے مجھے نائیجیریا کے وسطی شہر بیڈا کالج میں رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔
صُبح صُبح ایک پیوجٹ (peugeot) سٹیشن ویگن مجھے لینے ہوٹل آ گئی۔ ڈرائیور نے

میرا تمام سامان گاڑی میں رکھا۔ سفر پر روانہ ہونے والے تھے کہ سیکریٹری ایجوکیشن تشریف لائے۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد اُنھوں نے مجھے بتایا کہ گاڑی میں آنے جانے کا پٹرول ڈلوادیا گیا ہے۔ مزید ڈلوانے کی ضُرورت نہیں۔ ڈرائیور اپنے کھانے کا بندوبست خود کرے گا۔ آپ کو اپنے کھانے کا بندوبست خود کرنا ہوگا۔ بیڈا جانے کے دو راستے ہیں ایک براستہ ضورو، جو نزدیک تریں ہے۔ البتہ کثرت استعمال سے سڑک ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی ہے۔ اگر آپ اس راستہ سے جائیں تو ڈرائیور آپ کو شام تین اور چار بجے کے درمیان بیڈا پہنچا دیگا۔ دوسرا راستہ 'کاٹسینا' سے ہوکر جاتا ہے۔ اس راستہ کی سڑک ہموار ہے۔ مگر اسی میل کی سڑک ریگستان سے گزرتی ہے۔ اس راستہ میں کوئی درخت، جھاڑی، موڑ یا جنگلی حیات کچھ بھی نہیں راستہ مکمل سیدھا ہے۔ اس یکسانیت کے باعث اکثر ڈرائیور نیند کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اگر خیریت سے پہنچ گئے تو مغرب کے بعد سات بجے تک بیڈا پہنچیں گے۔ ڈرائیور اسی سے جائے گا جو راستہ آپ پسند کریں گے۔ ڈرائیور کو کہیں رُکنے کی اجازت نہیں۔ البتہ جہاں آپ کہیں گے یہ رکے گا۔ پھر اُنھوں نے ہمیں خُدا حافظ کہا۔ اور ہم بیڈا کے لیئے روانہ ہوگئے۔

گاڑی تیز رفتار چلتی رہی، چار گھنٹے کے بعد ہم گھنے جنگل سے گزر رہے تھے۔ جنگل ذرا کم ہُوا تو کھیت نظر آنے لگے۔ کہیں کہیں لوگ کھیتوں میں کام کرتے نظر آجاتے۔ دو گھنٹہ کے مزید سفر کے بعد ہم ایک بستی سے گزر رہے تھے۔ گاؤں کا ہر فرد گھر سے باہر تھا۔ ہر شخص ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور دوسرے ہاتھ میں ٹین کا ڈبہ یا دھات سے بنی کوئی چیز پکڑے چیخ رہا تھا۔ تمام لوگ جذباتی ہورہے تھے اور برتن یا ٹین پر ڈندے برسا کر شور کررہے تھے۔ میں نے ڈرائیور سے دریافت کیا، کہ کیا یہ کوئی تہوار ہے؟ اس نے مجھ سے کہا آپ حکم کریں میں دریافت کرتا ہوں۔ اس نے گاڑی کو روکا لیکن انجن اور دروازہ کو بند نہ کیا۔ سب سے پہلے ملنے والے شخص سے وجہ دریافت کی اور جلد ہی لوٹ آیا۔ اس نے اپنی انگریزی میں کچھ بتایا، میں یہ سمجھ سکا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ ایک ہاتھی کا بچہ گنے کے کھیت سے گنا کھاتے بھول کر شہر آگیا لوگوں نے چیخ کر اور برتنوں پر ڈنڈے برسا کر شور و غوغا کیا اور اسے پتھر مار کر ڈرایا اور واپس جنگل کی جانب بھگا دیا۔ دو پہر کے وقت ایک بڑے قصبہ ضورو سے گزر رہے تھے۔ ایک کھلے میدان میں میلے کا سماں تھا۔ میں سمجھا کہ شاید یہاں بھی کوئی بھٹکا ہُوا ہاتھی یا کوئی اور جانور آگیا ہے۔ لیکن جب پاس سے گزرے تو دیکھا کہ عورتیں بچے

اور مرد سب سکون سے گھوم پھر رہے ہیں۔

ڈرائیور اپنی انگریزی میں بولا۔

''کیا آپ کچھ فروٹ خریدیں گے''

پچھلے چار گھنٹے سے سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مجھے اب تھکاوٹ کا احساس ہورہا تھا۔ سوچا چلو دومنٹ کے لیے گھوم لیتا ہوں۔ ڈرائیور سے دریافت کیا کہ یہ کون سا قبیلہ ہے۔ وہ بولا 'فلانی'۔ میں سمجھ گیا کہ یہ انگریزوں کی آمد سے قبل نائیجیریا کے حکمران تھے۔ یعنی یہ اُس قوم کے فرد تھے جن سے انگریزوں نے حکومت چھینی۔

فلانی ہر لحاظ سے آریہ دکھائی دیتے، ان کے رنگ گندمی اور ان کے نقش آریہ نسل کے تھے۔ بہت سے مرد اور عورتیں اپنا رنگ کالا کرنے کے لیے چہرے اور جسم پر سرمہ کے ٹیٹو سے پھول بنوائے ہوئے تھے۔ اس علاقہ میں غربت اپنی انتہا کو دیکھی۔ اکثر عورتیں گھٹنے سے اُوپر ایک تہمد باندھے تھیں۔ چند جوان عورتوں نے تہمد کے علاوہ سینہ پر باڈی پہن رکھی تھی، یہی ان کا مکمل لباس تھا۔ کسی عورت یا بچی کو قمیص کی طرز کا لباس پہنے نہ دیکھا۔ بعض عورتوں نے ایک سال سے کم عمر کے چھوٹے بچوں کو کپڑے میں لپیٹ کر پیچھے کمر سے باندھ رکھا تھا۔ بچے کا سر دائیں یا بائیں جانب سامنے کُھلی فضاء میں تھا۔ چھوٹے بچے بغیر لباس کے آزادی سے گھوم پھر رہے تھے۔ ایک عورت تہمند کے بغیر دھوپ میں اکیلی بیٹھی اپنے آپ سے ہی باتیں کررہی تھی۔ مردوں نے شلوار اور قمیص کی قسم کا لباس پہنا ہُوا تھا۔ شلوار کے تنگ پائینچے کی حد گھٹنے سے چھ انچ اُوپر تھی شلوار کی مکمل اونچائی بارہ سے چودہ انچ تھی۔ ان کی شلوار کا گھیر تو مکمل تھا لیکن پائنچہ چُھوٹا تھا۔ آستین کے بغیر قمیص کی لمبائی پیٹ تک ہی ہوتی۔ نئی قمیص آستین کے بغیر ہی سلواتے۔ ایک فلانی لڑکا بھی وہیں گھوم رہا تھا اس نے بالوں میں کوڑیاں پرو رکھی تھیں اور بکری کی کھال لپیٹے اکڑ کر چل رہا تھا۔

ہر فلانی مرد کی بغل میں تلوار اور گردن کے پیچھے گول لوہے کا ایک چھجے والا ٹوپ لٹک رہا ہوتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی تلوار تیز ہوتی ہے۔ جو جنگلی جانوروں سے دفاع یا جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ ہر فلانی مرد کے ہاتھ میں ریوڑ ہانکنے کے لیئے لمبی چھڑی تھی۔ کسی فلانی کے ساتھ کُتا نہ دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ کتا کاٹ کر کھا لیتے ہیں۔ فلانی مسلمان نماز اور روزہ کے سخت پابند تھے۔ ضورو فلانی لوگوں کی آخری بستی تھی۔

لوکل گاہکوں کے علاوہ ایک سفید فام بھی وہاں گھومتا نظر آیا۔ اُس نے گردن میں ایک کیمرہ لٹکا رکھا تھا اور دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈال کر ہاتھوں کو جیب میں واضع کرنے کے لیئے دائیں بائیں پھیلا رکھا تھا۔ میں نے چند کیلے اور ایک گنا خریدا اور گاڑی میں آ گیا۔ کیلے کافی موٹے اور تقریباً دس انچ لمبے تھے ایک کیلا کھانے کے بعد دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔ شغل کے لیے گنے کے چار ٹکڑے کیے وہ آٹھ فٹ لمبا اور ڈیڑھ انچ کے گھیر میں تھا۔ میں نے اسے ذرا ٹیڑھا کیا وہ ٹوٹ گیا۔ میں نے ایک ٹکڑا خود رکھ لیا دوسرا ڈرائیور کو دینے کے لیئے اس کی جانب بڑھایا اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''جناب 'شکر تو عورتیں کھاتی ہیں۔''

ضورو کے بعد چھوٹے چھوٹے قصبے تو بہت ملے لیکن ایسا کوئی شہر یا ہوٹل نظر نہ آیا جہاں لوگ بیٹھے کچھ کھا پی رہے ہوں۔ نائیجیریا وقت کے مطابق دن کے دو بج چکے تھے کہ ڈرائیور نے ایک چھپر ہوٹل کے سامنے گاڑی روک لی۔ ڈرائیور بولا۔

''میں کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ آئیں کھانا کھائیں، پیسے میں دے دونگا۔''

وہ یہ سمجھا کہ شاید میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

میں اس کے ساتھ چھپر ہوٹل میں چلا گیا۔ بہت لوگ زمین پر بیٹھے چاول کھا رہے تھے۔ ایک مٹی سے بنے چولھے میں درخت کے تنا کا ٹکڑا سلگ رہا تھا۔ چولہے پر ایک صاف شدہ تارکول ڈرم کا نصف حصہ گرم پانی سے بھرا رکھا تھا۔ اس ڈرم میں بہت سے استعمال شدہ کٹورے پڑے تھے۔ جنہیں صاف کرنے کے بعد ہوٹل کا مالک اس میں مزید چاول بھر کر گاہکوں کو دے رہا تھا۔ میں ہوٹل میں گیا اور گھوم کر واپس گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے کوئی چیز کھانے کی نظر نہ آئی۔ مجھے واپس جاتے دیکھ کر ایک پتلون پہنے گاہک اُٹھ کر میرے پاس آیا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔

''آپ آئیں چاول اچھے پکے ہیں۔''

میں نے انگریزی میں ہی اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے کہا مجھے بھوک نہیں ورنہ میں کھا لیتا۔

شام چار بجے کے قریب ہم بیڈا میں تھے۔ ڈرائیور سیدھا پرنسپل صاحب کے گھر لے گیا۔ تیس پینتیس سال کی عمر کا شخص کپڑے کی بنی گول پھندنے کے بغیر ترکی ٹوپی سر پر رکھے ننگے پاؤں باہر ہی گاڑی کے پاس آیا۔ میرے لیے ایک کرسی منگوائی اور خود کار کے اگلے مڈگارڈ کے ساتھ

ٹیک لگا کے ایک گھٹنے پر ہاتھ رکھے رکوع کی حالت میں کھڑا ہو گیا۔ پرنسپل صاحب نے ایک بھاری بھر کم چغہ پہن رکھا تھا۔ جو چوڑائی میں آٹھ اور لمبائی میں تقریباً چھ فٹ تھا۔ ہر دوسرے لمحہ چغہ کا ایک بازو ان کے کندھے سے سرک جاتا جسے وہ بار بار درست کرتے۔ وہ اسی حال میں سر پر ٹوپی رکھے ننگے پاؤں مجھے ایک ہوٹل میں لے گئے۔ اور ایک رات کے لیے ٹھہرا دیا۔ بیڈا ٹیچرز کالج میں تعیناتی تھی۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہُوا کہ ایک تین بیڈ کا مکمل فَرنشڈ گھر میرے لیے پہلے سے مختص تھا۔ وہیں رہائش اختیار کر لی۔

ایک روز مغرب کے وقت پیٹ میں دائیں جانب درد محسوس ہوا شک ہوا کہ کہیں اپینڈکس کا درد نہ ہو۔ میں حفظِ ماتقدم کے طور پر ہمسائیگی میں رہتے ایک انڈین ہندو پروفیسر مسٹر مانک کے گھر چلا گیا۔ اُس کے والد، تقسیم ہند سے پیشتر لاہور میں موہنی روڈ کے رہائشی تھے اور پاکستان قائم ہو جانے کے بعد دِلی چلے گئے تھے۔ لاہور میں اُن کا ایک پرنٹنگ پریس بھی تھا۔ مسز مانک کے والد ڈیرہ اسماعیل خان کے رہنے والے تھے۔ جب اُن کے والد نے پاکستان سے ہجرت کی تو وہ ماں کی گود میں دودھ پیتی بچی تھی۔ اُن کا مکان میرے مکان سے سو گز کے فاصلے پر تھا۔ درمیان میں بہت سے درخت اور ایک فٹ اونچی ریگستانی گھاس اُگی تھی۔ جب میں پہلی بار اپنے مکان میں آیا تو پرنسپل صاحب نے نصیحت کی تھی، کہ مغرب کے بعد گھر سے نہ نکلوں۔ یہ نصیحت تو مجھے یاد تھی۔ لیکن یہ بھی خیال آیا کہ اپنڈیکس کا علاج وقت پر نہ کیا جائے تو یہ جان لیوا بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ رات کے بارہ بجے اس ریت سے گزرنے اور کسی شریف آدمی کے گھر جانے کی بجائے ابھی چلا جائے۔ میں نے شام کے جھٹ پٹے میں ریت اور گھٹنے تک اونچی اُگی ریگستانی گھاس پر پیدل چلنے کا خطرہ لیا۔ اور درد کی شدت کے باوجود مسٹر مانک کے گھر پہنچ گیا۔ وہ فیملی کے ساتھ لاونج میں بیٹھے گپ لگا رہے تھے میری آواز سن کر جلدی سے باہر آئے دیکھا کہ میں اُن کے گھر میں داخل ہونے والی سیڑھی پر بیٹھا ہوں۔ مجھے فوراً گھر کے اندر لے گئے اور آمد کی وجہ دریافت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ شاید اپنڈکس کا درد ہے۔ اگر آپ مجھے ہسپتال لے چلیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اِن کی بیگم صاحبہ نے بھی یہ جاننے کے بعد کہ شاید مجھے اپنڈکس کا درد ہے۔ اپنے خاوند سے کہا کہ اس وقت تو ہسپتال میں کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہ ہوگا۔ چلیں مسز جان کیرالہ والی لیڈی ڈاکٹر کے گھر چلتے ہیں۔ انہوں نے گاڑی نکالی بچوں کو بھی ساتھ لیا اور

مجھے لیکر مسز جان کے گھر چلے گئے۔ وہ لوگ رات کا کھانا کھانے کے بعد بچوں کو لے کر بیڈ روم میں جا چکے تھے۔ مسٹر مانک گاڑی اُن کے بیڈ روم کے سامنے لے گئے اور گاڑی کی لائٹ کو تیز اور آہستہ کر کے مسٹر جان کو آواز دی۔ مسٹر جان، مسٹر جان کیا آپ گھر پر ہیں۔ وہ ہندوستان کے صوبہ کیرالہ کا رہنے والا تھا۔ وہ اردو بولنا نہیں جانتا تھا۔ ان کی مادری زبان ملیالم تھی۔ انہیں اردو سمجھ تو آجاتی مگر بول نہ سکتے مسٹر جان نے کھڑکی سے ہی انگریزی میں دریافت کیا۔

''آپ کون لوگ ہیں اور اس وقت کیوں تشریف لائے ہیں''

مسٹر مانک گاڑی سے باہر نکلے اور مسٹر جان سے انگریزی میں مخاطب ہو کر بتایا۔

''ایک پاکستانی جو چند روز پیشتر نائیجیریا آیا ہے۔ غالباً اسے اپنڈکس کی شکائیت ہے۔''

اپنڈکس کا نام سنتے ہی مسٹر جان باہر آ گئے۔ ہمیں خوش آمدید کہا اور اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ مسز جان نے مجھے ایک صوفے پر دراز ہونے کا کہا اور پیٹ کو اچھی طرح سے چیک کرنے کے بعد بولی کہ فی الحال خطرے کی کوئی بات نہیں اگر اپنڈکس ہوا تو کل دوپہر تک واضح ہوگا۔ وہ اپنے کمرہ سے تین گولیاں لے آئی اور مجھے دیتے ہوئے بولی کہ آپ فی الحال یہ کھالیں اور گھر جا کر آرام کریں۔ اول تو یہ اپنڈکس کا درد نہیں ہے۔ پھر بھی اگر تکلیف بڑھ جائے تو بلا تکلف رات کسی وقت بھی یہیں آجائیں۔ اپنیڈکس کا اپریشن بہت مختصر ہوتا ہے میرے پاس اپریشن کا تمام سامان گھر میں موجود ہے۔ ویسے مجھے پختہ یقین ہے کہ یہ آپنڈکس کا درد نہیں ہے۔ دوائی کھانے کے بعد واپس گھر آ گئے۔ مانک صاحب پہلے مجھے اپنے گھر لے گئے۔ ہمارا کالج لڑکوں کا سکونتی کالج تھا۔ تمام لڑکے ہوسٹل میں ہی رہتے کالج کے ہیڈ بوائے کو بلوا کر اسے کہا۔

''ایک لڑکے کو اِن کے کمرے کے باہر لٹا دو۔ اگر انہیں تکلیف بڑھ جائے تو وہ مجھے فوراً اطلاع کرے۔''

دوائی کھانے کے بعد تکلیف ختم ہوگئی اور صبح میں کالج میں ڈیوٹی پر تھا۔ اب میں اکثر مسٹر مانک کے گھر چلا جاتا اور کافی دیر تک گپ لگاتا۔

ایک ماہ کے بعد بچوں کو نائیجیریا بلا لیا۔ سب سے بڑی بچی نگہت پرائمری کی پانچویں جماعت میں چھوٹی سنبل دوسری جماعت میں پڑھتی تھی اور بیٹے یٰسین نے تو ابھی سکول جانا شروع ہی نہیں کیا تھا۔ سب سے چھوٹی کو کب ماں کی گود میں تھی اس نے چلنا شروع نہیں کیا تھا ماسوائے

چھوٹی کے سب کو اپنے کالج کے پاس قائم 'کوفرایا گی' پرائمری سکول میں داخل کروا دیا۔ کالج کے مین گیٹ اور کوفرایا گی سکول کے درمیان صرف ایک سڑک ہی حائل تھی۔

بیڈا 'سکوٹو ریاست' کا آخری بڑا شہر تھا۔ نوپے قبیلہ کے سردار، جسے 'اٹسو' کہتے کی رہائش بھی اسی شہر میں تھی۔ اس کا محل ایک قلعہ کی مانند مٹی سے بنا تھا۔ اس کی بیرونی دیواریں تقریباً بارہ فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی تھیں۔ 'اٹسو' کا سیکریٹریٹ اسی بلڈنگ میں قائم تھا۔ نوپے ایک مسلمان قبیلہ تھا۔ اس کا ہر فرد پانچ وقت کا نمازی تھا۔ وضو کے لئے پانی کا ایک ڈبہ اور جا نماز ہر مُسلمان کی کار میں ہوتا۔ ان کی نماز صرف ادائیگی فَرض تک محدود تھی۔ آذان میں اعراب کا خاص خیال رکھا جاتا۔ آذان مسجد کے دروازہ میں کھڑے ہو کر دیتے۔ نماز ہاتھ کھول کر پڑھتے۔ اور آخری سلام صرف دائیں جانب کرتے۔ عیدین کی نماز میں خطبہ بہت کم سنتے صرف با جماعت فَرض پڑھتے۔ ہر شہر میں صرف ایک جامع مسجد ہوتی۔ عید کی نماز ایک مخصوص میدان میں پڑھتے۔ عیدین اور دیگر مذہبی تہواروں اور مخصوص مواقع پر 'اٹسو' اپنے وزرا کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار ایک جلوس کی صورت عیدگاہ جاتا یا شہر کا چکر لگاتا۔ بڑی چھتری کے سایہ میں سوار چلتا، قبیلہ کا ایک فرد یہ چھتری اُٹھائے گھوڑے کے ساتھ ساتھ پیدل چلتا۔ جس سے سردار کی آمد دور سے نظر آجاتی، جمعہ اور عیدین کی نماز میں 'اٹسو' کا انتظار کیا جاتا۔

نوپے قبیلہ ہونسہ قبائل میں سب سے بڑا قبیلہ تھا۔ جس کے ممبران دو صوبوں الورین اور سکوٹو میں آباد تھے اِن کی کل تعداد دو لاکھ کے قریب بتائی جاتی۔ اس قبیلہ کی اپنی علیحدہ زبان تھی اس زبان کا کوئی مخصوص رسم الخط نہ تھا صرف بولی جاتی۔ ہونسہ زبان عربی رسم الخط میں تحریر کی جاتی۔ نائیجیریا میں انگریزوں کی آمد کے بعد عربی رسم الخط کی جگہ رومن انگریزی کو رواج دیا گیا۔ رومن انگریزی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ ہر قبیلہ کی زبان کو ایک رسم الخط مل گیا۔ بائیبل تو پہلے ہی انگریزی میں چھپتی تھی اب قرآنِ پاک بھی رومن انگریزی میں تحریر کیا جانے لگا۔ عربی اور انگریزی میں تحریر شدہ قران کے تلفظ میں بہت فرق آ گیا۔

نائیجیریا کا ہر قبیلہ اپنے بچوں کی پہچان کے لیئے چہرہ پر قبیلہ کا ایک نشان کندہ کرتا۔ قبیلہ کے ہر بچہ کی پہچان ان نقوش سے ہوتی یہ نشان ٹیٹو ورک کی طرح تا حیات رہتا۔ ایبو قبیلہ اپنا چہرہ صاف رکھتا اور کوئی نشان کندہ نہ کرتا۔ یوروبا قبیلہ بچوں کے چہرے پر صرف ایک لائین کندہ کرتا۔ نوپے

قبیلہ کا نشان شیر کا پورا چہرہ تھا۔ وہ اپنے ہر بچے کے چہرے پر نشتر سے شیر کا چہرہ بناتے۔قبیلہ کا نشان کندہ کرنے کو ایک رسم کی طور منایا جاتا۔قبیلہ کا نشان بنانے کے دوران بچے کا منہ خون سے تر ہوتا لیکن جراح بچے کی چیخوں کو مکمل نظر انداز کئے اپنا کام کرتا رہتا۔

میں نے ،ایک نائیجیرین مسلمان سے،نشان بنانے کی وجہ پوچھی ،آپ لوگوں کو ایسا نشان بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔اس نے بتایا کہ پچھلی صدی عیسوی میں غلاموں کی تجارت عام تھی۔ہر گھر میں بیس سے پچیس بچے ہوتے جنہیں والدین مغرب کے بعد گنتے۔غلاموں کی خرید و فروخت سر عام ایک بازار میں ہوتی کبھی کبھی لوگ اپنے قبیلہ کے کسی بچے کو غلط فہمی میں دوسرے کسی قبیلہ کا بچہ سمجھ کر پکڑتے اور غلاموں کے بازار میں لیجا کر فروخت کرآتے۔مغرب کے بعد جب والدین اپنے بچوں کو گنتے تو قبیلہ کا کوئی نہ کوئی بچہ کم نکلتا۔بچوں کی اس غیر ارادی فروخت سے بچنے کے لیے یہ نشان لگانے کا طریقہ تلاش کرلیا گیا۔گو غلاموں کی تجارت اب ختم ہوگئی ہے اور مردوں میں زیادہ شادیوں کا رواج بھی نہیں رہا۔ ہر گھر میں بچوں کی تعداد بھی زیادہ نہیں ہے۔لیکن نشان لگانے کی رسم ابھی موجود ہے۔اس نے مزید بتایا کہ نائجیرین مسلمان اپنی پہلی بیوی کو طلاق نہیں دیتے۔یہ بڑی بیوی دوسری چھوٹی بیویوں کو کنٹرول کرتی اور ان سے بچوں کی دیکھ بھال کا کام لیتی ہے۔بچے بھی اپنے دیگر بھائیوں سے رشتہ کو واضع کرنے کے لیئے مخصوص الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے کہتے۔

’’ہم دونوں بھائی ہیں ہماری ماں اور باپ ایک ہے‘‘۔یا’’ہم آدھے بھائی ہیں ہماری ماں ایک ہے لیکن باپ مختلف ہیں۔ ہمارا باپ ایک ہے ماں مختلف ہے یا ہم دونوں ایک احاطہ میں رہنے والے بھائی ہیں۔وغیرہ وغیرہ‘‘

مسٹر مانک اور میں دونوں عموماً ہر فنکشن میں اکٹھے ہوتے۔ایک بار مسٹر مانک مجھے اپنے ہمراہ ایک فنکشن میں لے گئے۔وہاں بچے کی جھنڈ اتروانے کے بعد ایک عورت بچے کو محفل میں لائی۔تمام مرد آمنے سامنے دو لائینوں میں کھڑے ہوگئے۔بچے کے باپ نے عورت کے ساتھ کھڑے ہوکر بچے کے نام کا اعلان کیا وہ عورت بچے کو لیے لائن کے درمیان سے گزری۔اس کے بعد بچے کے باپ نے سب کو دعوتِ طعام دی۔مختلف مشروب سے بھری بوتلوں کے چند کریٹ ایک جانب رکھے تھے۔مسٹر مانک اور میں نے ایک ایک بوتل اُٹھائی اور ایک جانب کھڑے

ہوگئے۔لوگ زیادہ تر بُھنے گوشت پر اکٹھے تھے۔مسٹر مانک اور میں نے بوتل کھولی اور دونوں نے ایک ایک گھونٹ پیا۔میری بوتل کے شربت کا رنگ سُنہرہ جیسا تھا مگر ذایقہ میں کڑواہٹ کا عنصر نمایاں تھا گھونٹ پیتے ہی رونگٹے کھڑے ہوگئے،جسم میں چیونٹیاں رینگتی محسوس ہوئیں۔حیران ہوا کہ عجیب فارمولا ہے۔میں نے دوسرا گھونٹ ابھی نہ لیا تھا کہ مسٹر مانک بولے۔

’’شیخ صاحب سنا تھا کہ آپ کے مذہب میں شراب ممنوع ہے۔‘‘

’’ہاں،میں بھی نہیں پیتا۔‘‘

میں نے جواب میں کہا۔

وہ بولے۔

’’آپ کے ہاتھ میں کیا ہے شاید آپ نہیں جانتے یہ کوک نہیں شراب کی بوتل ہے۔‘‘

میں نے مانک صاحب کا شکریہ ادا کیا اور جا کر بوتل کو واپس کریٹ میں رکھ آیا۔اور واپسی پر بھنے گوشت کی پرات سے مرغ کی ایک ران لے آیا۔جب کھانے لگا تو اُس میں سے بو آئی دیکھا کہ وہ تو مرغ کا پنجہ تھا۔تمام انگلیاں اور ناخن مڑے نظر آرہے تھے اُسے بھی جا کر پرات میں پھینک دیا اور مسٹر مانک کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

اسی قسم کی ایک محفل میں ہم دونوں ایک میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ میرے ساتھ بیٹھے مانک صاحب بولے۔

’’شیخ صاحب مسلمان تو ہیم نہیں کھاتے۔‘‘

’’ہاں میں بھی ہیم نہیں کھاتا۔‘‘

کہنے لگے۔

’’آپ کی پلیٹ میں چند ٹکڑے ہیم کے ہیں انہیں نکال دیں۔‘‘

میں نے پلیٹ ہی دوسری میز پر رکھ دی اور مزید کچھ نہ کھایا۔اس کے بعد مقامی لوگوں کے ہر فنکشن میں جانا چھوڑ دیا۔

ایک بار پٹرول پمپ پر دو ڈرائیور آپس میں الجھ گئے۔اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئے۔ایک نے دوسرے کو کشتی کرتے ہوئے زمین پر پٹخ دیا اس دھینگا مشتی میں دوسرے کے کچھ سکے جیب سے گر گئے وہ نیچے سے بولا۔

''رُکو، رُکو میرے پیسے گر گئے ہیں۔ ذرا صبر کرو بھائی''

دوسرے نے اُسے چھوڑ دیا وہ نیچے سے اُٹھا اور اَپنے پیسے اِکٹھے کیے۔ پیسے گنے کچھ کم تھے۔ انہیں تلاش کرنے میں اس کے مدمقابل نے بھی اُس کی مدد کی۔ دوبارہ گنے، اب پورے تھے۔ اِن کو قمیص کی اَندرونی جیب میں محفوظ کرنے کے بعد بولا۔

''اَب تم مجھے چُھو کے دکھاؤ اور پھر دیکھو میں تمہارے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''

دوسرے نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت انگلی نکالی اور بولا۔

''لو دیکھو میں تمہارے بوبا (چوغہ) کو چُھو رہا ہوں۔ جو کرنا ہے وہ کرو۔''

اس کے ساتھ اس کے بھاری بھرکم چغہ کو اپنی شہادت کی انگلی سے چھوا۔ اس دوران لائن میں کھڑا ایک ڈرائیور بولا۔

''ہم مہذب قوم کے فرد ہیں لڑنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اس جھگڑے کو ختم کرو۔''

دونوں اپنی اپنی گاڑی کے پاس آ کر خاموشی سے پٹرول کی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ اور لڑائی ختم ہوگئی۔

ڈاکو اور چور کی سزا سخت تھی۔ کسی شخص کو چور کہہ دینا اُس کے لیے موت کا پیغام ثابت ہوتا۔ ایک آواز پر ہر سننے والے کے ہاتھ میں جو کُچھ میسر آجاتا اٹھا کر اسے مارتا۔ لوگ اس وقت تک اسے مارتے رہتے جب تک وہ مر نہ جاتا۔ ڈاکو کو جائے واردات پر لیجا کر فائیرنگ سکواڈ کے ہاتھوں گولی ماردی جاتی۔ اس کے باوجود چوریاں اور ڈاکے عام تھے۔ گولی مارنے سے پیشتر ہر ڈاکو کو گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا موقع دیتے۔

ایکسیڈنٹ کی صورت کوئی دوسرا ڈرائیور یا شخص کسی زخمی کی مدد کے لیے نہ رکتا۔ بلکہ مدد کرنے والے کو بھی ایسا کرنے سے منع کرتے اور کہتے۔

''بعد میں پولیس تمہیں تنگ کرے گی۔''

ایک مردہ شخص کے پاس سے ایک چِٹ ملی۔ جس پر اس نے اپنے خُون سے تحریر کیا ''پلیز ہیلپ۔'' اور ایک پتھر اس چِٹ کے اُوپر رکھ دیا تا کہ وہ ہُوا سے اُڑ نہ جائے۔ لیکن دو دن تک کسی نے اسے ہسپتال نہ پہنچایا۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ تیسرے روز پولیس نے لاش کو اٹھایا تو یہ چِٹ سامنے آئی۔ لوگ پولیس کے شکنجے سے ڈرتے تھے۔ جو شک ہونے پر

بھی معاف نہ کرتے۔ کوئی گاڑی والا کسی کی مدد نہ کرتا۔

ایک دفعہ مجھے نائیجیریا سالانہ کھیلوں میں کرکٹ ٹیم کا مینجر بنا کر دوسرے صوبہ کے شہر بینن (Bennin) بھیجا گیا۔ میرے ہمراہ دیگر ٹیموں کا ایک بڑا قافلہ بیس گاڑیوں میں سفر کر رہا تھا۔ کھیلوں کے افتتاح کے دوسرے روز ہماری ٹیم اپنا پہلا میچ ہی ہار گئی۔ دس روز مزید رکنے کی بجائے میں نے واپسی کا فیصلہ کیا چیف ڈی مشن سے بچوں کی تنہائی کا ذکر کیا اور واپسی کی اجازت چاہی۔ چیف صاحب نے انکار نہ کیا بیڈا واپسی کے دو راستے تھے ایک راستہ بینن لیگاس بیڈا اور دوسرا بینن اباداں بیڈا۔ چیف ڈی مشن نے ایک ڈرائیور کو میرے ہمراہ کر دیا اب میرے لیے مسئلہ یہ تھا، کہ بیڈا کون سے راستہ سے چلا جائے۔ بینن، لیگاس، بیڈا، کا راستہ پچاس میل زیادہ لمبا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ راستہ دیکھ آؤ وہ بھی بینن پہلی دفعہ آیا تھا۔ وہ گیا اور ایک نقشہ بنوا لایا۔ صبح تین بجے ہم اباداں کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے ہم پکی سڑک سے سیدھے گئے یہ پکی سڑک نسوکا یونیورسٹی (Nsukka University) جو شہر سے تین میل باہر تھی، کے سامنے سے گزری۔ آگے سڑک بالکل ویران اور سُنسان ہوگئی۔ تاہم نقشہ کے مطابق ہم آگے بڑھے، کچھ دُور جا کر پکی سڑک ختم ہوگئی۔ اَب ہم کچی سڑک پر چل رہے تھے صُبح نماز کے وقت ہم ایک چھوٹے گاؤں سے گزرے۔ یہاں سڑک دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ سڑک کے سامنے دوسری سڑک کے درمیان لکڑی کا ایک بازو والا سفید رنگ کا بورڈ رکھا تھا۔ بورڈ کے بازو پر چمکتے رنگ میں تیر کے نشان کے ساتھ موٹے انگریزی حروف میں لیگاس لکھا تھا۔ اس بورڈ کا دوسرا بازو غائب تھا، مجھے لیگاس کے الحاج کی باتیں یاد آ گئیں کہ یوربا، ایبو قبیلہ کے نوجوان کبھی راستہ صحیح نہیں بتاتے۔ اس نصیحت کے یاد آ جانے کے بعد خیال آیا کہ اگر ہم بورڈ کی رہنمائی کے مطابق دائیں مڑ گئے تو یقیناً کسی جال میں پھنس جائیں گے۔ یہ بورڈ کچی سڑک پر اتنی دُور کس نے کھڑا کیا ہے۔ جسے کسی وقت بھی ہٹایا جا سکتا ہے۔ میں بڑا حیران ہُوا کہ سڑک بھی کچی علاقہ بھی غیر آباد اور ٹریفک بھی ناپید، ہمیں کسی گاڑی نے نہ تو کراس کیا اور نہ پیچھے سے کوئی آتی دکھائی دے رہی ہے۔ کوئی بڑا شہر بھی راستے میں نہ ملا۔ یقیناً ڈرائیور کو غلط راستہ بتایا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے ایک شریف آدمی ہاتھوں میں ایک روشن لالٹین لیے جاتا دکھائی دیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔

''اس شخص سے پوچھو کہ ہم لیگاس جا رہے ہیں کون سی سڑک سے جائیں؟''

اس نے بتایا کہ آپ لیگاس (Lagos) سے الٹی سمت میں جا رہے ہیں۔ پہلے بینن شہر جائیں جو یہاں سے 36 میل دُور ہے۔ وہاں آپ کو مین روڈ مل جائے گی۔ ہم وہیں سے واپس لوٹے۔ ہم دوبارہ اسی ہوٹل پر پہنچے جہاں سے ہم صُبح تین بجے چلے تھے۔ میں نے اپنے چیف ڈی مشن کو سارا واقعہ سنایا اُس نے میرے ساتھ ایک اور ڈرائیور کر دیا، جو اِبادان کا راستہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ تقریباً دو بجے ہم اِبادان سے گزر رہے تھے۔ جبکہ ہمارا پروگرام دن کے دو بجے بیڈا پہنچنے کا تھا۔ اسطرح ہم رات گیارہ بجے بیڈا پہنچے۔

نائیجیریا میں ایشیائی آپس میں مل بیٹھنے کے لیے اکثر ختم قرآن کا انتظام کرتے۔ لیکن اُس محفل میں صرف مسلمان ہی مدعو کیے جا سکتے کسی غیر مسلم کو شرکت کی دعوت دینے سے قاصر رہتے۔ ختم قرآن کے بعد چائے کا دور میں اُن کی کمی محسوس ہوتی۔ ایسی محفلیں تقریباً ہر ماہ ہوتیں۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیے دو اور محفلوں کا انتظام کیا گیا۔ ایک کھیل دوسری ادبی بیٹھک۔ کبھی شعر و سخن کی محفل تو کبھی اندرون خانہ کھیلوں میں مقابلہ کا انتظام کرتے۔

خاک ہو جائیں گے

جولائی ۱۹۷۶ء کی گرمیوں کی تعطیلات پر پاکستان جانے سے پہلے میں نے والد صاحب کو خط لکھا کہ میں جون یا جولائی کی کسی تاریخ کو پاکستان تعطیلات کے سلسلہ میں آ رہا ہوں۔ اور ہم دونوں اکٹھے عمرہ پر جائیں گے۔ میں احرام لیتا آؤنگا۔ اس خط کا والد صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے بہنوئی عبدالعزیز صاحب نے ایک خط میں تحریر کیا کہ اپنی پہلی فرصت میں عمرہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ آپ آتے ہوئے بھی عمرہ کرتے آئیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے عمرہ کے ضروری مدارج اور عمرہ کے دوران پڑھنے والی تمام دعائیں تحریر کیں۔ اور ساتھ ہی لکھا کہ خانہ کعبہ اور مدینہ شریف میں عمرہ مکمل کرنے کے بعد اپنے تمام نئے اور پرانے فوت شدہ بزرگوں کی مغفرت کی دعا مانگیں۔ میں حیران تھا کہ نئے کون بزرگ فوت ہو گئے ہیں جن کی مغفرت کی دعا کا کہا ہے۔ اور ان کی وفات کی اطلاع مجھے نہیں ہے۔ خیال آیا کہ برادری میں بہت سے لوگ ہیں ان میں سے کوئی بزرگ فوت ہو گئے ہونگے۔ جن کی وفات کی اطلاع دینا غیر ضروری سمجھا گیا ہوگا۔

والد صاحب کا پاسپورٹ ابھی بنوانا تھا اور اس کے بعد ویزہ لگوانا تھا۔ جس میں چند دن صرف ہو

جاتے۔ چنانچہ گرمیوں کی تعطیلات سے دس روز پیشتر ہی پرنسپل صاحب سے اجازت لیکر عمرہ پر چلا گیا۔ مدینہ منورہ میں حاضری کے بعد عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ آیا۔ اور تیسرے دن بذریعہ PIA کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔ کراچی ائیر پورٹ ہوٹل میں بچوں کو ٹھہرا کر ایک ٹیکسی لی اور بازار چلا گیا۔ والد صاحب کے لیے ایک نرم گداز اور موٹی اونی جائے نماز خریدی اور اسی ٹیکسی سے واپس ہوٹل آ گیا۔

اسلام آباد جہاز سے اتر کر گھر پہنچے تو معلوم ہُوا کہ والد صاحب تو ایک ماہ پیشتر ہی دو روز بیمار رہ کر فوت ہو گئے تھے۔ بہت دُکھ ہُوا کہ ان سے گفتگو کا دوبارہ موقع نہ مل سکا۔

دکھی دل کے ساتھ صرف چند دن ہی پاکستان میں رکا۔ جب نائیجیریا واپس پہنچا، تو نائیجیریا میں مقیم ایشیائی والد صاحب کی وفات کے افسوس کے لیے بیڈا تشریف لائے۔ حیران تھا کہ ان سب کو اتنی جلدی کیسے علم ہو گیا کہ والد صاحب کا میرے جانے سے پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ ایک صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ والد صاحب کے جنازہ پر بڑے بھائی جان نے اُونچی آواز میں جنازہ میں شامل تمام حضرات سے درخواست کی تھی کہ چونکہ میں جلد ہی گرمیوں کی تعطیلات کے سلسلہ میں پاکستان آ رہا ہوں لہٰذا کوئی صاحب مجھے افسوس کا خط تحریر نہ کریں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نائیجیریا میں رہنے والے ہر غیر ملکی کو اس بات کا علم ہو چکا تھا۔ کہ میرے والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ سب نے مجھے ہی لاعلم رکھا۔

جب میں پہلی بار نائیجیریا کیلئے رخصت ہو رہا تھا۔ تو والد صاحب نے پہلے تو ایک الوداعی شعر پڑھا۔

’’ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن !
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک‘‘

اس کے بعد اُنھوں نے سب کے ساتھ مل کر دعائے خیر پڑھی اور رخصت کیا۔ اُس وقت تو مجھ پر اس شعر کی حقیقت عیاں نہ ہوئی کہ یہ شعر تو ان کے وجدان میں تھا۔ انہیں یقین تھا، کہ میری اُن سے یہ آخری ملاقات ہے۔ اَب یہ شعر ہر لمحہ مجھے کانوں میں، والد صاحب پڑھتے سُنائی دیتے۔ اور میں اکثر نیند سے بیدار ہو کر بیٹھ جاتا، بڑا پچھتاوا تھا کہ والد صاحب کو تنہا چھوڑا۔ دنیا جس کی خاطر میں مُلک سے نکلا ہوں، اس کی وجہ سے والد صاحب کے آخری لمحات میں ان کے ساتھ نہ

تھا۔ میں انہیں زندگی تو نہ دے سکتا تھا، اُن کے بیمار اور لاغر جسم کو سکون تو دے سکتا تھا۔ ان کے آخری لمحات میں کسی طبیب کو بلا سکتا تھا۔ ان کے جنازہ کو کندھا دیکر انہیں اپنے ہاتھوں سے دفن تو کر سکتا تھا۔ میری حالت اس سلگتی لکڑی کی تھی جو نہ بجھتی ہے نہ راکھ ہوتی ہے۔ ماں کی شفقت سے تو میں پہلے ہی محروم تھا۔ اب والد صاحب کی دُعاوں سے بھی محروم ہو چکا تھا۔

چانکیہ فارمولا

پھر اگلے سال ۱۹۷۷ء گرمیوں کی تعطیلات کے دوران پاکستان کا رخ کیا۔ اسلام آباد پہنچنے پر معلوم ہُوا کہ بڑے بھائی جان نے میری غیر حاضری میں میرا اسلام آباد والا مکان خالی کروا کر اُس میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ وہ پانچ مرلہ کا تین کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا مکان تھا۔ بڑے بھائی جان نے اپنی فیملی کے علاوہ ایک مہمان فیملی کو بھی اپنے ہمراہ ٹھہرا رکھا تھا۔ میرے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ میں بڑے بھائی جان سے دو بدو ہو کر ان کی بے عزتی کروں میں نہ مانا۔ بہر حال وہ میرے بڑے بھائی تھے۔ اِس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی کہ میرے مکان میں فیملی کے ساتھ رہائش اختیار کریں میں خاموش ہو گیا۔ چند دن ہی پاکستان رکا اور واپس نائیجیریا کا سفر اختیار کیا۔

واپسی پر خواہش ہوئی کہ بچوں کو یونانی تہذیب سے آگاہ کیا جائے جس نے 'ہومر' (Homer the author of the Iliad and the Odyssey)، 'ارسطو' (Aristotle)، 'اسکندر اعظم (Alexander the Great)' پیدا کیے۔ ایتھنز سے کانو کے لیئے کوئی جہاز نہ جاتا تھا۔ میرے ایک پرانے شاگرد نے ایتھنز سے ٹیونس کو روٹ میں شامل کر کے ایتھنز، ٹیونس، کانو، کا ٹکٹ ریزو کر دیا۔ ٹیونس سے کانو کے لیئے KLM کا ہر ہفتہ ایک جہاز جاتا تھا۔ میرے پاس یونان کا ویزہ تو نہ تھا۔ تاہم سات دن تک کا ٹرانزٹ ویزہ ہر ایئر پورٹ پر مل جاتا تھا۔ صرف اگلی فلائیٹ کی کنفرمیشن ضروری ہوتی۔ ایتھنز سے میری اگلے روز 'بلغاریہ ایئرویز' سے ٹیونس کی سیٹ کنفرم تھی۔ اس کے علاوہ ایتھنز میں ایک روز کی ہوٹل میں کمروں کی بکنگ اور تعارفی خط بھی تھا۔ ہم جہاز سے یونان کے شہر ایتھنز صُبح دس بجے کے قریب پہنچے۔ ایتھنز ایئر پورٹ پر امیگریشن کاونٹر تک ایئر ہوسٹس نے مسافروں کی راہنمائی کی۔ وہ ہمیں ایک بڑے

ہال میں لے گئی۔ ہال کے اندر دیوار کے ساتھ دو چھوٹے بنچ بنے تھے۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کو ایک بنچ پر بٹھایا اور خود امیگریشن کاونٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ مسافروں کی ایک لمبی لائن میرے پیچھے بن گئی۔ جلد ایک موٹا لمبا شخص کاونٹر کے عقبی دروازہ سے کاونٹر پر آیا۔ مسافر اپنا پاسپورٹ شیشے کے نیچے سے داخلہ کی مہر لگوانے کے لیے امیگریشن افسر کو پیش کر رہے تھے۔ اپنی باری آنے پر میں نے اپنے پاسپورٹ اور کنفرم سیٹ کے ٹکٹ امیگریشن آفیسر کو پیش کیے۔ امیگریشن آفیسر نے پاسپورٹ چیک کرنے کے بعد کہا کہ آپ تھوڑا انتظار کریں میں فارغ ہو کر بات کرتا ہوں۔ میں دور بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ چھ سات ایشیائی بھی دوسرے کونے میں شلوار قمیض پہنے ایک جانب کھڑے تھے۔ وہ سب بغیر ویزے کے ہی یونان پہنچے تھے۔ ایک یونانی اُن کے پاس کھڑا اُن سے انگریزی میں باتیں کر رہا تھا۔ اُن کی وضع قطع سے ظاہر ہو رہا تھا کہ تمام ان پڑھ مزدور ہیں جو مزدوری کیلیے یہاں آئے ہیں۔ یونانی اُنہیں انگریزی میں تسلی دے رہا تھا کہ آپ گھبرائیں نہیں تھوڑا انتظار کریں۔ بحری جہازوں کے نمائندے یہیں آ جائیں گے۔ وہ آپ کو یہاں سے ہی بحری جہاز پر لے جائیں گے۔ بحری جہاز تک جانے کے لیئے ویزہ کی ضرورت نہیں ہوتی تاہم وہ سب پریشان اور اضطراب میں تھے۔ میں اُنہیں دیکھ کر پریشان ہوا۔ کہ یونان والے اِن سے زیادہ مجھے مجرم سمجھتے ہوں گے۔ میں تو اُن کے ملک میں پوری فیملی کے ساتھ بغیر ویزہ آیا ہوں۔ اور ٹرانزٹ ویزہ لینے کے بعد یونان میں کہیں گم ہی نہ ہو جاوں۔ کاوَنٹر خالی ہونے پر ایک صاحب نے کاوَنٹر کے اندر سے اشارہ کیا اور انگریزی زبان میں کہا ''پلیز کم''۔ بچوں نے اپنا اپنا بیگ کندھوں پر لٹکایا میں بھی اپنا بریف کیس اور دیگر دستی سامان لیے کاوَنٹر پر پہنچ گیا۔ یونانی افسر نے مجھ سے دریافت کیا۔

''کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں''

''جی میں پاکستان سے آ رہا ہوں''

میں نے بڑے مہذبانہ انداز میں کہا۔

'' آپ وہیں تشریف رکھیں میں واپس آ کر آپ لوگوں کو ویزہ دیتا ہوں۔ مجھے آپ کو ویزہ دینے سے پہلے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔''

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ میں ایک سیاح ہوں۔ براعظم ایشاء سے براعظم یورپ آیا ہوں اور کل بلغاریہ ایئرویز سے براعظم افریقہ جاونگا۔

''مجھے صرف ایک روز کا ویزہ چاہیے۔''

میں نے پاسپورٹ اُس کی جانب بڑھایا اور پاسپورٹ پر لگے دیگر ایشیائی اور یورپین ممالک بشمول انگلینڈ، اٹلی، ہالینڈ اور سوئزر لینڈ کے کئی ویزے دیکھائے، تا کہ اسے یقین ہو جائے کہ میں ایک سیاح ہوں۔ اور اسے کہا کہ آپ مطمعن رہیں میں کل ایتھنز سے ٹیونس چلا جاؤں گا۔ یہاں ایتھنز میں لفٹ ہانسا ائیر کا مہمان ہوں اور فلاں ہوٹل میں میری بکنگ ہے میری بات بڑی توجہ سے سننے کے بعد اس نے کہا۔

''آپ وہیں تشریف رکھیں۔ میں آ کر آپ کو ویزہ دیتا ہوں۔''

ابھی ہم وہاں بینچ تک پہنچے ہی تھے۔ ایک اور صاحب تشریف لائے اور کھڑکی سے باہر آ کر میری جانب دیکھا اور اشارہ سے بلایا ہم سب پھر اٹھے اور کاؤنٹر پر پہنچ گئے یونانی افسر نے سوال کیا۔

''آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟''

''کراچی سے آ رہا ہوں''

''کیا آپ پاکستانی ہیں''

''جی میں پاکستانی ہوں''

اس سے پیشتر کہ وہ کوئی اور سوال مجھ پر کرتا۔ میں نے اس پر الٹا سوال کیا

''ایتھنز کی فلاں سڑک پر قائم اس ہوٹل سے میری بکنگ کنفرم کر لیں''

میں ابھی بات مکمل نہ کر پایا تھا کہ وہ افسر پہلے منہ میں کچھ بڑ بڑایا پھر نفرت بھری نگاہ سے میری جانب دیکھا۔ انگریزی زبان میں گفتگو کی بجائے اب یونانی زبان میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ بڑی کوفت ہوئی۔ ابھی یہ شریف آدمی انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ اب معلوم نہیں اپنی زبان میں کیا کہہ رہا ہے۔ مجھے لیفٹیننٹ جنرل بی۔ ایم۔ کول کی خود نوشت سوانح حیات ''ان کہی کہانی'' میں تحریر کوٹلیہ چانکیہ کا معقولہ یاد آیا جس کی وجہ سے انہیں ایسی میٹنگ میں جانے کی اجازت مل گئی تھی جس میں نہ تو وہ مدعو تھے نہ ان کو مدعو کیئے جانے کا جواز تھا۔ صاحب موصوف ماسکو میں انڈین ایمبیسی میں ملٹری اٹیچی تھے۔ انہیں حکام بالا کی جانب سے حکم ملا کہ ماسکو میں منعقد ہونے والی ایک دفاعی کانفرنس میں کیئے گئے فیصلوں کی رپورٹ ارسال کریں۔

وہ سکنڈے نیوین ممالک کے دفاع کے متعلق کانفرنس تھی۔ حکومت ہند کی شمولیت کا کوئی جواز نہ

تھا۔ اُس کانفرنس میں حکومت ہند کو مبصر کی حیثیت سے بھی مدعو نہ کیا گیا تھا۔ بہتر اور مفصل رپورٹ تیار کرنے کے لیے دعوت نہ ہونے کے باوجود جنرل صاحب وہاں چلے گیے۔ انہیں گیٹ پر ہی روک کر ایک دوسرے کمرے میں بیٹھا دیا گیا۔ جنرل موصوف تحریر کرتے ہیں۔ کہ انہوں نے سوچا کہ میں کمرہ میں بیٹھنے کے لیے تو نہیں آیا۔ ایک دفعہ پھر کوشش کی جائے وہ باہر آئے۔ اپنا تعارف دوبارہ کروایا۔ لیکن اس کے باوجود اندر جانے کی اجازت نہ ملی۔ دوبارہ انہیں اسی کمرہ میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے کوٹلیہ کا معقولہ یاد آیا۔

''ایسے موقع پر اگر اپنی مادری زبان میں اونچے لڑائی کے انداز میں بات کی جائے تو بات یا تو بالکل بگڑ جاتی ہے یا ٹھیک ہو جاتی ہے۔''

بات بگڑی ہوئی تو پہلے ہی تھی۔ بی ایم کول تحریر فرماتے ہیں۔ استقبالہ کے ممبران انہیں اندر جانے کی اجازت نہ دے رہے تھے۔ وہ دو دفعہ اندر جانے کی کوشش بھی کر چکے تھے انہوں نے تحریر کیا کہ وہ کوٹلیہ چانکیہ کے معقولہ کی پیروی میں غصہ کے عالم میں کمرہ سے باہر آئے۔ اور پنجابی زبان میں اونچی آواز میں چلا کر بات شروع کر دی۔ اس وقت کسی اہم یورپی ملک کا نمائندہ پہنچنے والا تھا۔ جس کے استقبال کیلیے وزیر خارجہ بذات خود تشریف لانے والے تھے۔ ان کے شور کرنے پر بہت سے پروٹوکال کے شکنجے میں جکڑے افسران ان کے پاس آ گئے۔ انہیں بطور مبصر اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ یونانی امیگریشن والے مجھے ٹرانزٹ ویزہ دینے کو تیار نہ تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ کوٹلیہ چانکیہ کا معقولہ یاد آنا اور یونانی امیگریشن افسر کا اپنی مادری زبان میں بات کرنا میرے لیے کافی تھا۔ میں نے بھی پنجابی زبان میں طبع آزمائی شُروع کر دی۔ یونانی تو خاموش ہو گیا۔ لیکن میں پنجابی میں اُونچی آواز میں پورا زور لگا کر لڑائی کے انداز میں بولے جا رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ اُس کی جانب بڑھائے ہوٹل کا ووچر دکھایا اور کہا۔

''تم اندھے تو نہیں ہو دیکھو میری کل کے لیے بلغاریہ ایرویز سے سیٹ کنفرم ہے۔ اگر بلغایہ ایرویز سے پہلے کوئی اور جہاز ٹیونس جا رہا ہو تو آپ مجھے بتا دیں۔ میں بزنس کلاس کا پسنجر ہوں۔ اگر ان کے پاس بزنس کلاس کی سیٹ نہ ہوئی تو وہ مجھے اکانومی کلاس میں سیٹ دینے کے پابند ہیں۔ میں آج ہی چلا جاونگا۔''

میں ابھی یہ بات کر ہی رہا تھا کہ میری اُونچی آواز دُور کہیں اس کے افسر تک پہنچ گئی۔ وہ حالات کا

جائزہ لینے کے لیے کہ کون کس سے جھگڑ رہا ہے، وہاں آ گیا۔اس نے دیکھا کہ میں پنجابی زبان میں چیخ رہا ہوں۔اس نے اشارے سے مجھے صبر کرنے کا کہا۔

پھر انگریزی زبان میں بولا۔

''ذرا سکون سے ٹھنڈے ٹھنڈے بات کریں۔''

میں خاموش ہو گیا ۔

مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے انگریزی میں بات شُروع کی اس نے حیران ہو کر مجھ سے سوال کیا۔

''آپ انگریزی جانتے ہیں''

میں نے اپنا مسلہ اسے مدلل طریق سے سمجھایا اور درخواست کی کہ چوبیس گھنٹوں کے رکنے کی بات ہے۔اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میری بات بڑی توجہ سے سننے کے بعد اپنے افسر سے یونانی زبان میں کوئی بات کی۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ہم آپکے پاسپورٹ رکھ رہے ہیں۔کل جب آپ واپسی کے لیے تشریف لائیں گے تو امیگریشن کاؤنٹر پر آپ کو اپنے پاسپورٹ مل جائیں گے۔فی الحال یہ افسر آپ کو ان کی رسید اور ایک دن کا ویزا بنا دے گا۔''

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ یونانی افسر نے پاسپورٹ کی رسید بنا دی جس میں ایک دن کا ویزا بھی درج تھا۔میں نے ائیر پورٹ سے ٹیکسی لی اور ہوٹل پہنچا۔ہوٹل پر ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی میرا تمام سامان لوڈر اندر لا رہا تھا کہ کاؤنٹر پر کھڑے ایک صاحب نے بڑے طنزیہ لہجے میں لوڈر کو یونانی زبان میں کچھ کہا۔لوڈر نے سامان وہیں رکھا اور غائب ہو گیا۔ میں کاؤنٹر پر کھڑا منیجر سے بات کر رہا تھا کہ بچوں نے بتایا۔

''ابو ہوٹل کا ملازم تو سامان وہیں رکھ کر کہیں چلا گیا ہے۔''

میں نے ہوٹل کا انٹری فارم اور بال پوائنٹ وہیں رکھا اور خود باہر سامان لینے چلا گیا دو چکر لگا کر خود ہی سامان کاؤنٹر تک لے آیا ریسپشن کاؤنٹر پر کھڑے شخص کو لفٹ ہانسا والوں کا لیٹر دیا۔اس نے

کوپن دیکھا اور حقارت سے واپس کر دیا۔

''12 بجے کے بعد پیش کرنا۔''

میں سارا مسئلہ سمجھ گیا کہ یہ شریف انسان سمجھ رہا ہے۔کہ آج تو یہ صاحب ہم سے اپنا سامان اُٹھوا رہا ہے۔کل یہ اور اس کی بیوی ہمارے کسی ہوٹل پر برتن دھو رہے ہوں گے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے بیگم صاحبہ کو اُونچی آواز میں مخاطب کیا، بات پنجابی یا اردو کی بجائے، انگریزی میں کی تا کہ کاونٹر پر کھڑا یونانی بھی سن لے۔

''بیگم صاحبہ آپ سست نہ ہو جائیں ہم یہاں پیسے کمانے نہیں خرچ کرنے آئے ہیں۔کیمرہ نکالیں اور تیار ہو جائیں ہمارے پاس وقت بہت کم ہے کمرہ بک کروا کر ٹیکسی باہر سڑک سے ہی لے لیں گے اور پہلے میوزیم چلیں گے۔''

کاونٹر پر کھڑے شخص سے کہا۔

''میرے لیے کوئی ٹیکسی پورے دن کے لیے بندوبست کر دیں مہربانی ہو گی۔''

وہ چونکا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔حقارت تو غائب ہو گئی اَب اُس کے لہجہ میں روایتی شائستگی اور نرمی آ گئی، کہنے لگا۔

''ٹیکسی بڑی مہنگی رہے گی۔''

''تو کیا ہوا میں یہاں پیسے خرچ کرنے آیا ہوں کمانے نہیں آیا۔''

یہ گر بڑا کامیاب رہا۔وہی آکڑ خان جو مجھے اور میری فیملی کی جانب حقارت سے دیکھ رہا تھا۔بٹلر بنا میرے گرد گھومنا شروع ہو گیا۔

''جناب میرے پاس ایک ٹور کمپنی کی ٹکٹ بک ہے۔گاڑی آپکو یہاں سے لے بھی جائے گی اور چھوڑ بھی جائے گی۔''

''پہلے سامان کمرے میں رکھونگا۔سیر کا بعد میں سوچوں گا''

''یہ بڑی سستی رہے گی۔''

اس نے فوراً دراز سے ٹکٹ بک نکالی۔

''آپ اکیلے جانا پسند فرمائیں گے یا پوری فیملی کے ساتھ جائیں گے۔''

میں نے جواب میں کہا۔

''میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے اتنی بھی جلدی نہیں، پہلے اپنا سامان کسی کمرہ میں رکھونگا اور پھر جاؤنگا''

میری شرط سننے کے بعد اس کے جسم میں بجلی کی سی تیزی آ گئی۔ وہیں پر بیٹھے بیٹھے اس نے دو تین ٹیلی فون کال کی۔ دو کمروں کا بندوبست کیا ایک لوڈر کو آواز دے کر بلایا۔ کوئی لوڈر وہاں موجود نہ تھا۔ وہ خود اٹھا اور میرا سامان لفٹ میں لیجا کر رکھا۔

بچوں کو اپنے اپنے کمرے میں لٹا کر میں واپس نیچے آیا اور کاونٹر پر آ کر ٹورسٹ بس کے چار ٹکٹ خرید لیے۔ چھوٹے بچوں کے ٹورسٹ بس میں سفر پر کوئی ٹکٹ نہ تھا۔ ٹکٹ خرید کر واپس کمرہ میں چلا گیا۔ کراچی سے ایتھنز تک پوری رات کا سفر کیا تھا۔ جس سے ہم سب پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ اَب تک ہم سب ذہنی طور پر تھک چکے تھے۔ کمرے میں پہنچتے ہی سب سو گئے۔ ابھی تھوڑی دیر ہی سوئے تھے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی نے ہمیں بیدار کیا۔ فون اُٹھایا تو ریپشنسٹ نے بتایا کہ ٹورسٹ کمپنی کی ٹیکسی آپکو لینے کے لیے انتظار میں کھڑی ہے۔ بچوں کو جگایا اور نیچے آ گئے ٹیکسی والا ہمیں لے کر ایتھنز کے ہمسایہ شہر پراوو لے گیا۔ جہاں کافی رونق دیکھنے میں آئی۔ پراوو سے ایک ٹورسٹ بس جس میں بیس پچیس دیگر سیاح بھی بیٹھے تھے، ہمیں لیکر واپس ایتھنز آ گئی۔ گائیڈ نے دوران سفر یونان کی تاریخ کو بڑی تفصیل سے بیان کیا۔ بس ایک جگہ سڑک پر ہی رک گئی۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ موجودہ زمانے کی پہلی اولمپکس کا انعقاد اس سٹیدیم میں ہوا تھا۔ یہ انگریزی حرف تہجی ''یو'' شکل کا ایک چھوٹا سٹیڈیم تھا۔ اس کا کچھ حصہ سڑک میں شامل کر لیا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ مزید چھوٹا ہو گیا تھا۔ اُس میں بیٹھنے کے لیے چھ چھوٹی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ہر سیڑھی تقریباً دس انچ چوڑی اور اٹھارہ انچ اُونچی تھی بس ایک آدمی ہی بیٹھ سکتا تھا۔ اس میں چار اتھلیٹ کا ٹریک تھا۔ اس کے بعد یہ بس ہمیں قبل مسیح کے ایک بازار لے گئی۔ یہ پتھروں سے بنی تنگ مگر سیدھی گلی تھی، جس کے دونوں جانب ایک منزلہ دکانوں کے کھنڈر تھے۔ چند ایک پر دوسری مَنزل کے نشانات بھی تھے۔ گائیڈ نے بتایا کہ اس بازار میں حکماء کی دکانیں عام تھیں۔ ہر حکیم کی دکان کے باہر مشہوری کے لیے تحریر ہوتا۔

''یہاں پر چیچک کا شرطیہ علاج کیا جاتا ہے۔''

ان کے طریقہ علاج پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یونانی حکماء کسی چیچک کے مرض میں مبتلا

شخص کے پھوڑوں اور پھنسیوں سے رسنے والی پیپ میں ایک دھاگا بھگو کر خشک کر لیتے۔ چیچک کے علاج کے لیے اُس دھاگے کا ایک ٹکڑا سوئی میں پرو کر صحت مند شخص کے جسم کے کسی حصہ سے گزار دیتے۔ اس سے چیچک کے جراثیم سے جسم میں مرض کے خلاف مدافعت پیدا ہو جاتی۔

ٹورسٹ بس ہمیں ایتھنز کے میونسپل سیکریٹریٹ میں لے گئی۔ چوکیدار گھٹنوں سے اوپر سکرٹ اور ایک چھوٹی کرتی پہنے تھا۔ اس کی کرتی اور جوتوں پر سرخ اور سفید رنگ کے اونی پھُندنے لٹک رہے تھے۔ پنڈلی کے گرد سرخ اور سفید رنگ کے تسمے لپیٹے تھے۔ وہ ہاتھ میں نیزہ لیے اسے گھمارہا تھا۔ گائیڈ نے بتایا کہ گیٹ کا چوکیدار یونانی فوج کا قبل مسیح یونیفارم پہنے کھڑا ہے۔ سِیاحوں نے اس کے پاس کھڑے ہو کر تصویریں بنوائیں۔ گائیڈ ہمیں 'اولمپیا' (Olympia) پہاڑی پر لے گیا۔ پہاڑی پچیس تیس درجے کا زاویے بناتے ہوئے، فٹ بال گراونڈ کے برابر میدان کے چار اطراف پھیلی تھی۔ یہ قدرتی سٹیڈیم کی صورت تھا۔ ہر چار سال بعد یہاں اولمپکس کھیل منعقد ہوتے تھے۔ اس 'اولمپیا' پہاڑی کی نسبت سے ان کھیلوں کا نام اولمپکس رکھ دیا گیا۔

مختلف قبائل کے لوگ آ کر بڑی آسانی سے بغیر کسی رکاوٹ کھیلوں کے مقابلے دیکھ سکتے تھے۔ یہاں پر قدیم یونانیوں کے دیوتا 'زیوس' (Zeus) کا مجسمہ ایک پلیٹ فارم پر نصب تھا، اب وہاں صرف پلیٹ فارم ہی رہ گیا تھا۔ زیوس کے مجسمہ کو موسمی اثرات سے بچانے کے لیے پہاڑی سے ہٹا کر بادشاہوں کے میوزیم میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ پہاڑ کے میدان میں کئی کھُوکھے کھلے تھے۔ بیگم نے کوک اور بن اور بچوں نے بسکٹ اور پیپسی وہیں ایک بنچ پر بیٹھ کر پی۔ اٹھتے ہوئے میں اپنا بریف کیس وہاں سے اٹھانا بھول گیا اور جلدی میں بس میں سوار ہو گیا۔ بس ابھی کھڑی تھی کہ میں نے دور سے بنچ پر بریف کیس رکھا دیکھ لیا۔ اس کے اندر میرے جہاز کے ٹکٹ اور ٹریولرز چیک رکھے تھے۔ اولمپیا پہاڑی سے بس ہمیں ''اکراپولس'' (Acropolis) نامی دوسری پہاڑی پر لے گئی۔ پہاڑی بے آب و گیاہ اور سخت پتھریلی تھی۔ گائیڈ نے بتایا کہ یونانی زبان میں 'اکراپولس' کے لفظی معنی اوپر والی بستی کے ہیں۔ ہماری بس پہاڑی پر بنی عمارات سے دور ہی رُوک دی گئی۔ آگے سڑک کے درمیان ٹنوں وزنی نوکیلے پتھر رکھے تھے۔ گائیڈ نے بتایا۔

''یہ بڑے پتھر سردار تک رسائی کو مشکل بنانے کے لیئے یونانیوں نے خود رکھے تھے۔''

قبیلہ کے سردار کی حفاظت کو مدنظر رکھتے ہوئے، پہاڑی کو تینوں اطراف سے ایک سوفٹ نیچے تک

90 درجہ کے زاویہ پر کھودا گیا۔ تا کہ دشمن قبیلہ سردار پر حملہ نہ کر سکے۔ گائیڈ نے بتایا، ابتداء میں یہاں پر صرف ایک عمارت تعمیر کی گئی، جہاں قبیلے کا سردار رہائش رکھ سکتا تھا۔ اس کے بعد نئے آنے والے ہر سردار نے اپنا محل علیحدہ تعمیر کیا۔ قبیلہ نے اپنی اور اپنے سردار کی حفاظت کے پیش نظر اپنی رہائش اسی پہاڑی کے تینوں اطراف اختیار کر لی۔ گائیڈ نے نیچے کھنڈرات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا پہاڑی کی بغل میں پرانے ایتھنز کے کھنڈرات ہیں۔

اکراپولس میں 'پارتھینان' (Parthenon) کا ٹمپل یونانیوں نے عقیدت سے دیوی اتھنا (goddess Athena) کے نام منسوب کیا ہے۔ تمام ستُون گول مخروطی شکل میں بنے ہیں۔ یہ ستون سنگ تراش کی ذہنی پرواز اور تخلیقی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ستون ہر سہ جہات کو ظاہر کرتے ہیں۔ آپ کو اِن فن کاروں کی مہارت اور ارکیٹکٹ کی ذہنی گہرائی کا صحیح ادراک اِن فن پاروں کو دیکھے بغیر نہیں ہوسکتا۔ گائیڈ نے ایک برآمدہ کی جانب اشارہ کیا اور کہا کہ یہ برآمدہ آپکو چونکا دے گا۔ اس کی دو جانب دیوی کے بت نصب ہیں، ان بتوں کی بڑی خوبی مختلف حرکات کا اظہار ہے۔ حرکات کو صناع نے بتوں میں اپنی مہارت کی بدولت سمو دیا ہے۔ دیویاں سر پر چوکور سنگ مرمر کی ٹائیل رکھے چھت کو اٹھائے چار چار فٹ کے فاصلہ پر کھڑی ہیں۔ سنگ تراش نے نیم وا آنکھوں کو چمک دے کر اِن پتھر کے بتوں میں حقیقی زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

میں اور بیگم کٹی پہاڑی کی جانب چلے گیے۔ جہاں سے پرانا اور نیا ایتھنز نظر آ رہے تھے۔ نیچے غور سے دیکھا تو دو سو فٹ کے فاصلہ پر سڑک کے پار اکراپولس کی بغل میں وہ ہوٹل نظر آیا، جس میں ہم قیام کیے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے عقبی جانب اُس کے نام کا بڑا بورڈ بھی نصب تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو ہوٹل کی جانب متوجہ کیا، پہچان کر بولیں۔

''یہ تو وہی ہوٹل ہے جس میں ہم قیام کیے ہیں۔ چلو واپس چلیں ہوٹل میں جا کر آرام کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، چلو چلتے ہیں۔''

میں نے ان کی خواہش کے احترام میں جواب دیا۔

''میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''آپ یہیں رکیں میں بچوں کو لیکر آتی ہوں۔''

بیگم صاحبہ نے بس کے پاس جا کر بچوں کو آواز دی۔

''سب نیچے آؤ ہوٹل چل کر آرام کرتے ہیں۔''

بچوں نے کوئی جواب نہ دیا وہ تو سب بس میں ہی سو گئے تھے۔ بیگم بس کے اندر چلی گئی سب کو جگایا اور پہاڑی سے نیچے اتر کر سڑک پار کی ہم ہوٹل کے پچھواڑے میں تھے۔ ہوٹل آ کر سب سو گئے۔

سبز پاسپورٹ

اگلے روز ٹیونس جانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہو کر مقررہ وقت سے چار گھنٹے پیشتر ہی ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ امیگریشن والوں سے پاسپورٹ حاصل کرنے کے بعد بلغاریہ ائیرویز کے کاونٹر سے بورڈنگ کارڈ لیکر جہاز میں سوار ہو گئے۔

یہ چُھوٹا سا دو انجن کا کم بلندی پر پرواز کرنے والا پرانا فوکر طیارہ تھا۔ جس میں پنکھوں والے انجن لگے تھے۔ جہاز کی پرواز سے پیشتر، ایک ائیر ہوسٹس نے عربی اور پھر فرانسیسی زبان میں سِیٹ بیلٹ باندھنے کا طریقہ سمجھایا۔ اس نے بتایا کہ ہم پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر چار سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتے ہوئے دو گھنٹہ بیس منٹ میں انشاء اللہ ٹیونس پہنچ جائیں گے۔ اس کے علاوہ کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا فرنچ سننے اور فوکر جہاز میں سوار ہونے کا ہمارا یہ پہلا تجربہ تھا۔ بڑے جیٹ طیارے میں ہمیشہ انجن کے قریب جہاز کی فلائٹ زیادہ پرسکون اور ہموار ہوتی ہے۔ جس کمپنی کے جہاز میں سِیٹوں کی الاٹمنٹ نہ ہوتی بچے جلدی میں اگلی سِیٹوں پر جا کر قبضہ کر لیتے۔ اس دفعہ بھی اُنھوں نے ایسے ہی کیا۔ اب ہم سب فوکر کی اگلی نشستوں پر دونوں انجنوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ اس پرانے جہاز میں پنکھوں کا شور بہت زیادہ تھا، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ انجن کی تھرتھراہٹ سے جہاز کا پورا ڈھانچہ لرز رہا تھا کھڑکیاں شیشے کرسیاں سب ہلتی محسوس ہوتیں۔ یوں محسوس ہوتا کہ تھوڑی دیر میں جہاز کے دونوں انجن جہاز کی باڈی سے علیحدہ ہو کر زمین پر گر جائیں گے۔ ایک بچے نے سوال کیا۔

''کیا اس وقت زمین پر زلزلہ ہے، دیکھیں یہ کھڑکی کا شیشہ ہل رہا ہے۔''

ہمارا جہاز سمندر کے کنارے کم بلندی پر محو پرواز تھا۔ بچوں کو دور ایک بڑا بحری جہاز گزرتا نظر آیا۔ تمام بچے کھڑکیوں سے چپک گئے۔ نیچے ان کے نظارے کے لیے کافی سامان تھا۔ جہاز کی رفتار بہت کم تھی زیادہ اونچائی پر بھی نہ تھا زمین پر چلتی گاڑیاں اور ٹرک صاف نظر آ رہے تھے۔

بچے ان کو پہچان کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہمارے جہاز سے سسلی کا جزیرہ نظر آ رہا تھا۔ کافی دیر کی اڑان کے بعد ائیر ہوسٹس ٹرالی لیے نمودار ہوئی۔ بچے اپنی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے ان کا خیال تھا کہ ہماری میزبان شاید کھانا لا رہی ہے۔ لیکن خلاف توقع وہ اپنی دکان لیے نمودار ہوئی۔ بھوک ہو تو وقت بھی جلدی نہیں گزرتا۔ بچے کھانے کے انتظار میں تھے کہ کپتان نے ’کارتھیج‘ (Carthage) ائیر پورٹ پر پہنچنے کا اعلان کیا، جہاز سے اترنے لگے تو سیڑھی کے پاس مسافروں کو خدا حافظ کہنے والی ائیر ہوسٹس نے ہر مسافر کو کھانے کا ایک پیکٹ دیا اور سب کو خُدا حافظ کہا۔

ازمنہ قدیم کی بہت سی تہذیبیں دُنیا میں مشہور ہوئیں اور ختم ہو گئیں۔ سومیرین تہذیب (Sumerian)، بیبلون (Babylonia) اور وادی سندھ (Indus) کی تہذیبیں بہت مشہور ہیں۔ کارتھیج (Carthage) تہذیب کا نام میرے پڑھنے یا سُننے میں نہ آیا تھا۔ کارتھیج کو دُنیا کے نقشے پر تلاش کر رہا تھا کہ کہاں پر ہے اور اس میں بسنے والی قوم کون تھی۔ تاریخ سے اِن کی تہذیب کے متعلق معلومات اور حقائق سامنے آئے۔ ’ہنی بال برکا‘ (Hannibal Barca) دُنیا کے بڑے جرنیلوں میں سے ایک، جو ٹیونس کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے رومی فوج نے کارتھیج پر حملہ کر دیا تھا۔

کارتھیج ماضی میں ایک بہت بڑا تجارتی مرکز تھا۔ شمالی اور مغربی افریقہ کی تمام تجارت کارتھیج کے راستہ ہوتی۔ نویں صدی عیسوی میں اٹلی اور کارتھیج دونوں جزیرہ سسلی پر قبضہ کے دعوےٰ دار اور جزیرہ پر مکمل فتح کے خواہش مند تھے۔ دونوں ممالک نے اس مقصد کے حصول کے لیے کئی جنگیں لڑیں، لیکن مکمل فتح کسی کو بھی حاصل نہ ہوئی۔

ائیر پورٹ سے دُور ایک ہوٹل شاہین کی طرح پر پھیلائے نظر آیا میرے اندازہ تھا کہ ٹیونس یورپ سے بھی زیادہ صاف ستھرا شہر ہوگا۔ یہاں پر میرا اندازہ غلط نکلا۔ یہ ایک پرانی طرز کا چھوٹا سُنسان بے آب و گیاہ ائیر پورٹ تھا۔ باہر جانیوالے گیٹ کے دونوں جانب چند پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ میرا پہلا واسطہ امیگریشن سٹاف سے ہُوا۔ انہیں اپنا سبز پاسپورٹ پیش کیا۔ میرا پاسپورٹ ہاتھوں میں لیتے ہی جو لفظ امیگریشن آفیسر کے منہ سے حیرانی کے عالم میں نکلا وہ تھا ’پاکستان‘ اور میری جانب دیکھ کر کہا ’’اہلاً وسہلاً‘‘ اسکی خُوشی رسمی یا مصنوعی نہ تھی۔ وہ ایک

دوسرے سے عربی میں کہہ رہے تھے۔ کہ ایک پاکستانی اپنی فیملی کے ساتھ ہمارے ملک میں آیا ہے، تقریباً ہر شخص نے مجھے عربی میں اہلاً وسہلاً، کہا۔

میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ دنیا میں کسی ملک نے سبز پاسپورٹ کی عزت کی اور ہتک آمیز چیکنگ کی بجائے اہلاً سہلاً کہا۔ اتنی خوش آمدید یورپ میں شاید پاکستان کے ایمبیسڈر کو بھی نہ ملتی ہو گی جتنی وہ مجھے دے رہے تھے۔ کسی نے میرے سامان کو چیک نہ کیا۔ اس کے برعکس یورپ کے ہر ائیر پورٹ پر ہتک آمیز تلاشی لی جاتی، قمیص کے کالر اور پتلون کی بیلٹ اور بکس کی چھت اور فرش کو کھٹکھٹا کر دیکھتے کہ شاید اس میں کچھ چھپا نہ رکھا ہو۔ ایشیا سے آنے والے ہر مسافر کو ایک مہمان یا ٹورسٹ سمجھنے کی بجائے سمگلر یا جعلی پاسپورٹ پر سفر کرنے والا منشیات فروش سمجھ کر اس کی سخت چیکنگ کی جاتی۔

ایک بار ہالینڈ میں چیکنگ کے دوران میں نے انسپکٹر کو پاسپورٹ پر اپنے نام کے ساتھ لکھا لفظ پروفیسر دکھایا تو وہ بولا کہ کل ہی ایک ڈاکٹر کے سامان سے ہیروئن ملی ہے۔ اس کے برعکس، یہاں امیگریشن کا ہر آدمی مجھ سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، امیگریشن والوں کے پاس کھڑا ہر شخص مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ میں پریشان تھا کہ یہ لوگ مجھے اتنی عزت کیوں دے رہے ہیں۔ یہاں یہ عالم تھا کہ ہر شخص، پاکستانی ہونے کی وجہ سے مجھے مافوق الفطرت فرشتہ کا درجہ دے رہا تھا۔

امیگریشن سے نکلا تو بنک سے سوڈالر کیش کروائے کیشیر نے مجھے ساٹھ ڈالر کے بیس دینار اور باقی کے پانچ دینار کے چار اور نوٹ دیے اور بیس کے چھوٹے اور باقی کے ڈھیروں سکے جو دونوں مٹھیوں میں آتے تھے دیئے۔ بنک کے باہر لگے بورڈ پر تحریر تھا۔

’’رسید دکھانے پر ساٹھ فیصد رقم واپس ڈالر میں تبدیل کر دی جائے گی‘‘۔

ائیر پورٹ سے باہر آیا تو خیال آیا کہ چونکہ اگلی فلائیٹ سے کل جانا ہے لہٰذا تمام سامان یہاں پر ہی امانت رکھ دوں۔ کہیں بھی کلوک روم نظر نہ آیا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تمام بورڈ عربی اور فرانسیسی زبان میں تحریر تھے۔ کچھ بھی سمجھ نہ آیا۔ چند لوگوں سے دریافت کیا سب نے کہا لا انگلش۔ ایک صاحب نے بطور ہمدردی وہیں کھڑے اُونچی آواز میں فرانسیسی زبان میں پکارا۔

’’انگریزی جاننے والا کوئی ہے تو اس شریف آدمی کی مدد کرے۔‘‘

ایک دس بارہ سالہ لڑکا سامنے آیا، انگریزی زبان میں مجھ سے مخاطب ہوا۔

''میں آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔''

''میں اپنا سامان یہاں کہیں امانتاً۔۔۔''

میں ابھی بات مکمل نہ کر پایا تھا، کہ وہ لڑکا بولا۔

''مجھے انگریزی زیادہ نہیں آتی لہٰذا آپ مختصراً اور آسان زبان میں اپنی بات سمجھائیں۔''

میں نے سامان کی جانب اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ انگریزی میں بات کی۔

''مجھے کل یہاں سے جانا ہے اس لیے میں اپنا سامان یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ فوراً سمجھ گیا اور بولا۔

''آپ اسی دفتر کے سامنے کھڑے ہیں''

دفتر کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ باہر دیوار پر عربی اور فرنچ زبان میں بہت کچھ تحریر تھا۔ چھوٹے بڑے بکس کی تصویر بھی بنی تھی۔ میں نے تمام سامان وہیں امانتاً رکھ دیا۔ پیسے دینے لگا تو اُس نے بہت زیادہ پیسے مانگے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو اسنے اشارے سے تمام بکس چھوٹے بڑے عربی میں گنے اور ریٹ لسٹ کی جانب اشارہ کیا۔ وہاں پر چھوٹے اور بڑے بکس کی تصویر اور سائیز کے علاوہ یومیہ کرایہ بھی درج تھا۔ میں نے اشاروں سے اُسے سمجھایا کہ میرے سامان میں کوئی بھی بکس بڑے سائز کا نہیں آپ مجھ سے بڑے بکسوں کے پیسے مانگ رہے ہیں۔ بحث کے بجائے اس نے چھوٹے بکسوں کا ریٹ لگا کر رسید دے دی۔ سامان سے فارغ ہو کر ایئرپورٹ سے باہر آیا تو وہی لڑکا سڑک پر کھڑا تھا، بولا۔

''آپ بس میں جائیں۔ ٹیونس میں ٹیکسی بہت مہنگی ہے''۔

''ٹیکسی تو پوری دنیا میں مہنگی ہے۔''

''ایک ٹیکسی میں صرف تین سواریاں ہی بیٹھ سکتی ہیں۔ یہاں پر پرانی ہل مین گاڑی ہی ٹیکسی کے طور پر چلاتے ہیں۔ جس میں چوتھی سواری کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔''

''ہم چار پسنجر تو نہیں، بلکہ ایک فیملی ہیں۔''

''آپ چھ لوگ ہیں دو گاڑیوں میں ہی آپ کو جانا پڑے گا۔''

''بہتر ہے کہ بس سے ہی جائیں۔ تھوڑی دیر میں اسی جگہ پر بس آجائے گی۔''

''شہر میں آپ فلاں سڑک پر چلے جائیں، وہیں پر تمام ہوٹل ہیں۔ کسی ایک میں رُک جائیں۔ وہ ہوٹل سستے بھی ہیں۔''

''لڑکے آپ کا بڑا مشکور ہوں کہ آپ نے میری راہنمائی کی''

میں نے اس لڑکے کا شکریہ ادا کیا اور وہیں رُک گیا۔ بس آئی تو اُسی بچے نے کنڈکٹر کو عربی زبان میں میری منزل سمجھائی اور خود چلا گیا۔ ہم بس میں سوار شہر کے اندر سے گزرے۔ شہر میں اَکثر عمارات زیرِ تعمیر تھیں مستری مزدور کام کرتے دکھائی دیے۔ تنگ گلیوں اور ایک منزلہ عمارات کو دیکھ کر احساس ہوا کہ ملک کا صدر مقام ابھی تک زیرِ تعمیر ہے۔ لوگ انتہائی غریب دکھائی دے رہے تھے۔ پاکستان تو اس کے مقابلہ میں بڑا ترقی یافتہ محسوس ہوا۔ دارالحکومت کے مین بازار میں مجھے کوئی پانچ منزلہ پلازہ نظر نہ آیا۔ ایک سٹاپ پر کنڈیکٹر نے مجھے اشارہ اور عربی زبان میں کہا۔

''آپ کا سٹاپ آگیا ہے۔''

ہم سب اتر کر نیچے آئے تو دیکھا کہ کُھلی دورویہ بڑی سڑک پر کھڑے ہیں۔ سڑک کے درمیان چمکیلے پتوں والے پام کے پُورے قد کے پندرہ بیس درخت ایک قطار میں لگے تھے۔ سڑک کی ابتداء میں ایک چُھوٹا سا گول تالاب بنا تھا۔ جس کے پندرہ بیس فوارے تالاب میں پانی گرا رہے تھے۔ البتہ درمیان میں ایک اونچا فوارہ چاروں طرف پانی کی دھار پھینک رہا تھا۔

گراؤنڈ فلور پر تمام دوکانیں بند تھیں۔ ہر دکان کی پہلی منزل پر فرانسیسی اور عربی زبان میں فندق کا لفظ تحریر تھا۔ میں پہلے کی بجائے تیسرے ہوٹل میں گیا۔ انگریزی میں بات کی۔ مجھے دو کمرے ایک روز کے لیئے چاہیں۔ جواب میں کاونٹر پر بیٹھے شخص نے کہا۔

''لا انگلس، عریبک نعم فرانسسی نعم''

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ میں نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے کہا۔

''لا عربی لا فرنچ۔ پرشین نعم''

اس نے پھر کہا۔

''لا پرشین''

میں نے پھر کہا۔

''ہونسہ، ہندی، اُردو، نعم''

ہونسہ زبان عربی کی بگڑی ہوئی زبان ہے۔ جس میں عربی زبان کے الفاظ اپنی اصلی حالت میں مستعمل ہوتے ہیں۔ افریقہ کے بہت سے مما لک میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ میں کچھ ہونسہ میں بات سمجھ سکتا تھا۔ کاونٹر پر بیٹھے شخص نے نفی میں سر ہلا دیا میں سمجھ گیا کہ میں تو یہاں پر بالکل ان پڑھ ہوں۔ میں نے اس سے کاغذ اور قلم مانگا اور چھ ہزار سال پہلے تصویروں کی زبان کا سہارا لیا۔ جو ہر عہد اور ہر علاقہ میں سمجھی جاتی ہے۔ کاغذ پر ایک گلی میں دو ساتھ ساتھ کمروں کا نقشہ بنا کر اسے دکھایا اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر گلی میں آمنے سامنے دو کمروں کا نقشہ بنایا اس نے پھر نفی میں جواب دیا۔ پھر میں نے ایک لائن میں دو کونوں پر کمروں کا نقشہ بنایا اس نے ہاں میں سر ہلایا۔ میں نے اشارے سے پیسے پوچھے اس نے دراز میں سے چند دینار نکالے اور ایک کمرہ کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اس کے پیسے لے کر سودے کی کوشش کی۔ اسی کے پیسے آدھے کیے اور ایک کمرے کی جانب اشارہ کیا۔ اس نے سوال کیا 'پاکستان۔؟' یعنی کیا آپ پاکستانی ہیں۔ میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ اس نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا سودا طے ہونے پر ہم دونوں خوش تھے۔ میں نے اپنے منہ کی جانب اشارہ سے کہا کہ کھانے کا کوئی بندوبست ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا البتہ اس نے ٹی کا نام لیا کہا کہ یہ دے سکتا ہوں۔ میں نے دو کپ کا اشارہ کیا وہ سمجھ گیا پھر اس نے مجھ سے دریافت کیا ''ودھ لیھ۔'' میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ ریسپشنسٹ اٹھا اور اندر کچن سے دودھ کی ایک بوتل اٹھا لایا اور بوتل کی جانب اشارہ کر کے کہا 'لیھ' میں نے ہاں میں سر ہلا دیا اور ہم کمرے میں چلے گئے۔

دوپہر کے بعد ہم ٹہلنے کے لیے بازار گئے۔ تمام دکانیں بند تھیں وہ چھٹی کا دن تھا۔ حفاظتی جنگلہ کسی دکان یا شوروم پر نظر نہ آیا۔ اشیاء کی قیمتیں بھی لکھی ہوئی تھی۔ زیورات کی جو قیمت تحریر تھی اس سے ہمیں سونا کافی سستا محسوس ہوا۔ باہر سے تو ہم پہچان نہ سکتے تھے، کہ سونا کتنے قیراط کا ہے۔ اگر وہ بائیس قیراط کا تھا تو وہ کافی سستا تھا اور اسی روڈ پر ایک عام سا ہوٹل کھلا ہوا ملا۔ ہم اندر جا کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ بہت سے لوگ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بیرے نے عربی میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کہا لاعربی وہ مینو کارڈ اٹھا لایا اور عربی زبان میں کچھ بولا۔ میں نے اسے پھر کہا لاعربی لافرنچ وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے دو سے تین بار مینو کارڈ پڑھا الٹ کر دیکھا شاید کوئی تصویر بنی ہو لیکن وہ بھی کہیں نہ تھی۔ بیگم صاحبہ کہنے لگی اسلامی ملک ہے نہ ہیم ہو گا نہ

کوئی غلیظ شے ہو گی۔ بسم اللہ پڑھ کر کہیں انگلی رکھ دیں، جو آیا کھا لیں گے۔ ایک جگہ فرانسیسی زبان میں چکن سے ملتا جلتا لفظ تحریر تھا۔ میں نے وہاں انگلی رکھی اور دو انگلیوں سے اشارہ کیا۔ تندور پر پکتی ہوئی روٹی کی جانب اشارہ کیا اور کہا کہ چار لے آؤ۔ ایک طرف وہ روٹی پر کچھ سرخ رنگ کی چٹنی لگا رہا تھا۔ میں نے اس طرف اشارہ کیا وہ سمجھ گیا۔ بچوں کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ کہ وہ چٹنی لگی روٹی کیسے کھائیں۔ میں نے بچوں سے کہا کہ یہ شاید ٹماٹروں کی بنی کوئی ڈش ہے۔ ہاتھ گندے کرو یا صاف رکھو تمہاری مرضی خاموشی سے کھا لو۔ بچوں نے بڑے مزے لے کر کھایا۔ وہ پیزا تھا جو پہلی بار بچوں نے ٹیونس میں کھایا۔ پیسے دینے کے لیے کاؤنٹر پر پہنچا بیرے نے پاکستانی طرز کے ویٹر کی طرح آواز لگائی۔ میں نے جیب سے بہت سی چونیاں نکالیں اور اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر اس کے سامنے کر دیں کاؤنٹر پر بیٹھے منیجر نے میری جانب حیرانگی سے دیکھا۔ میں نے اُسے کہا لافرنچ لاعربی اور اپنی طرف اشارہ کیا اور کہا، انا پاکستانی وہ فوراً چونکا اور بولا اہلاً وسہلاً اور پھر جتنے پیسے لے چکا تھا ان میں سے چند سکے مجھے واپس کر دیئے۔

اگلی صُبح ہوٹل سے نیچے اتر کر ایک ٹیکسی والے کو اشارے سے روکا۔ اسے کہا کہ کارتھج جانا ہے۔ اُس نے عربی زبان میں کچھ کہا پھر ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں کچھ بولا جواباً لافرنچ لاعربی کا کہا۔ اور اسے بتایا کہ میں پاکستانی سیاح ہوں کارتھج کے کھنڈرات دیکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرائیور کی آنکھوں میں حیرانگی کی چمک آ گئی، بولا اہلاً وسہلا۔ پھر اشاروں کی زبان میں سورج کی جانب اشارہ کیا۔ اور کہا۔ اللہ اکبر یعنی نماز فجر۔ اور پھر سر کو دوسری جانب جھکا کر اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کافی دور ہے۔ صبح جاؤ اور رات کو لوٹ کر آؤ۔ میرے پاس پورا دن تو نہ تھا صرف چار بجے تک ہی رک سکتا تھا، K.L.M کی فلائیٹ تو پانچ بجے جانی تھی۔ مجبوراً کارتھج کے کھنڈرات دیکھنے کا ارادہ ترک کیا اور میوزیم چلنے کا کہا۔ یہ میوزیم کسی سابقہ حکمران کا محل تھا۔ ہر بورڈ پر عربی اور فرنچ زبان میں بہت کچھ تحریر تھا۔ لیکن کیا پڑھتا دونوں زبانیں میری سمجھ سے بالا تھیں۔ بس چیزوں کو دیکھنے لگ گیا۔ فضول وقت ضائع کرنے کے بجائے وہاں سے ہوٹل واپس آئے اور ائیر پورٹ چلے گئے۔

جہاز کی روانگی سے چار گھنٹہ پیشتر ہی ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ K.L.M سے روانگی تھی، دفتر کُھلا تھا اور بورڈنگ جاری تھی۔ جہاز کا وقت تبدیل ہو چکا تھا، جہاز پرانے وقت سے دو گھنٹہ پیشتر

روانہ ہو جانا تھا۔ جہاز کے نمائندہ نے بتایا کہ آپکی سیٹیں کنفرم ہیں۔ اگلا مرحلہ اب تمام دینار واپس کرنے کا تھا۔ وہی کل والے صاحب کاؤنٹر پر کھڑے تھے جن سے ڈالر ایکسچینج کروائے تھے۔ میں کاؤنٹر پر گیا اور پیسے دینے سے پہلے اُسے ڈالر ایکسچینج کی رسید پیش کی۔ پھر وہ تمام چونیاں جنہیں کوئی لینے کیلئے تیار نہ تھا کا ڈھیر لگایا۔ اُس نے اُن کی جانب دیکھا اور نوٹ اور بڑے سکے لیے اور اُن کو گنا۔ تمام چونیاں جن میں ہر ایک کا وزن دو گرام سے زیادہ نہ ہوگا کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ میں یہ سمجھا کہ وہ اب اِن سب کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ایک ترتیب دیگا۔ اُسنے اُن سب کو اکٹھا کر کے اپنے سامنے کیا اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ سب کو نیچے پھینک دیا۔ میں نے اسے غصے میں کہا۔

''تم نے ہی یہ چونیاں دی تھیں۔ اب واپس لینے کی بجائے اِن کو کوڑا کرکٹ سمجھ کر اپنے پاؤں میں پھینک دیا ہے۔''

وہ بولا۔

''یہ اگر میں گِن کر سامنے بھی رکھوں تو بھی یہ ایک ڈالر کی قیمت کے برابر نہیں ہوں گی۔ اس لیے اِن کو گننے کی محنت زیادہ اور پیسے کم۔''

حالانکہ وزن کے حساب سے اُن چونیوں کا وزن تین سو گرام سے کسی صورت کم نہ تھا۔ بینک کے کیشئر کا چونیوں سے تحقیر آمیز رویہ مجھے کو سخت ناپسند آیا۔ میں نے اُسے کہا۔

''آخر تم بھی انہی چونیوں کے حصول کے لیے یہاں پر کھڑے ہو۔ اور آٹھ گھنٹے تک یہاں موجود رہو گے۔ تم یہ چونیاں بچوں اور اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ہر ماہ وصول کرتے ہو۔ اِن چونیوں سے بہتر سلوک کرو۔''

وہ تھوڑا سا شرمندہ ہوا۔ آنکھیں نیچے کیے زمین پر جُھکا۔ اور مٹھی بھر چونیاں اپنے پاؤں میں گری اکٹھی کر کے دوبارہ کاؤنٹر پر رکھ دیں، اور اُنہیں گننے لگا۔ لیکن چونیاں گن کر ایکسچینج میں مجھے مزید کچھ نہ دیا۔ میں ڈالر ایکسچینج میں لے کر وہاں سے ڈیپارچر لاؤنج میں آ گیا۔ ڈیوٹی فری شاپ پر ونڈو شاپنگ کے لیے گھومتا رہا، چند ایک اشیاء کی قیمتیں بھی معلوم کیں۔ لیکن ایکسچینج ریٹ میری سمجھ میں نہ آیا۔ کاونٹر والے سب عربی یا فرانسیسی میں بات کرتے۔ لہٰذا میں یہ نہ جان سکا کہ اِن کی قیمت کیا ہے۔ ایک ڈیوٹی فری شاپ پر ایک بھدا سا چھوٹا مجسمہ پڑا تھا۔ جس پر عربی زبان

میں اُس کا نام لکھا تھا۔ قیمت دریافت کی لیکن سمجھ نہ آیا کہ کیا مانگتا ہے۔ میں نے کوٹ کی جیب میں بچی ہوئی چند چونیاں نکالیں اور دکان دار کے سامنے رکھ دیں۔ کوٹ کی دوسری پاکٹوں کو بھی دیکھا یہی کم قیمت چونیاں چند ایک اور پاکٹ کے کونوں میں چھُپی مل گئیں۔ وہ بھی دکان دار کے سامنے رکھ دیں۔ دکان دار نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے اُن سب چونیوں کو واپس اُٹھایا۔ پھر دل میں خیال آیا کہ اِن چھوٹے بے قیمت سکوں کو کوڑا دان میں پھینک کر اپنا وزن ہی ہلکا کر لوں کہ پیچھے سے اُسی دکان دار نے آواز لگائی یا شیخ اور اشارے سے واپس بلایا اور مجھے وہ بھدا سا مجسمہ پکڑا دیا۔ وہ مجھ کو تحفہ دے رہا تھا، کہا اہلاً وسہلا، پاکستانی۔ میں نے وہی تمام سکے اُس کی دکان کے کاونٹر پر رکھ دیئے اور جیب میں سے امریکن سینٹ بھی نکال کر اُسے دیے۔ اور شکراً کہا ہم سب ڈیپارچر لاؤنج میں چلے گئے۔ جہاز میں بورڈنگ کا اعلان ہوا تمام مسافر اپنی اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔ جہاز کے عملہ نے تمام مسافروں کو گِنا اور اپنی لسٹ کو چیک کیا۔ جہاز کے عملہ نے جہاز کے دروازے بند کر دیئے۔ کاک پٹ کی جانب سے ایک درمیانہ قد کی صحت مند سانولے رنگ کی ایئر ہوسٹس نکلی۔ ایر ہوسٹس نے نیوی بلیو رنگ کی سکرٹ اور کُرتی کے علاوہ، سر پر بھی اسی کپڑے کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ٹوپی کی بائیں جانب ایک چمکیلا تاج لگا تھا۔ اس تاج کے نیچے KLM کے الفاظ بھی اسی دھاگہ سے بنے تھے۔ ائیر ہوسٹس نے مسافروں سے عربی، فرانسیسی اور انگریزی زبان میں سیٹ بیلٹ باندھنے کی درخواست کی۔ جہاز کا انجن سٹارٹ ہوا اور جہاز نے آہستہ آہستہ رن وے کی جانب رینگنا شروع کر دیا۔ لیکن سو گز چلنے کے بعد وہ ایک سخت جھٹکے سے رُک گیا۔ جہاز نے دوبارہ چلنا شروع کیا، لیکن ایک جھٹکے سے پھر رک گیا۔ جہاز کے عملہ نے تمام دروازے بشمول ایمرجنسی کھول دیئے۔ جہاز کا عملہ کھلے دروازوں پر کھڑا تھا۔ تمام مسافر پریشان تھے کہ جہاز اپنی روانگی کے بعد ایک جھٹکا سے کیوں رک گیا ہے۔ اُس کا انجن بھی بند کر دیا گیا تھا۔ کافی انتظار کے بعد جہاز کا کپتان مائکروفون پر آیا انگریزی زبان میں بولا کہ جہاز کا ہائیڈرالک سسٹم صحیح کام نہیں کر رہا تھا۔ لہٰذا جہاز کو روک دیا گیا ہے۔ اُس نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اُس نے ہیڈ آفس میں اطلاع کر دی ہے۔ آپ ابھی جہاز پر ہی تشریف رکھیں تھوڑی دیر میں کولڈ ڈرنکس پیش کی جائیں گی۔ جہاز کا عملہ بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے تحفے، گڑیاں، پلاسٹک اینٹوں کا ''لیگو'' سیٹ،

تاش کی چھوٹی چھوٹی ڈبیاں لے کر آ گیا۔ بچے تو خوش ہو کر مصروف ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ جہاز کے کپتان نے دوبارہ مخاطب کیا، معذرت کا اظہار کیا۔ میں آپ کو واپس ڈیپارچر لاؤنج میں ٹیکنیکل اور قانونی وجوہات کی بناء پر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ البتہ تازہ ہوا کے لیے باہر سیڑھی پر بنی چوکی یا دروازے کے پاس آپ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ چند مسافر باہر چلے گئے میں بھی اُن میں شامل تھا۔ باہر سیڑھی پر کھڑی ایک مسافر خاتون کو سگریٹ پیتے دیکھ کر مجھے بھی سگریٹ کی خواہش ہوئی۔ جہاز کے اندر گیا بریف کیس سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور باہر گیٹ پر آ گیا۔ سگریٹ کو منہ میں رکھ کر جلانے کے لیے جیب سے لائیٹر نکالا، سامنے کاؤنٹر پر بیٹھی ائیر ہوسٹس نے مجھے اشارہ سے منع کیا کہ سگریٹ نہ جلانا۔ اُس سے پیشتر عورت کو سگریٹ پیتے دیکھ چکا تھا۔ میں نے اُس کے اِس حکم کی پرواہ نہ کی اور لائیٹر جلایا۔ ائیر ہوسٹس نے کاؤنٹر سے ایک لمبی جست لگا کر لائیٹر کے شعلہ پر ہاتھ رکھ کر بجھا دیا۔ اور اُس نے اپنے جلے ہوئے ہاتھ کی کلائی کو دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''شاید آپ بھول گے ہیں کہ ہم لاونج میں نہیں ٹارمک (Tarmac) پر کھڑے ہیں''

وہ ہاتھ کو مسلسل جھٹک رہی تھی اور بات بھی رُک رُک کر رہی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنا ہاتھ کی کلائی کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اس کے بعد وہ آگے مزید کچھ نہ بول سکی اور واپس کاؤنٹر پر چلی گئی۔ اس بے وقت عمل پر میں دل ہی دل میں نادم ہو گیا۔ اتنے میں جہاز کا 'پرسر' (purser) بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہیں آ گیا۔ اُس نے ائیر ہوسٹس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس کی وجہ دریافت کی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ ائیر ہوسٹس نے جلتے شعلہ کو اپنی ہتھیلی سے بجھایا ہے۔ اُس نے پہلے تو نلکا سے پانی نکالنے کی کوشش کی لیکن جہاز کا سسٹم بند تھا۔ اس نے سافٹ ڈرنک کی ایک بوتل کو جلدی میں کھولنے کی بجائے توڑ دیا۔ اور میرے سامنے کر کے کہا۔ سگریٹ کو اس میں ڈبو کر بجھا دو۔ آگ تو سگریٹ تک پہنچی ہی نہ تھی۔ خشک سگریٹ کو ہی توڑ کر اُس ٹوٹی بوتل میں ڈال دیا۔ میں اپنی غلطی پر نادم، اسی کشمکش میں باہر سیڑھی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں مجھ سے پہلے مسافر خاتون کھڑی اس ڈرامہ کو دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''یہ ائیر ہوسٹس روایت کی بات کر رہی ہے میں نے تو ابھی ایک سگریٹ بڑے سکون سے پیا ہے۔''

اس نے سیڑھی کے پایہ کی جانب اشارہ کیا جہاں اس نے رگڑ کر جلتے سگریٹ کو بُجھایا تھا۔ سگریٹ کی راکھ اس وقت تک اس پایہ کے ساتھ چپکی تھی۔ اور نیچے سیڑھی کے پاس سگریٹ کا بُجھا ٹکڑا بھی پڑا تھا۔

حوصلہ ہوا کہ اتنا بڑا جرم بھی نہیں کیا۔ اگر جہاز کا کپتان کوئی بات کرتا ہے تو میں اُنہیں سگریٹ کا بُجھا ہوا (butt) بٹ اپنی صفائی میں دکھاؤں گا۔ اور کہوں گا کہ پہلے تو یہ لڑکی خود پی رہی تھی اور جب میں نے اس کو دیکھ کر سگریٹ جلایا تو اس نے یہ سب ڈرامہ کیا۔

لڑکی ابھی تک درد سے تلملا رہی تھی اور ہاتھ کو مستقل جھٹک رہی تھی اور پھونک مار کر ہاتھ کے درد کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنے میں جہاز کا کپتان بھی وہیں آ گیا تمام کہانی سننے کے بعد لڑکی سے انگریزی زبان میں مخاطب ہوا۔

''یہ ڈرامہ بازی بند کرو۔ ہر جہاز میں تمہیں مسافروں سے کوئی نہ کوئی مسلہ ہو جاتا ہے۔ ہم پچھلے دو گھنٹوں سے لاونج کے باہر کھڑے ہیں۔ سگرہٹ کی خواہش فطری ہے۔ مجھ سے معذرت خواہ ہوا اور کہنے لگا۔

''آپ سگریٹ پی سکتے ہیں ویسے بہتر ہے کہ آپ اس وقت برداشت کریں اور نہ پیئیں۔ اب ہم تھوڑ دیر میں چلنے والے ہیں۔''

جہاز کا ہائیڈرالک سسٹم تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کپتان نے جہاز کے انجن کو سٹارٹ کیا۔ ایک دوسری ائیر ہوسٹس نے مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی، فرانسیسی اور عربی زبان میں آ کر ہمیں سیٹ بیلٹ باندھنے کی درخواست کی۔ 'اپرن' (Apron) تک پہنچنے سے پہلے دو تین بار جہاز کی بریک لگا کر ''ہائیڈرالک سسٹم'' کو ٹیسٹ کیا گیا۔ مغرب سے پیشتر ہم نائیجیریا کے شمالی ائیر پورٹ کانو میں تھے۔ چوہدری حنیف صاحب میری گاڑی لیے تین گھنٹے سے ائیر پورٹ پر منتظر بیٹھے تھے۔ وہیں سے گاڑی لی اور اُنہیں ان کے گھر اُتارا۔ اور 'مِنا' (minna) کی جانب روانہ ہو گیا۔ ہم رات گئے اپنے شہر مِنا پہنچ گئے۔

لندن یاترا

اگلے سال ۱۹۷۸ کالج تعطیلات کے دوران پاکستان براستہ لندن کے ٹکٹ بنوائے۔

لندن میں پانچ روز تک رکنے کا پروگرام بنایا۔ پہلے دو روز میوزیم دیکھا جائے اگلے تین روز لندن شہر کی سیر اور شاپنگ کی جائے۔ امیگریشن نے مجھے آٹھ دن کا ویزہ دے دیا۔ برٹش ائیرویز کے دفتر ہوٹل کا ووچر بنوانے چلا گیا۔ ہوٹل کی بکنگ دینے والی لڑکی نے ووچر دینے سے انکار کر دیا۔ لڑکی کہنے لگی آج کی بجائے آپ کو کل یہاں آنا چاہیے تھا۔ اس سے پیشتر کہ میں بات کرتا، اس کے ساتھ بیٹھی لڑکی فوراً بولی کہ محترمہ تم غلط ہو۔ ہر مسافر نے اپنی سہولت دیکھ کر سفر پر نکلنا ہوتا ہے۔ قانون کو دیکھو اور پھر ان سے بات کرو۔ اگر اِن کی اگلی فلائیٹ کنفرم ہے تو ووچر بنا کر دو اگر نہیں تو انکار کر دو۔ وہ اٹھی اور مجھے ائیر پورٹ کے نزدیک ہوٹل ''ایکسلسیر'' کا ووچر بنا دیا۔ دوسرے روز ہم اپنے ایک جاننے والے کے گھر چلے گئے۔

برٹش میوزیم

دوسری صبح سیدھے بلومزبری (Bloomsbury) میں رسل سٹریٹ (Great Russell Street, London) برٹش میوزیم چلے گئے۔ یہ ایک بڑا میوزیم ہے جو ۲۶۳ سال پہلے وجود میں آیا۔ یہ انسانی تاریخ تہذیب و تمدن اور آرٹ کے لیے وقف ہے۔ اس میں تقریباً تمام براعظموں سے بہت سے ممالک سے جمع کی گئی ۸۰ لاکھ اشیا رکھی گئی ہیں۔ میوزیم میں دس علیحدہ علیحدہ شعبے بنے ہیں۔ ہم سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ سب سے پہلے مصر کا شعبہ میوزیم (Department of Ancient Egypt and Sudan) دیکھتے ہیں۔
میوزیم کی ابتدا میں رہنمائی کے لیے آٹھ فٹ اونچا بورڈ نصب تھا۔ اس پر دو حصوں میں مختلف ممالک کے نام لکھے اور سمت کے نشانات بنے تھے۔ بورڈ پڑھتے پڑھتے اور سمت کی ہدایات پر عمل کرتے مصر کے میوزیم پہنچ گئے۔

پیپرس (papyrus) پر لکھی بک آف دی ڈیڈ (Book of the Dead) کے پتے ڈھیر کی صورت بکھرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ یہ کتاب پیپل کے پتوں کی شکل کے پتوں پر لکھی تھی یہ پتے سائز میں پیپل درخت کے پتوں سے دگنے اور رنگ میں زردی مائل تھے۔ کسی پتے کا کوئی حصہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہ تھا۔ ان کے کنارے اصلی حالت میں تھے چکناہٹ واضح تھی تحریر کی سیاہی ابھی تک روشن اور تمام الفاظ واضح تھے۔ پڑھنے والے کو کسی دشواری کا سامنا نہ ہو سکتا

تھا۔ پیپرس کے ان پتوں پر لکھی یہ کتاب فراعنہ کے لیے ایک صحیفہ کا درجہ رکھتی تھی۔ اس ڈھیر کے سامنے رکھی ایک تختی پر تحریر تھا۔
''بک آف دی ڈیڈ کو مختلف عبادت گاہوں کے راہبوں نے تحریر کیا۔ ماہرین لسانیات اور محقق کتاب کے چند اوراق کو ۲۴۰۰ ق م (3rd millennium BCE) میں تحریر شدہ مانتے ہیں۔ اس کتاب کو مختلف خانقاہوں سے اکٹھا کیا گیا۔''
ان پتوں کے سامنے رکھی تختی پر یہ بھی تحریر تھا۔
''اس میں دیوی دیوتاؤں کے منتروں کا بیان ہے۔ اور اس کتاب میں موت کے بعد انسانی روح کے سفر کی داستان درج ہے۔''
پیپرس کے ایک پتہ پر ایک لمبے منہ والے جانور کے ساتھ ایک راہب اور ساڑھی نما لباس پہنے ایک نازک اندام خاتون کی تصویر بنی تھی۔ خاتون اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے کسی سے مخاطب نظر آئی۔ خاتون کی شکل واضح تھی۔ اس تصویر کے نیچے طوطے، مینا، کوے، سانپ، پانی کی لہریں اور الٹی سیدھی لائنیں اور دائیرے بنے تھے۔ قدیم مصری زبان کی تحریریں تھیں۔ اس کے ساتھ ہوٹپ کا صحیفہ بھی رکھا تھا۔ یہ کتاب بھی کسی مقبرے سے ملی۔ اس کتاب کے سامنے رکھی تختی پر تحریر تھا۔
''کتاب ۲۲۰۰ ق م میں تحریر کی گئی۔ اس کتاب میں صرف سماجی زندگی کے متعلق قوانین درج ہیں یعنی دھوکا نہ کرو ظلم نہ کرو، غلاموں کو کھانا دو''
اس کتاب کے ڈھیر کے ساتھ رکھی اس تختی پر یہ بھی تحریر تھا۔
''حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں اِن قوانین کو دوبارہ تحریر کیا گیا۔ یہ اخلاقیات کا درس دینے والی دنیا کی پہلی کتاب ہے۔''
دوسرے کمرے میں حنوط شدہ لاشیں (Mummy) ممی رکھی تھیں۔ اور ان ممی کے پُورے جسم پر ایک انچ چوڑی پٹی لپٹی تھی۔ تختی پر تحریر تھا، ایک وقت میں دو پٹیوں کو اس طرح لپیٹا جاتا کہ دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمت پر چلتی اور کراس کرتے ہوئے انگریزی حرف تہجی ''V'' (وی) بناتی۔ پٹیوں کو بروزہ میں بھگو کر لگاتے جس سے وہ جسم پر چپک جاتی اور خشک ہو جانے کے بعد جسم کے تمام نشیب و فراز کو ظاہر کرتی۔ ہاتھ کا انگوٹھا اور ہتھیلی اور چہرہ کی لمبائی چوڑائی اور ناک، کان وغیرہ انتہائی خوبصورتی سے واضح ہو رہے تھے۔ کانوں کی لو (lobe) کی اپنی

موٹائی اور درمیانی خلاء کی اصلی حالت کو واضح کر رہی تھی۔ ناک کے نتھنے اور کان کی پٹی حنوط کرنے والے کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ سینہ کی پسلیاں ران گھٹنے پنڈلیاں پاؤں کی ہڈیاں یہاں تک کہ پاؤں کے تلوے کی دونوں قوسیں کے تمام نشیب وفراز واضح تھے۔ ایک گندے میلے دانتوں والی ممی کے ساتھ رکھی گئی ایک تختی پر تحریر تھا۔

''اس کا ایکسرے لیا جس سے واضح ہوا کہ یہ شخص فلاں مرض میں مبتلا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوئی۔''

ایک دوسری ممی کے سامنے ایک تختی پر تحریر تھا۔

''اس شخص کے جسم پر سے کچھ پٹیاں ہٹائی گئی تو نیچے جسم کے پٹھے نرم تھے۔ فلاں دوائی کا ایک انجکشن اتنی مقدار میں لگایا گیا جو جسم کے اندر چلا گیا۔ انجکشن کی دوائی اتنے منٹ اتنے سکینڈ اور اتنے پوائنٹ تک جسم کے اندر رہی۔ اس کے بعد وہ جگہ سوج گئی، اور انجکشن باہر آ گیا۔''

ایک عورت کی ممی بھی بڑے مرصع اور مزین ڈبے میں بند رکھی تھی۔ چند کبوتر ایک کتا ایک بلی کی حنوط شدہ لاشیں (Mummy) ممی ایک کونے میں شوکیس کے باہر رکھی ہوئیں تھیں۔ سارا دن اسی میوزیم میں گزر گیا۔

لندن میوزیم

تیسرے روز ہم لندن میوزیم (Victoria and Albert (V&A) Museum London) چلے گئے۔ یہ ۱۸۵۲ء میں ملکہ وکٹوریہ اور شہزادہ البرٹ کے ناموں پر مبنی نام پر قائم ہوا۔ یہ دُنیا کا سب سے بڑا آرائشی آرٹ اور ڈائزین کا میوزیم ہے۔ یہاں ۴۵ لاکھ مستقل اشیاء ذخیرہ رکھی گئی ہیں۔ وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم ساڑھے بارہ ایکڑ رقبہ پر محیط ۱۴۵ گیلریزی پر مشتمل ہے۔ یہاں زمانہ قدیم سے موجودہ زمانے تک پانچ ہزار سالہ زمانے پر محیط اشیاء، یورپ امریکہ ایشیا اور افریقہ کی تہذیبوں سے اکٹھی کر کے رکھی گئی ہیں۔ یہ اشیاء فن کوزہ گری، گلاس، ٹیکسٹائل، لباس، زیورات، چاندی سونے۔ لوہے کی بنی اشیاء پر مشتمل ہیں۔ یہاں ازمنہ وسطی کا فرنیچر، مجسمے، مصور تصاویر، فوٹو گراف، ڈرائینگ، پرنٹ، پرنٹ سازی، دھاتوں کے فنون، اسلامی فنون، جنوبی ایشیا، چین، کوریا اور جاپان سے لائے گئے شہ پارے رکھے گئے ہیں۔

ٹاور آف لندن میوزیم

یہ ایک تاریخی ٹاور ہے۔ اسکا برطانیہ کی تاریخ میں اہم کردار رہا ہے۔ ٹاور آف لندن میں ملکہ عالیہ کا محل اور قلعہ شامل ہے۔ عمارت کے ایک حصہ میں پرانے زمانہ کی جنگوں میں استعمال ہونے والا سامان حرب رکھا تھا۔ ایک سینٹی میٹر موٹی تار سے بنی بہت سی زرہ بکتر، ران اور پنڈلیوں پر باندھنے والی جالی کانسی کے خود دیوار کے ساتھ لٹک رہے تھے۔ چند برطانوی سیدھی اور چند فرانسیسی ترچھی ہلالی تلواریں اور خنجر ایک ڈھیر کی صورت وہیں تین بڑی میزوں پر رکھی تھیں۔ دیگر سامان کے علاوہ ٹیپو سلطان کا کانسی سے بنا شیر اس کی تلوار اور ڈھال بھی وہیں علیحدہ رکھی تھی۔ خیال آیا کہ یہ اس مرد مجاہد کے زیر استعمال تھیں۔ جس کی موت کے بعد اس کی آنکھوں کی چمک سے انگریزی فوجی ڈر رہے تھے کہ وہ ابھی زندہ ہے اور انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہو جائیگا۔ اسی میوزیم میں تاریخی قیمتی ہیرا کوہ نور بھی رکھا تھا۔ یہ ایک بڑا ہال کمرہ تھا۔ ایک کانسٹیبل کھڑا لوگوں کو آگے بڑھنے کا کہہ رہا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ کا تاج اور اس کا تمام زیور جو اس نے اپنی رسم تاجپوشی پر پہنا، ایک شوکیس میں رکھا تھا۔ تاج کے سامنے ایک جگہ واضع خالی نظر آئی تاج کے نیچے ایک تختی پر تحریر تھا۔

''اس خالی جگہ پر کوہ نور ہیرا نصب تھا۔ شوکیس میں رکھا ہیرا اس کی نقل ہے۔ اصلی ہیرا والٹ ('Vault' exhibit at the Natural History Museum in London) میں رکھا ہے۔''

نقلی کوہ نور ہیرا ایک سٹینڈ پر رکھا تھا۔ میری نظریں مصنوئی ہیرا کی گردش میں گم تھیں۔ میں اس کی تاریخ اور اس سے وابستہ نحوست کو سوچ رہا تھا۔ ہیرا کی دیو مالائی طاقت کی داستان دو ادیبوں رام دوگل کلانوری اور ولکی کولن نے تحریر کیں۔ دونوں نے ہیرا کے جائیز مالک کی خوش بختی اور ناجائیز مالک کی مشکلات کو زیر بحث رکھا۔ رام دوگل نے اپنی کتاب ''کوہ نور ہیرا کی داستان'' میں ہیرا سے منسلک نحوست اور خوش قسمتی دونوں کا ذکر کیا۔ اس نے لکھا ہے کہ کرشن جی مہاراج کے بھائی ستراجیت کو سورج دیوتا نے اس کی سچی تپسیا کے عوض یہ ہیرا بطور انعام دیا۔ رام دوگل نے ستراجیت کی کامیابیوں اور خوشحالی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا۔ ستراجیت امیر ہو گیا، اس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں کی بہت مدد کی۔ ستراجیت کے بھائی برسین نے یہ ہیرا ستراجیت سے چھین کر کرشن چندر جی کے نانا اگرسین کو دینے کی کوشش کی اس طرح چوری شدہ ہیرا کی نحوست ہر مالک کو اپنی لپیٹ

میں لیتی ہوئی راجہ رنجیت سنگھ کے پاس پہنچ گئی۔ بہت سے بادشاہوں کو اپنی سلطنت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ بہت سے بادشاہ کسمپرسی کے عالم میں موت کے منہ میں گئے۔

اس کے برعکس ولکی کولن اس ہیرا کی ابتدا گولکنڈا کی کان سے کی۔ وہ بھی اس کی دیومالائی طاقت کا سہارا لیتے ہوئے ہیرا کی داستان ناجائز ملکیت سے شروع کرتا ہے۔ یہ ہیرا ٹیپو سلطان کے خنجر سے انگریزی فوج کے کرنل کمانڈر (Herncastle) ہرن کیسل نے ایک خوشحال زندگی گذارنے کے لیے چوری کرلیا، اور ہیرا کی نحوست کا سایہ اس پر پڑا۔ وہ خوشحال زندگی کی بجائے تنہائی اور غربت کا شکار ہوگیا۔ ولکی کولن کہانی کا مرکز صرف ہیرا کی نحوست ہے۔ اس کو واضع کرنے اور تجسس پیدا کرنے کے لیئے اس نے بہت سے فرضی قصے نقل کیئے۔

میڈم تساو (Madame Tussauds) میوزیم لندن

اُس سے اگلے روز ہم میڈم تساو میوزیم دیکھنے چلے گیے۔ ٹکٹ خریدنے کے بعد راستہ میں کھڑے ایک سیکورٹی افسر کو ہال میں جانے کے لیئے ٹکٹ پیش کیے۔ اصل میں وہ ایک بت سیکورٹی پر مامور کانسٹیبل کی وردی پہنے کھڑا کیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر اس کے سامنے رکا رہا۔ ایک سیاح نے بتایا کہ وہ ایک بت ہے۔ میں آگے ہال کی جانب بڑھ گیا۔ ہال کے اندر پوری دنیا کے مشہور لوگوں کے بت رکھے تھے۔ جن میں ایشیا کے سوئیکارنو، موہن داس کرم چند گاندھی، جواہر لال نہرو، برہما کے نیون کے بت نمایاں تھے۔ انگلستان کے شاہی خاندان کے بت ہنری ہشتم سے لیکر جارج ششم تک کے بت نمایاں جگہ پر رکھے تھے۔ ایک کونے میں ملکہ الزبتھ دوئم اسکا خاوند اوران کے تمام بچوں کے بت ان کے قد کی مناسبت سے بنے تھے۔ ان بتوں کے علاوہ برازیل کا فٹ بال کھلاڑی پیلے اپنے کھیل کے لباس میں بت بنا کھڑا تھا۔ موہن داس کرم چند گاندھی اپنے اصلی سیاسی لباس میں ایک لمبی چھڑی لیئے کونے میں کھڑا تھا۔ ایک جانب ''لولو برجڈا'' بیٹھی تھی۔

نیچے بیسمنٹ جس کا نام چیمبر آف حارر (Chamber of horror) میں انقلاب فرانس میں استعمال ہونے والی گلوٹین اپنی اصلی خون الودہ حالت میں کھڑی تھی۔ یہ ایک لمبی میز کے درمیان فٹ تھی۔ گلوٹین قینچی کی طرح دو بڑے بلیڈون پر مشتمل تھی جو دو الٹی تکونوں کی طرز میں فٹ تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک تختہ تھا جس پر انسان کو باندھ کر گردن کو گلوٹین میں رکھ دیتے۔ بلیڈ دس فٹ

اوپر سے ایک وزنی چھرے کی طرح گردن پر گرتا اور سر کو کاٹ کر دوسری جانب پھنک دیتا۔ دونوں بلیڈ خون میں لتھڑے تھے۔

گلوٹین کے ساتھ ایک چھوٹے قد کا موٹا شخص پھانسی میں استعمال کرنے والی اصلی رسی ہاتھوں میں لیئے کھڑا تھا۔ بیسمنٹ میں روشنی بھی مدھم تھی۔ بیگم صاحبہ اس حصہ میں مزید نہ رک سکیں۔ مزید اس میں کیا رکھا تھا ہم نہ دیکھ سکے اور فوراً باہر آ گئے۔

دوسرے روز پاکستان چلے گئے۔ ایک روز ہمشیرہ کے پاس رکے اور چند روز بڑے بھائی جان کے پاس رک کر واپس نائیجیریا کا رخ کیا۔

فریضہ حج

اگلے سال ۱۹۷۹ گرمیوں کی تعطیلات گذارنے پاکستان جانے کی تیاری مکمل کر کے، ٹیبل پر بچوں کے ہمراہ بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا کہ میرے ایک نائیجیرین ہمسایہ نے گھر کے باہر آ کر آواز دی۔

''مسٹر غلام فاروق کیا آپ باہر آسکتے ہیں؟''

میں اسے ملنے باہر گیا اس کے ہاتھ میں آڈیو کیسٹ تھی۔ وہ بولا۔

''مسٹر فاروق یہ کیسٹ ہے جس میں آپکی کی زبان میں مذہبی گانے ہیں آپ لے لیں''۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور چیک کرنے کے لیے آڈیو کیسٹ کو ٹیپ ریکارڈر میں لگایا۔ ٹیپ آن کیا جو کچھ سُننے میں آیا وہ کچھ یُوں تھا۔

''چلو چلو حج کا مہینہ آگیا''

فوراً خیال آیا کہ حج اِس دفعہ اکتوبر کے خوشگوار موسم میں ہے کیوں نہ حج کر کے پاکستان جائیں۔ بیگم صاحبہ سے بات کی وہ تو اِس کے لیے پہلے سے تیار تھیں۔ کہنے لگی اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔ موجودہ پروگرام کو کینسل کریں اور حج بیت اللہ کی تیاری کریں۔ اکتوبر میں اپنے ٹکٹ دوبارہ تبدیل کروا کر جدہ بھی سفر میں شامل کروالیا۔ حج کا ویزہ کانو سے بڑی آسانی سے مل گیا۔ صرف ایک بیان حلفی دینا پڑا کہ میں مسلمان ہوں اور میرا تعلق احمدیہ فرقہ سے نہیں ہے۔ میں رسول کریم محمد ﷺ کو آخری نبی مانتا ہوں۔ جدہ کے لیے سیٹ کا ملنا اتنا آسان نہ تھا۔ اللہ تو کل کانو سے آخری حج فلائیٹ جو سات ذوالحج رات گیارہ بجے چل کر آٹھویں ذوالحج صبح ڈیڑھ بجے

جدہ پہنچتی اس کے لیئے چھ سیٹوں کی درخواست کردی۔ دوسری طرف حج کے بعد پی آئی اے کی
جدہ سے کراچی کے لیئے پہلی فلائیٹ سے چھ سیٹوں کی درخواست کی۔ مجھے توقع تھی کہ کوئی بھی
حاجی حج کے فوراً بعد واپس آنا پسند نہ کرے گا۔لہذا اسی جہاز میں چھ سیٹوں کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

حکومت سعودیہ نے چھ ذوالحج رات بارہ بجے سے لیکر نو ذوالحج تک جدہ ائیر پورٹ بند کر
دینے کا اعلان کردیا۔لہذا چھ ذوالحج کو نائیجیریا کا آخری گروپ کا نو سے حج کے لیئے جانا طے ہوا۔
اس آخری جہاز کو رات سات بجے چلنا تھا۔اس کی بورڈنگ پہلے سات بجے شروع کرنے کا اعلان
ہوا۔ پھر نو بجے اور انجام کار رات ڈیڑھ بجے شروع کی گئی۔اس وقت تک چوہدری حنیف صاحب
میرے ساتھ تھے۔ چوہدری صاحب کی بیگم صاحبہ گھر میں اکیلی ان کا انتظار کررہی تھی۔ جب دیر
زیادہ ہوگئی تو ہمسایہ میں پاکستانی کے گھر گئی انہیں مجبور کیا کہ ائیر پورٹ جا کر چوہدری صاحب کی
خیریت کا پتہ کریں۔ چوہدری صاحب کا ہمسایہ بھی ائیر پورٹ پہنچ گیا۔ چوہدری حنیف نے بعد
میں بتایا کہ بیگم بیچاری بھی ساری رات جاگتی رہی۔ ہمارا آخری جہاز تھا جسے جدہ میں اُترنے کی
اجازت ملی۔جدہ اترنے کے بعد مکہ جانے کی بجائے،جدہ میں پاکستان ایئر لائن کے دفتر چلا گیا۔
وہاں راولپنڈی کالج کا شاگرد منیجر کے طور تعینات تھا۔اُس نے مجھے کمرہ میں نصب کیمرہ میں
پہچان کر اپنے کمرہ میں بلوالیا۔ بڑے تپاک سے ملا، میں نے واپسی کی سیٹ منظوری کی اطلاع نہ
پانے کا ذکر کیا۔اُس نے اس تاریخ کی بکنگ نکلوا کر دیکھی تو اس میں چھ سیٹیں ہی خالی تھیں۔اس
نے انچارج کو منظوری کا حکم دے دیا۔ وہ حج سے تیسرے روز کی تھیں۔اس طرح سعودیہ میں پانچ
روز ہی رکنے کا موقع ملا۔شاگرد عزیز کا شکریہ ادا کیا اور سیدھے مکہ چلے گئے۔وہاں پر محمد رفیع نامی
ایک پاکستان نژاد سعودی معلم کے حوالے ہوئے۔اس کے پاس صرف ایک چار منزلہ عمارت تھی
اس میں بھی چوتھی منزل پر کمرہ میں ہمیں سامان رکھنے کی اجازت ملی۔اس نے کمرہ میں سامان
رکھنے کے تین ہزار ریال لیے۔لفٹ خراب تھی سامان خود ہی چوتھی منزل پر لے جانا پڑا۔سامان
رکھنے کے بعد ہم بچوں کو لیے طواف بیت اللہ کے لیئے چلے گئے۔ بچوں کو بٹھانے کے لیے خانہ
کعبہ سے دور بھی کوئی محفوظ جگہ نظر نہ آئی جہاں بچوں کو اطمینان سے بٹھا سکتے۔مجبوراً خانہ کعبہ برامدہ
کی چھت پر چلے گئے۔ وہ منزل ان دنوں زیر تعمیر تھی۔ بچوں کو ایک ایسی جگہ پر بٹھایا جہاں ہم انہیں
دور تک نظر آرہے تھے۔ میں نے اور بیگم نے طواف کے سات چکر پہلی منزل پر مکمل کیے۔ مجھے

طواف کی عربی میں دعائیں یاد نہ تھی۔میں اللہ تعالےٰ کے حضور لبیک الٰھم لبیک کا ورد کرتا رہا۔اور
اللہ تعالیٰ کے حضور التجائیں کرتا چلتا رہا۔بیگم صاحبہ ایک کتابچہ میں لکھی عربی میں تحریر دعائیں پڑھ
رہی تھیں۔ مجھے ہر دو منٹ کے بعد بیگم صاحبہ کی انتظار میں رکنا پڑ جاتا۔ چلتے ہوئے کتاب میں تحریر
دعائیں دیکھ کر پڑھنا مشکل تھا۔میں نے انہیں دو تین بار اردو میں دعائیں پڑھنے کا کہا۔لیکن وہ نہ
مانیں اور بدستور کتابچہ سامنے ہاتھوں میں تھامے پڑھتی رہیں۔ وہ مجھ سے بات بھی اشاروں کی
زبان میں کر رہی تھیں۔ پورے ایک گھنٹہ دیکھ کر پڑھنے کے بعد انہیں تمام دعائیں پڑھنے میں
آسانی ہوگئی۔طواف مکمل کرنے کے بعد ہم نے اوپر والی منزل میں ہی مقام ابراہیم کے سامنے
جا کر نفل پڑھے۔طواف کے دوران ہم ساڑھے تین گھنٹہ چلتے رہے تھے۔اتنی دیر تک چلنے کے بعد
دونوں تھک گئے۔بچوں کے سامنے ایک دیوار کے سایہ میں لیٹ کر سو گئے۔ پندرہ منٹ ہی سوئے
ہونگے، کہ بچوں نے آکر جگا دیا، حاجیوں کا رش یک لخت بڑھ گیا تھا۔

دوسرے روز ہمارے معلم نے ہمیں ایک کارڈ دیا جس پر منا میں قائم خیمہ کا پتہ درج تھا۔
اس خدمت کے عوض معلم نے مزید تین ہزار ریال لیے۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا خیمہ میں تو تل
دھرنے کی بھی گنجائش نہ ہے۔مجبوراً خیمہ کے باہر ہی سامان رکھ کر ایک چادر تان کر بیٹھ گئے۔
دوسرے روز ہم میدان عرفات کی جانب چل دیئے۔خوش قسمتی سے مسجد نمرہ کے برآمدہ میں ایک
چھوٹے سے درخت کی گھنی چھاؤں تلے جگہ مل گئی۔ یہاں سے امام صاحب خطبہ حج پڑھتے نظر
آرہے تھے۔ظہر کی نماز کے بعد میں مذدلفہ کے لیے ایک گاڑی والے سے کرایہ طے کر رہا تھا۔یہ
ایک سامان لیجانے والی چھوٹی سوزوکی وین تھی۔اس کے اندر کوئی سیٹ نہ لگی تھی وہ بارہ میل سفر کے
بارہ سو ریال مانگ رہا تھا۔ میں دوسری وین کے ڈرائیور کی جانب متوجہ ہوا تا کہ اس سے کرایہ طے
کرلوں۔ اتنے میں ایک پاکستانی حاجی نو دس سال کی بچی کو بازو سے پکڑے جلدی جلدی موڑ
کاٹتے نظر آیا۔ مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر ٹھٹکا، مصنوعی ہنسی چہرے پر لا کر بولا۔
’’یہ بچی اپنے خاندان سے بچھڑ گئی ہے۔ میں اسے ساتھ لے آیا ہوں۔ تا کہ اس کی فیملی سے اسے
ملا دوں۔ بچی کو اپنے خیمہ کا نمبر یا معلم کا نام بھی یاد نہیں ہے۔‘‘
خود ہی کہنے لگا۔
’’بچی میرے ساتھ نہیں آرہی تھی۔اس کے والد صاحب اور میں ایک ہی کمپنی میں ملازم ہیں۔اُس

نے مجھے ایک گروپ فوٹو گراف دکھائی۔ اور فوٹو گراف میں کھڑے ایک شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اس کا والد کھڑا ہے اور یہ میں کھڑا ہوں۔ بچی نے باپ کی فوٹو گراف کو پہچان لیا ہے۔''

میں نے اسے کہا۔

''جس طرف سے آپ نے بچی کو لیا ہے اس کی الٹی جانب واپس لے جائیں۔ بچی اپنے خیمہ یا والد کو پہچان لے گی۔''

لیکن وہ نہ مانا۔ کہنے لگا میں اسے ابھی پاکستان کیمپ میں پہنچا دونگا۔ وہ پیچھے بھی بار بار دیکھ رہا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہ آ جائے۔ خود ہی دوبارہ مخاطب ہوا۔

''آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔''

میں نے اسے بتایا۔

''میں گاڑی کرایہ پر لینے آیا ہوں۔ جو مجھے مزدلفہ پہنچا دے۔''

کہنے لگا۔

''چلیں میں آپکو مزدلفہ چھوڑ آتا ہوں۔ یہ میری گاڑی ہے''

اس نے ایک پرانی ٹویوٹا کراون ٹیکسی گاڑی کی جانب اشارہ کیا۔ اور کہا۔

''بیٹھیں چلتا ہوں''۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ تو بچے بھی ہیں۔

وہ خود ہی کہنے لگا ۔

''چلیں میں آپ سب کو چھوڑ آتا ہوں پیسے بھی نہیں لونگا۔''

میں بہت خوش ہوا کہ وہ ہمیں مفت مزدلفہ پہنچانے پر راضی تھا۔ اس نے گاڑی میں سامان رکھنے میں میری مدد کی۔ مزدلفہ پہنچ کر اس نے گاڑی الٹی جانب دوڑا دی۔ میں نے زبردستی گاڑی رکوائی۔ وہ ہمیں دور کہیں غیر معروف جگہ پر اتارنا چاہ رہا تھا۔ اس نے ہمیں وہیں اتار دیا۔ بچی ہمارے ساتھ ہی وہاں اُتر گئی۔ اس نے بچی کو گاڑی میں بیٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن بچی اس کے ساتھ جانے کو تیار نہ ہوئی۔ میں نے بھی بچی دینے سے انکار کر دیا۔ گاڑی والا اس صورت حال میں جھگڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بچی کو وہیں چھوڑا، اور صبح آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ ٹیکسی والے کے

واپس میدان عرفات کی جانب موڑ کاٹتے ہی میں نے بچوں سے کہا نماز پڑھ لیتے ہیں اور سب ہمت کرو پیدل چلنے کے لیئے تیار ہو جاؤ۔ لیکن بیگم آڑے آ گئی کہنے لگی۔

''نماز سے زیادہ ضروری بچی کو اس کے والدین سے ملانا ہے۔ 'منا' کے خیموں کی روشنیاں سامنے نظر آ رہی ہیں، پہلے وہاں چلتے ہیں۔ بچی کو وہاں حکومت پاکستان کے خیمہ میں پہنچاتے ہیں۔ ہمارا خیمہ بھی پاس ہی ہے۔ نماز وہیں چل کر پڑھیں گے۔''

آدھی رات کے بعد ہم منا پہنچے۔ بچی کے ماں باپ پہلے ہی پاکستان کیمپ میں غم سے نڈھال بیٹھے تھے۔ اس کی ماں تو روئے جا رہی تھی۔ بچی نے دور سے ہی ماں کو آواز دی اور دوڑ کر اُسے لپٹ گئی۔ ڈیوٹی پر بیٹھے پاکستانی نمائندے نے میرے کوائف درج کیئے اور بچی کی واپسی کا اندراج بھی کر لیا۔ بچی کو پاکستان کیمپ پہنچا کر ہم اپنے کیمپ آ گئے۔ اس وقت تک ہم سخت تھک گئے تھے۔ بیگم صاحبہ نے نماز پڑھی۔ میں بیٹھتے ہی لیٹ گیا کہ ذرا آرام کر لوں پھر نماز پڑھتا ہوں۔ مگر لیٹتے ہی نیند نے غلبہ پا لیا اور میں سو گیا۔ صبح نماز کے لیے اُٹھا تو ساتھ والے خیمہ میں کچھ شور سنائی دیا۔ ایک صاحب لاؤڈ سپیکر پر عربی میں کچھ اعلان کر رہے تھے۔ اور وہ بڑی دیر سے اعلان کر رہے تھے۔ میں نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے خیمہ سے باہر جھانکا کہ یہ کیا اعلان ہو رہا ہے۔ میں نے دیکھا کہ آگ کے شعلوں نے ایک خیمہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہوا ہے۔ ہوا تیز چل رہی تھی اور ہر لمحہ پھیلتی آگ جا رہی تھی۔ منا کے اس حصہ میں ایشیائی زائیرین کے خیمے تھے۔ جن میں زیادہ تعداد پاکستان اور ہندوستان کے باشندوں کی تھی، عربی جاننے اور سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میں جلدی سے خیمہ سے باہر آیا اور لاؤڈ سپیکر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور اردو، پشتو، انگریزی اور فارسی زبان میں آگ کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ میرا اعلان کرنا تھا کہ لوگ جلدی سے اپنا سامان لیئے خیموں سے باہر نکل آئے۔ جلد ہی فائر بریگیڈ آ گیا۔ ابھی فائر بریگیڈ نے کام شروع نہ کیا تھا کہ تین ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوئے۔ ہیلی کاپٹروں نے ایک دائرے کی صورت میں آگ پر پانی پھینکنا شروع کر دیا۔ فائر بریگیڈ اور ہیلی کاپٹروں نے مل کر منٹوں میں آگ پر قابو پا لیا۔ اس کے بعد بلڈوزر آئے، انہوں نے جلے ہوئے خیموں کے علاوہ آٹھ دس مزید ارد گرد کے خیموں کو جس میں ہمارے خیمے بھی تھا گرا دیا۔ اور تمام میدان صاف کر کے نئے خیمے لگا دیئے۔ ایک شُرطے کو ہمارے سامان کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جس نے ہمیں سامان اُٹھانے کی اجازت نہ دی۔

تیسرے روز ۱۰۔ ذی الحجہ، حج کے دن بچوں کو معلم کے نمائندہ کی تحویل میں دیکر خانہ کعبہ طواف زیارت رطواف افاضہ کے لیے چلے گئے۔ واپسی پر معلم کے دفتر کی جانب آرہے تھے کہ بیگم صاحبہ نے ایک بوڑھی عورت کی جانب توجہ دلائی۔ وہ بار بار صرف اتنا کہہ رہی تھی۔

''ربا مینوں راہ لبھا دے'' (یاالٰہی مجھے میرا راستہ مل جائے)

میں نے بیگم سے کہا کہ تم نے لوگوں کو راستہ دکھانے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ چلو چلتے ہیں اس کو ساتھ لانے والے اسے خود ہی تلاش کر لیں گے۔ لیکن وہ نہ مانیں اور بڑھیا کے پاس جا کر رک گئیں۔ مجبوراً مجھے بھی واپس آنا پڑا۔ بڑھیا سے معلم کا نام پوچھا، اسے کچھ یاد نہ تھا۔ تم کون ہو؟ پاسپورٹ کہاں ہے؟ تم کب کس سے بچھڑی ہوئی ہو؟ وہ بولی۔

''فجری ویلے ڈوئے جی نماز پڑھن آئے ساں کہ لوکاں نکھیڑ چھڈ یا۔ اُس ویلے دی ڈھنڈیندی پئی آں''

(صبح ہم میاں بیوی نماز پڑھنے آئے کہ لوگوں کے ایک ریلے نے ہمیں جدا کر دیا۔ اس کو اب تک تلاش کر رہی ہوں)

اس سے سوکھے منہ بات نہیں ہو رہی تھی۔ مغرب ہونے کو تھی۔ بیگم صاحبہ نے اس سے دوبارہ دریافت کیا۔

'' معلم کا کیا نام ہے۔''

اُس نے اشارہ سے بتایا کہ معلوم نہیں۔ بیگم نے پھر پوچھا۔

'' صبح کا کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟''

''کھانا کی سی۔ لبھ گھدہ تے کھاوی گھنساں''

(کھانا کیا تھا۔ مل گیا تو کھالونگی)

اسے ہم نے ایک جانب بٹھایا۔ نزدیک کے ایک ہوٹل سے کھانا ایک گلاس میں پانی لے کر بوڑھی عورت کے پاس واپس آئے۔ اسے کھانا دیا جب وہ کھا چکی تو اسے واپس خانہ کعبہ لائے۔ اور صفا و مروا کے آخر میں سبز روشنی کے نیچے بٹھا دیا۔ تا کہ سعی کرنے والا ہر حاجی اس عورت کو ضرور دیکھ پائے، اور اسے کہا۔

''جب تک تمہارا کوئی تمہیں لینے نہ آئے یہاں سے اُٹھنا نہیں۔''

وہ بولی۔

''میں تساں دواں جیاں کی پچھان گھدا اے۔ تساں نوں اللہ پاک نے آسمانوں توں میڈں واسطے گلیا اے وت وی گھت آنا''

(میں نے آپ لوگوں کو پہچان لیا ہے۔ آپ دونوں کو اللہ تعالےٰ نے آسمان سے میری مدد کے لیے نیچے بھیجا ہے۔ میری خبر دوبارہ ضرور لینا۔)

ہم دونوں بیت اللہ، طواف وداع کے بعد صبح وہاں گئے۔ لیکن وہ عورت وہاں سے جا چکی تھی۔ واپسی کی سیٹ اسی دن کے لیے میرے پرانے شاگرد نے منظور کروا دی تھیں۔ لہذا حج کے پانچویں روز ہی پاکستان روانہ ہو گئے۔

فلاحی مملکت

پاکستان سے واپسی پر نومبر میں ٹکٹ براستہ کراچی۔ جنیوا۔ آمسٹرڈیم۔ پیرس۔ لندن۔ کانو بنوائے تھے۔ یکم دسمبر کو ہمارا جہاز صبح چار بجے جینوا پہنچا۔ امیگریشن والوں نے ایک دن کا ویزہ دے دیا۔ جہاز سے اتر کر ائیرپورٹ سے باہر نکلنے والے تھے کہ وہاں پر پسنجر سروس کاونٹر پر بیٹھی خاتون نے ہمیں دیکھ کر اشارہ سے اپنی جانب متوجہ کیا اور بُلایا۔

''کہ ذرا ایک منٹ کے لیے تشریف لائیں''۔

بچوں کو وہیں روکا اور میں اس کے پاس کاؤنٹر پر چلا گیا، میں نے سوال کیا۔

''فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

مجھے جواب دینے کی بجائے اس نے الٹا مجھ پر سوال کیا۔

''آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟''

''کراچی پاکستان سے کیوں کیا بات ہے۔''

میں سمجھا کہ پاکستانی ہونے کی وجہ شاید کوئی نئی پوچھ گچھ ہوگی، وہ بولی۔

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت باہر کا درجہ حرارت کیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں میں نہیں جانتا۔ لیکن کیا ہوا، مجھ 'پنٹا' ہوٹل جانا ہے، وہ سامنے ہی تو ہے۔ اور اس کی وین وہ

سامنے کھڑی ہے۔''

وہ بولی۔

''اس وقت باہر کا درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے چھ درجہ نیچے ہے اور تیز یخ ہوا چل رہی ہے۔ بہتر ہے کہ آپ ایئر پورٹ پر ہی رُک جائیں۔ اس لباس میں بچوں کا کھلی فضاء میں جانا ان کے لیے خطرناک بھی ہوسکتا۔ سورج طلوع ہو جانے کے بعد موسم میں بہتری آجائے گی اُس وقت ہوٹل چلے جانا۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم سب ایئر پورٹ پر ہی رُک گئے۔ ہم سب نے وقت گذارنے کے لیے وہیں سیر شُروع کردی۔ ڈیوٹی فری شاپس تقریباً تمام ہی کُھلی تھیں۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد دھوپ نکلنے پر 'پیپٹا' ہوٹل پہنچے سردی انتہا کی تھی ابھی تک درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے نیچے تھا۔

بچوں کو ہوٹل میں چُھوڑا اور عالمی عدالت انصاف دیکھنے کے لیے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ میرے ساتھ ایک لڑکا بیٹھا تھا۔ اگلے سٹاپ پر اس لڑکے نے اٹھ کر ایک عورت کو جگہ دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ عورت بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اس کی جگہ ایک بوڑھی عورت بیٹھ گئی۔ صرف میں اور میری بیگم ہی اپنی سیٹ پر جمے بیٹھے رہے۔ باقی تمام لوگ اپنے سے زیادہ عمر رسیدہ مرد و زن کے لیے اپنی سیٹ خالی کر رہے تھے۔ ایک سٹاپ پر انسپکٹر نے ٹکٹ کا مطالبہ کیا میں نے اُسے دس ڈالر کا ایک نوٹ پیش کیا اور ٹکٹ مانگے انسپکٹر سمجھ گیا کہ میں سوئیز لینڈ کے سفری قواعد سے ناواقف ہوں۔ اس نے اگلے ہی سٹیشن پر سڑک پر ایک میٹر کی جانب اشارہ سے بتایا۔ کہ اتر کر ٹکٹ خرید لیں۔ ہم دونوں ٹکٹ لینے کے لیے اتر گئے۔ دیکھا تو وہاں پر ایک بکس نما میٹر نصب تھا۔ جس میں سکہ ڈالنے پر ٹکٹ باہر آجاتا۔ میرے پاس سویٹزرلینڈ کی کرنسی کا کوئی سکہ نہ تھا۔ وہیں پر کھڑے ایک مسافر سے ٹکٹ لینے میں مدد کی درخواست کی اور ڈالر اس کی جانب بڑھایا۔ اس نے مجھ سے منزل کا دریافت کیا اور بتایا کہ وہ تو نزدیک ہے۔ چند سینٹ چاہیں جو میرے پاس نہیں تھے۔ اس نے اپنی جیب سے چند سکے نکالے اور مجھے دو ٹکٹ خرید دیے اور ٹکٹوں کے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جنیوا کا نقشہ کھول کر ایک سِیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی شہر کے اندر سے آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ سڑک پر بہت سے سٹال لگے تھے۔ مختلف سٹالوں پر فر کے سستے کوٹ فروخت ہو رہے تھے۔ ایک جگہ استعمال شدہ صوفے اور کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک گھر کے باہر ایک پرانی چمڑہ کی بنی قیمتی کرسی

کوڑے کے ڈبہ کے پاس رکھی تھی۔ شہر کی عمارات ایک ہی نقشہ اور ترتیب سے بنی دکھائی دیں۔ ان پر پینٹ بھی بڑی مہارت سے کیا گیا تھا۔ تمام بلڈنگوں کے برآمدے ایک ہی رنگ میں رنگے تھے۔ دریافت کرنے پر ایک مسافر نے بتایا کہ جنیوا میں سالانہ مرمت اور رنگ میونسل کمیٹی کرواتی ہے۔

ایک سٹاپ پر ہم دونوں اُتر گئے۔ نیچے اُتر کر دیکھا کہ وہی صاحب جنہوں نے ٹکٹ لینے میں ہماری مدد کی تھی وہ بھی اسی گاڑی سے اُترے۔ حیران ہوئے کہ آپ تو عالمی عدالت انصاف کی جانب جا رہے تھے یہاں تو شہر میں آگئے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ غلطی سے میں اس گاڑی میں سوار ہو گیا تھا۔ اس نے میرا پرانا ٹکٹ دیکھا گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا ابھی آپ اس ٹکٹ پر مزید آدھ گھنٹہ سفر کر سکتے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ سوئیز لینڈ میں پبلک گاڑی میں سفر وقت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ فی الحال آپ کو دوسرا ٹکٹ خریدنے کی ضُرورت نہیں بہتر ہے کہ آپ واپس اسی ٹکٹ سے سفر کریں۔ آگے بڑھنے کی بجائے ہم واپس ہوٹل میں آگئے۔

میں نے بچوں کو بتایا کہ باہر قلفی جما دینے والی سردی ہے۔ اس کے باوجود بچے جنیوا شہر دیکھنے کی ضد کر رہے تھے۔ اور میری بات پر یقین نہ کر رہے تھے۔ انہیں قائل کرنے کے لیئے میں نے انہیں کہا کہ کمرہ کے باہر رکھے پھولوں کے گملے کو ہاتھ لگا کر واپس آجاؤ پھر مجھ سے بات کرنا۔ بچے باہر برآمدہ میں نکلے۔ بچیاں تو صحن کا دروازہ کھول کر ہُوا کا پہلا یخ جھونکا کھانے کے بعد ہی واپس لوٹ آئیں۔ البتہ یاسین بہادر بنا باہر نکلا اور دروازے کے باہر دس فٹ کے فاصلے پر رکھے گملے تک چل کے گیا اور آرام سے اُسے چھوا اور واپس آگیا۔ کہنے لگا کہ بارش تو بہت زور کی ہے، لیکن نظر نہیں آرہی کپڑے بھی خشک ہیں، البتہ ٹھنڈ بہت زیادہ ہے۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔ میں نے ہوٹل سے گرم گرم کافی لیکر سب بچوں کو پینے کو دی اور خود بیگم کے ساتھ پھر باہر نکل آیا۔ میں نے سویٹر کے اوپر ایک اور سویٹر پہن لی اور پھر اس کے اوپر کوٹ پہن لیا۔ بیگم صاحبہ کے پاس اپنا اور کوٹ تھا، وہ مزے سے گھوم پھر رہی تھیں۔ میرے لیے سردی ناقابل برداشت تھی۔ مجبوراً میں نے بازار سے ایک نیا اور کوٹ خرید لیا۔ واپسی پر بچوں کے لیئے بھنے مرغ کے آٹھ ٹکڑے چار روٹیاں اور کوک کے چار ٹن خریدے اور ہوٹل آگئے۔

یو پا کی گٹ اوے

اب ہمارا اگلا سٹاپ آمسٹرڈیم تھا۔ ایک روز کے آرام کے بعد دوسرے روز پیرس چلے گئے۔ ہمارا جہاز دن کے دس بجے ڈیگال ائیر پورٹ پر اُترا اور ائیر پورٹ کے امیگریشن آفس کے سامنے بچوں کو لیئے لائن میں کھڑا ہو گیا۔ باری آنے پر اپنے پاسپورٹ ویزہ کے لیئے پیش کیئے۔ امیگریشن آفیسر نے میرا پاسپورٹ کھولا اور پاکستان کا لفظ بڑی اُونچی آواز میں حیرانگی سے پڑھا اور پاسپورٹ میں فرانس کا ویزا نہ پا کرے پاسپورٹ کو اچھال دیا۔ میں نے پاسپورٹ کو زمین پر گرنے سے پیشتر ہی کرکٹ بال کی طرح کیچ کر لیا۔ میں سمجھا کہ شاید پاسپورٹ اس نے اپنے سامنے رکھا اور جگہ کی تنگی یا کسی اور وجہ سے نیچے گر گیا ہے دوسرا پاسپورٹ ابھی اس کے پاس تھا۔ اپنا پاسپورٹ واپس اُس کی جانب بڑھایا، امیگریشن افسر نے پاسپورٹ وصول کرنے کی بجائے دوسرا پاسپورٹ بھی میرے ہاتھ میں پکڑا کر امیگریشن آفس کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ امیگریشن آفس ساتھ ہی تھا، میں وہیں چلا گیا۔ وہاں پانچ چھ آدمی بیٹھے تھے، ایک موٹا تین سو پاونڈ وزنی آدمی آرام کرسی پر سر پیچھے کی جانب لڑھکائے آنکھیں بند کیئے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ دفتر میں بیٹھے ملازمین نے اس کی جانب جانے کا اشارہ کیا میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا۔

''کیا بات ہے''۔

میں نے اسے بتایا۔

''مجھے یو این کے دفتر برائے معذور افراد نے انٹرویو کے لیئے بلایا ہے۔ یہ ان کا لیٹر ہے دو روز کا ویزہ چاہیے۔''

اس نے پاسپورٹ کو کھول کر دیکھا۔

''نو ویزہ، گوٹو گیٹ سکیس۔''

میں سمجھا وہاں کوئی دفتر ہو گا وہیں چلا گیا۔ وہاں پر کے ایل ایم کے کے دفتر علاوہ کوئی اور دفتر نہ تھا۔ واپس آ گیا تھوڑا سا ائیر پورٹ کی دکانوں پر گھوما پھرا، ہر جانب سینٹ کی دکانیں ہی تھیں۔ اور واپس اُسی دفتر میں اُسی موٹے آدمی کے پاس آ گیا وہ اُسی طرح آنکھیں بند کیئے سر کرسی سے پیچھے لٹکائے آرام کر رہا تھا، مجھے کھڑا دیکھ کر بولا۔

''گو دیئر''

میں نے کہا۔

''میں وہاں گیا ہوں، وہاں پر کوئی دفتر نہیں ہے۔ مجھے یہاں صرف دو دن رُکنا ہے یونائیٹڈ نیشن کے دفتر برائے معذور افراد نے بلایا ہے۔''

اسے یو این کا خط کھول کر دکھایا کہ مجھے وہاں ان کے پاس کل جانا ہے۔ کانو سے فلائیٹ سیدھی نہیں آتی۔ آپ دیکھ لیں میں لندن کے بجائے ٹکٹ کوری روٹ کروا کر براستہ آمسٹرڈیم آیا ہوں۔ آج پیرس کی سیر کروں گا اور کل دفتر میں انٹرویو دیکر واپس اپنے ملک چلا جاؤں گا۔ آپ تسلی سے رہیں میں یونیورسٹی کا ایک پروفیسر ہوں۔ یہ میرا تین سال کا کنٹریکٹ حکومتِ نائیجیریا کے ساتھ موجود ہے۔ جس میں سالانہ مجھے پچاس ہزار ڈالر تنخواہ ملتی ہے۔ میں ایک یونیورسٹی پروفیسر ہوں کوئی اَن پڑھ مکینک یا مزدور نہیں کہ یہاں گُم ہونے کی کوشش کروں گا۔ آپ میرے پاسپورٹ پر دیگر یورپی ممالک میں داخلہ اور اخراج کی مہریں لگی دیکھ لیں میں صرف ایک سیاح ہوں۔ بچوں کو سیر کے لیے آپ کے ملک میں لایا ہوں۔ اِس کے ساتھ ہی میں نے ایک بڑا بنڈل ٹریولر چیکس کا اُس کو دکھایا۔

''یہ دیکھیں میرے پاس اِتنے ڈالر بھی موجود ہیں۔ کسی ہوٹل میں قیام کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔''

مگر اُس نے میری بات سننے کی زحمت گوارہ نہ کی اور بولا۔

''گو بیک ٹو گیٹ سکیس''۔

بہت پریشان ہُوا کہ یہ شخص کیوں بات نہیں سمجھ رہا، میں نے اسے پھر مخاطب کیا۔

''اچھا آپ میرے پاسپورٹ یہاں رکھ لیں اور ایک سپاہی کو میرے ہمراہ کر دیں میں ایک ٹیکسی ائیر پورٹ سے لوں گا اور اُسی ٹیکسی سے پُورے شہر میں گھوم پھر کر شاپنگ بھی کروں گا اور سیر کرنے کے بعد اُسی ٹیکسی سے واپس ائیر پورٹ آ جاؤں گا۔''

پہلے تو وہ مجھ سے انگریزی زبان میں گفتگو کر رہا تھا۔ پھر وہی شخص فرانسیسی زبان میں بولا جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ میں نے بھی جواباً چانکیہ سے مدد لیتے ہوئے اُونچی آواز میں پنجابی میں دلیل دی بھائی کوئی بُری بات نہیں ہے میں

ایک سیاح ہوں دیکھیں پاسپورٹ پر لندن ہالینڈ اور اٹلی کے ویزے لگے ہیں میں وہاں نہیں رکا تو یہاں کیوں رکونگا۔ پاس کھڑے ایک سپاہی نے پاسپورٹ لے کر اُس کی جانب بڑھایا۔ اُس نے پاسپورٹ پکڑ کر زور سے میری جانب پھینکا اور بولا۔

''یو پا کی گٹ اوے۔''

میں نے جواباً پھر اسے مخاطب کیا۔

''کہ یہ پاسپورٹ میری شناخت ہے، صدر پاکستان نے آپ کے صدر کو اس کی وساطت سے ملک میں داخلے کی درخواست کی ہے۔ یہ ایک متبرک دستاویز ہے جس کا احترام آپ پر لازم ہے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے آپ کہہ لیں لیکن میرے ملک کے صدر کی چٹھی کا احترام آپ پر لازم ہے۔''

وہ بات سُنتے ہی بھِر گیا۔ پانچ چھ سپاہیوں کو آواز دے کر بلایا ایک آدمی کو اشارہ کیا اور کچھ کہا۔ اُس نے دُور جا کر دو فارم نکالے اور اُن پر کچھ لکھنا شُروع کر دیا۔ مہر لگائی اور اُس کے پاس دستخط کے لیے لے آیا۔ میں خطرہ کو بھانپ چکا تھا، ایتھنز میں تو معاملہ ٹھیک ہو گیا تھا۔ یہاں پر معاملہ بالکل ہی بگڑ گیا۔ چانکیہ نے سچ ہی کہا تھا کہ یا تو معاملہ ٹھیک ہو جائے گا یا بالکل ہی بگڑ جائے گا۔

دوبارہ انگریزی میں بات کی، بھائی کچھ خیال کرو میں ایک یونیورسٹی کا پروفیسر ہوں اتنے میں وہ گرجدار آواز میں کچھ بولا دو سپاہی میرے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گے، تیسرے نے ٹیلیفون پر کسی دفتر میں فون کیا اور تھوڑی سی بحث کے بعد فون بند کر دیا۔ مجھے سپاہیوں نے کہا چلو میں خاموشی سے اُن کے ساتھ ہو گیا، میں نے پھر کہا۔

''مجھے اپنا سامان تو لینے دو''

لیکن اُنہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔

''تیز چلو۔''

مجبوراً بچوں کو بھی کہا کہ چلو تیز چلو اور ہم دومنٹ میں کے ایل ایم کے آفس میں دوبارہ پہنچ گئے وہاں افسر موجود تھا۔ اُس نے ٹیلیفون پر امیگریشن والوں سے بحث کی۔

''دیکھیں اس کے پاس واپسی کنفرم سیٹیں ہیں یہ ویزا لینے کا حق دار ہے۔ کافی دیر بحث مباحثہ کے بعد اُس نے امیگریشن والوں کو بتایا کہ اِس جہاز میں تو چار سیٹیں خالی ہیں میں چھ آدمیوں کو کیسے

لے جاؤں البتہ شام کو چار بجے کے جہاز سے واپس لے جا سکتا ہوں۔ کافی بحث کرتا رہا انجام کار اُس نے اُسی کاغذ پر دستخط کیے اور وہ سپاہی واپس چلا گیا۔ کے ایل ایم کے آفیسر نے مُجھے کہا۔

''آپ یہاں پر ہی رُکے رہیں باہر ائیر پورٹ پر نہ جانا وگرنہ آپ کو وہ گرفتار کر لیں گے۔ مجبوری ہے، بلاوجہ ضد کر رہے ہیں۔''

میں نے اُس سے سامان کے متعلق دریافت کیا، وہ بولا۔

''گھبرائیں نہیں میں اسی جہاز سے اُس سامان کو بھی لوڈ کروا دوں گا۔''

آمسٹرڈیم پہنچنے پر جہاز سے اُتر کر امیگریشن والوں کے دفتر گیا، امیگریشن آفیسر مُجھے پہچانتا تھا۔ پچھلے چار سال سے انہی دنوں ٹرانزٹ ویزہ لینے مستقل آ رہا تھا۔ اتفاق سے آتے یا واپسی پر ضرور ملاقات ہو جاتی۔ وہ ایک موٹا اونچے لمبے قد کا فراخدل اور ہنس مکھ شخص تھا۔ اُس نے مجھے اپنا نام بھی لکھ کر بتایا تھا، جس کا تلفظ کافی مشکل تھا، وہ کہنے لگا۔

''آپ بخوشی یہاں رہیں جتنے دن کا آپ ویزہ چاہیں میں دے دوں گا۔ آپ کے لیے ہوٹل میں کمرے اُس دِن تک کے لیے بُک کر دیتا ہوں جس دِن آپ کو واپس اپنے ملک جانا ہے''۔

میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا بلکہ مُسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تو ایک سیاح ہوں، ہر سال بچوں کو ایک نئی تہذیب سے روشناس کرواتا ہوں۔ فرانس والوں نے مجھے ڈالر خرچ کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا، البتہ اپنی تہذیب سے متعارف کر دیا ہے۔''

وہ مسکرا دیا۔

''اٹلی یونان انگلیند اور آپ کے ملک کی لوگوں سے تو اب کافی واقفیت ہو چکی ہے۔ آیندہ یہاں سے نیپال یا جاپان کے لیئے کسی فلائیٹ پر جایا کرونگا۔ آمسٹرڈام تو ایک جنکشن ہے جہاں سے ہر ملک کے لیئے جہاز جاتے ہیں۔ مجھے تو کہیں سیٹل نہیں ہونا واپس اپنے ملک ہی جانا ہے۔ آئندہ یورپ کی سیر کی بجائے گرمیوں کی تعطیلات میں مشرقِ بعید، کھٹمنڈو یا چین کی سیر کو جاؤں گا۔''

وہ مسکرا دیا اور بولا۔

''پروفیسر آپ کا جب جی چاہے تشریف لائیں ہم آپ کو خوش آمدید کہیں گے۔''

مجھے دو روز رکنے کے لیے شہر کے وسط میں قائم 'سونستا' ہوٹل کا ووچر بنا دیا۔ یہ شہر کے وسط میں واقع سنٹرل سٹیشن کے نزدیک تھا۔ بچوں کو کمرے میں ٹھہرانے کے بعد ہوٹل کے اندرونی

دروازے سے بیگم صاحبہ کو لیے شہر جانے کے لیے نکلا۔ ہوٹل کا یہ اندرونی دروازہ ایک بازار میں کُھلتا تھا، بازار میں گئے تو ہر جانب لباس سے محروم بُت دکانوں میں سجے تھے۔ لوگ ہم دونوں کو وہاں گھومتے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک دکان کی جانب دیکھا تحریر تھا، پورنو مارکیٹ فوراً ہی ہم دونوں واپس مڑے اور ہوٹل آ گئے۔ ہوٹل کا مین دروازہ دوسری سمت ایک دوسرے بازار میں کھلتا تھا، ہم دونوں پیدل چل دیئے۔ جگہ جگہ پر سائیکلیں کھڑی دیکھیں، ایک بڑی لمبی سائیکل بھی موجود تھی، جس پر چار گدیاں اور چار پیڈل لگے تھے یہ فیملی سائیکل تھی جس پر پوری فیملی بیٹھ کر آمسٹرڈیم شہر گھوم پھر سکتی تھی۔ میں نے پاس کھڑے ایک صاحب سے اُس کا کرایہ دریافت کیا۔ وہ بولا۔

’’یہ میونسپل سائیکل ہے آپ اِسے لے جا کر شہر میں کہیں چھوڑ دینا آپ سے کوئی کرایہ نہیں لیا جائیگا۔ یہ سیاحوں کی سہولت کے لیے ہی رکھے ہیں یہاں کی آبادی سائیکل استعمال نہیں کرتی۔‘‘

میرے علاوہ فیملی کے کسی ممبر کو سائیکل چلانے کا ہنر نہ آتا تھا۔ لہٰذا نہ تو ہم سنگل سائیکل استعمال کر سکتے اور نہ ہی فیملی سائیکل۔ پاس ہی ہالینڈ کا سنٹرل سٹیشن تھا۔ وہاں پیاری اور میٹھی دُھنوں میں ایک گروپ دُھنیں بجا کر کسی گرجا گھر کی تعمیر کے لیے چندہ اکٹھا کر رہا تھا۔ ہوٹل کے نزدیک ہی ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ہم نے ایک ٹیکسی لی، اُسے ایک دکان کی رسید دکھائی کہ ہم نے اِس دکان سے کچھ چیزیں خریدی تھیں اس دکان پر چلو۔ ڈرائیور نے اس شخص کا نام پڑھا وہ اس کا ہمسایہ تھا۔ ہمیں سیدھا اُس کے گھر لے گیا۔ اُس نے دور سے مکان کا نمبر دکھایا اور دروازے کی گھنٹی کی جانب اشارہ بھی کیا۔ ٹیکسی والا کرایہ لے کر چلا گیا۔ گاڑی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ وہ رہائشی علاقہ تھا۔ اور ٹیکسی ڈرائیور ہمیں دکان دار کے گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ جب کہ ہم نے اسے دکان پر چلنے کا کہا تھا، خیال آیا کہ ٹیکسی تو پندرہ بیس منٹ ہی چلی ہے چلو واپس ہوٹل میں پیدل ہی چلتے ہیں۔ اسی بہانہ آمسٹرڈیم کی سیر بھی ہو جائے گی۔ ہم دونوں واپس پیدل چل پڑے۔ چلتے چلتے تھک گئے راستے میں ایک خود کار الیکٹرک سٹال لگا دیکھا چھوٹے چھوٹے شیشے کے بہت سے خانے بنے تھے ایک مخصوص جگہ پر سکہ ڈالنے کے بعد جس چیز پر ہاتھ رکھیں اس ڈبہ کا دروازہ کُھل جاتا اور اندر سے وہ چیز نکال سکتے۔ ہم دونوں نے دو مُرغ کے سینے اور دو کوک کی ٹِن لیے اور کھاتے ہوئے واپسی کا سفر دوبارہ شروع کیا۔ اتنے میں ایک لوکل ٹرین آتی دکھائی دی اس پر سوار

ہو کر آدھ گھنٹہ میں واپس سنٹرل سٹیشن آ گئے۔

آمسٹرڈیم سے دو بجے کی فلائٹ سے لندن اور، لندن ائیر پورٹ سے کانو اور کانو پہنچ کر چوہدری حنیف صاحب کے گھر کی ٹیکسی لی اور ایک رات چوہدری حنیف صاحب کی میزبانی کا لُطف اُٹھایا اور دوسرے روز ٹیکسی لے کر دوپہر سے پیشتر مینا شہر میں تھے۔

شہر خاموشاں

بیرون ملک مشہور ہے کے دنیا میں دو ممالک ہنڈوستان اور قبرص کے باشندے اپنے اپنے ملک میں ہوں تو ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں لیکن بیرون ملک تاریخی اور کلچرل یگانگت کی بناء پر سگے بھائیوں کی طرح پُر خلوص زندگی گزارتے ہیں۔ میں قاہرہ امیگریشن کی لائن میں کھڑا تھا کہ ایک ہندوستانی جو مجھ سے پہلے ہی اسی لائن میں کھڑا تھا۔ اور وہ کسی اور جہاز سے قاہرہ آیا تھا۔ مجھے مخاطب کر کے یاد دہانی کے طور پر کہا۔

’’قاہرہ میں ڈالر کے دو ایکسچینج ریٹ ہیں ایک سیاح کے لیے دوسرے عام مصری کے لیے اور دونوں میں تقریباً پچاس فیصد کا فرق ہے۔ احتیاط کرنا کسی کو ناجائز فایدہ نہ اُٹھانے دینا۔‘‘

اس کا تعلق ہندوستان کے صوبہ اُتر پردیش سے تھا۔ اس ہندوستانی نے مجھے بہت سے ڈالروں سے محروم ہونے سے بچا لیا۔ ائیر پورٹ سے باہر نکلا تو مصر کے سات آٹھ بنکوں کے کیبن کھلے تھے ہر کیبن کے اندر سے کلرک لپک لپک کر آواز لگا رہے تھے۔

’’ڈالر ایکسچینج ڈالر ایکسچینج‘‘

میں نے ایک کلرک سے ایکسچینج ریٹ پوچھا۔ ایک نے وہ ریٹ بتا جو غیر ملکی سیاح اور لوگوں کا تھا دوسرے نے اس سے کچھ زیادہ بتایا۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ میرے ہمراہ PIA کا ملازم بھی تھا۔ جو راہبر کا کام کر رہا تھا۔ اُس نے مجھے ایک جگہ کھڑا کیا اور بتایا کہ آپ یہاں ہی رکیں ابھی بس آ جائے گی۔ اُس نے اشارہ سے بتایا کہ پانچ سوگز کے فاصلہ پر ہوٹل ’کنکارڈ‘ ہے اس میں آپ کے قیام کے لیئے کمرے بک ہیں۔

سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اِس کو دیکھ کر دل بہت خوش ہُوا۔ زندگی میں پہلی بار سورج کو اتنی صاف فضا میں اُبھرتے دیکھا۔ سورج کے گرد روائتی دھواں یا گرد وغبار نہ تھا۔ ایئر پورٹ کے دور

نزدیک کوئی پلازہ اونچی بلڈنگ درخت نظارہ کو دھندلانے کے لیے موجود نہ تھے۔ہوٹل پہنچ کر کاؤنٹر پر کاغذات جمع کروائے اور بچّوں کو کمرے میں آرام کے لیے بھیج دیا۔خود کاؤنٹر پر ریسپشنسٹ لڑکی سے بات کی۔کہ میں عربی زبان نہیں جانتا،لہٰذا وہ اَیک ایسی ٹیکسی کا بندوبست کر دے جس کا ڈرائیور تھوڑی بہت انگریزی بھی جانتا ہو۔

ہوٹل کی ملازمہ بڑی کوآپریٹو تھی،اُس نے فوراً ہی اَیک کاغذ پر ایک مثلث بنا کر دی،جس پر نئے اور پرانے قاہرہ بمع 'لکسر' شہر (Luxor) اور 'گزہ' (Giza) سے واپسی تک کا نقشہ بنا دیا۔ ساتھ ہی اُس نے نصیحت کی کہ لکسر شہر میں ہر چیز دگنی قیمت پر ملے گی۔بہتر ہے کہ آپ کھانے کی اشیاء قاہرہ کے مین بازار ہی سے ہی خریدیں۔اُس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی ایک 'سناگاگ' (synagogue) یہودی عبادت گاہ پر بھی نشان لگا دیا۔ان بازاروں کا نام بھی تحریر کر دیا جہاں سے یادگار اشیاء بھی خریدی جا سکتی تھیں۔لڑکی نے بتایا کہ قاہرہ میں صرف وہ ڈرائیور سیاحوں کو باہر تاریخی مقامات پر لے جانے کے مجاز ہیں جو مصر کی تاریخ سے آگاہی بھی رکھتے ہوں۔اُس نے مزید بتایا کہ خان خلیلی نامی بازار سے اشیاء سستی مل جاتی ہیں لیکن بھاؤ تاؤ ہر جگہ کریں۔ابتدا میں سو ڈالر مانگتے ہیں اور تیس ڈالر کے عوض فروخت کر دیتے ہیں۔لڑکی نے چند عربی کے الفاظ بھی رومن انگریزی میں بمع معانی تحریر کر دیئے۔کہ آپکا مقصد حل ہو جائیگا۔خان خلیلی بازار میں ایک دکاندار سودا پیک کروانے کے بعد پیسے لیتے وقت مصری پاونڈ کی بجائے برٹش پاونڈ مانگ رہا تھا۔میں نے سودا وہیں چھوڑ دیا اور دوسری دکان پر چلا گیا۔

وہ عربی میں کچھ بڑبڑاتا میرے پیچھے دوسری دکان میں آیا۔میں نے کاغذ نکالا اور پڑھا اور اسے کہا مالش۔اس کے معنی جو مجھے بتائے گئے،وہ تھے ''بھائی معاف کر دو غلطی ہوگئی''۔وہ ہنس پڑا اور واپس اپنی دکان میں چلا گیا۔لڑکی نے مزید بتایا کہ ہر دکان کے باہر کھڑا 'بواب' (چوکیدار) آپ سے بخشش کا طلب گار ہوگا اسے پچاس سینٹ سے زیادہ کبھی نہیں دینے۔ٹیکسی بلاوجہ کہیں کھڑی نہیں کرنی۔ہر ہوٹل اور چوک میں 'بواب' آپ کی درست راہ نمائی کرے گا۔وہ قابل اعتماد لوگ ہوتے ہیں البتہ مسجدِ زینب اور مسجدِ حسینی میں عطر چھڑکنے والوں سے بچ کے رہیں وہ عطر لگانے کے بعد دس ڈالر سے کم بخشش نہیں لے گا۔اُس نے ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں کھڑی ٹیکسی والے کو بلوا کر اس سے باقاعدہ بارگیننگ کی۔گو میں عربی تو نہیں جانتا تھا۔لیکن لڑکی کی باڈی لینگویج

بتا رہی تھی کہ اُس نے ڈرائیور کو جھاڑ پلائی ہے۔اس نے دوسرے کو بُلایا مفصل گفتگو کے بعد لڑکی نے مجھے کہا آپ اس کے ساتھ چلے جائیں تمام تاریخی مقامات پر لے جائے گا۔ساتھ ہی کہنے لگی کہ سیاحوں کو لوٹنے کا رَواج عام ہے، لہٰذا چیک پوسٹ پر اس ڈرائیور کا نام گاڑی کا نمبر،اپنا اور بچّوں کے نام ضرور لکھوانا۔

ٹیکسی ڈرائیوروں نے آپس میں کچھ کہا مجھے ان کی گفتگو پر شک ہوا۔واپس پلٹ کر ریسپشن کاؤنٹر پر آ کر خاتون سے کہا کہ آپ اُنہیں کہہ دیں کہ میں آج آرام کرنا چاہتا ہوں کل جاؤنگا۔میں کمرے میں جانے کے بجائے لابی میں بیٹھ گیا اور CNN کا پروگرام دیکھنے لگا۔تھوڑی دیر بعد ریسپشنسٹ میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

''میں آپ کے فیصلے کو سراہتی ہوں آپ نے اچھا فیصلہ کیا۔آپ اگر چاہیں تو میں کسی اور ٹیکسی والے کو بلا لیتی ہوں۔آپ جائیں سیر کر آئیں،میوزیم بند ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔

''کسی شریف ڈرائیور کا بندابست کر دیں''۔

بچے تو پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔لڑکی نے پُورے دن کے لیے ٹیکسی والے سے معقول کرایہ طے کر دیا۔اور ہم سیر کو نکل گئے۔قاہرہ شہر جاتے ہوئے، میں نے نوٹ کیا کہ ٹیکسی کسی پرانے شہر سے گزر رہی ہے۔یہ ویران اور غیر آباد شہر تھا۔گلیاں مکان چھت سب قائم یہاں تک کے کھڑکیوں میں لگی حفاظتی سلاخیں بھی موجود تھی لیکن کوئی رہنے والا نہ تھا۔البتہ گھروں کے اندر مٹی کے ڈھیر نظر آئے۔میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''یہ پرانا قاہرہ ہے یا؟''

وہ بولا''قبور یا شیخ۔'' پھر اشاروں میں سمجھایا کہ یہاں سے لوگ نقل مکانی کر کے نئے شہر آباد ہو گئے ہیں۔لوگ اپنے پرانے گھروں میں قبریں بنانا شُروع ہو گئے۔اہرام بھی تو گھر تھے۔ایک جگہ میں نے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔دیکھا کچن میں قبریں برآمدے میں قبریں،گھر کے اندر صحن میں قبریں یہاں تک کہ گھر کے مرکزی دروازہ کے باہر گلی میں بھی قبریں موجُود تھیں۔گھروں کے باہر مالک مکان کے نام کی تختی لگی تھی۔مکانات ہر سائز کے تھے۔اَکثر دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔جس مکان میں بیٹھک نہ تھی وہاں پر ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا یا ٹوٹا ہُوا نظر آیا۔وہاں بھی قبریں

موجود تھیں۔

بائیں جانب ترکی کی نیلی مسجد کی طرز پر اَیک ویران مسجد نظر آئی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ مسجد پرانے قاہرہ کی مسجد ہے جو ترکی کی نیلی مسجد کی طرز پر قاہرہ کے ایک ترک گورنر نے بنوائی تھی۔شہر کے منتقل ہو جانے کی بنا یہ مسجد نمازیوں سے محروم ہو گئی ہے۔اَب اِسے بھی آثارِ قدیمہ کا درجہ دے دیا گیا ہے۔سِیاحوں سے داخل ہونے کا ٹکٹ لیا جاتا ہے۔ڈرائیور نے اشارہ سے کہا کہ آگے بڑھیں میوزیم بند ہو جائے گا۔راستہ میں بڑے پل سے گزرے جس کے دونوں جانِب اُونچی دیوار بنی تھی ڈرائیور نے بتایا کہ یہ پل سات میل لمبا ہے۔یہ پل قاہرہ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔پُل کے اُوپر سے پرانے شہر پر نگاہ دوڑائی حیران ہُوا کہ گھروں کی چھتوں پر کوڑہ کرکٹ کا ڈھیر لگا تھا۔اور ہر گھر پر کوّے اور دیگر پرندے اپنی خوراک تلاش کر رہے تھے۔

ڈرائیور نے دور اونچے میناروں کیجانب اشارہ کیا اور بتایا کہ یہ حسینی مسجد (Sayyidna Al-Hussein Mosque) ہے۔یہاں امام حسین کا سر مبارک دفن ہے۔اسی نسبت سے اسے حسینی مسجد کہتے ہیں۔اس نے اشارے اور کچھ انگریزی میں بتایا کہ امام حسین کی ہمشیرہ بی بی زینب اسے یہاں لائی تھیں۔یہ مسجد خان الخلیلی بازار کے نزدیک واقع ہے اور اسلامی دُنیا کیلئے یہ قاہرہ میں انتہائی محترم مقام ہے۔

فراعِنہ کے دیس میں

میوزیم کے مین گیٹ کے ساتھ ہی ہدایات کا اَیک بڑا بورڈ نصب تھا۔عربی اور انگریزی کے علاوہ دو اور زبانوں میں بہت سی ہدایات تحریر تھیں انگریزی میں تحریر تھا۔کہ ٹکٹ یہاں سے ملیں گے بیرونی سِیاحوں کے لیے فی کس ریٹ یہ ہے اور مصر کے باشندوں کے لیے یہ ریٹ ہے۔دونوں میں پچاس فیصد کا فَرق تھا۔نیز تحریر تھا کہ ٹکٹ میں گائیڈ کی اُجرت بھی شامل ہے۔ٹکٹ خریدنے والوں کی قطار کافی لمبی تھی۔میں نے ڈرائیور کو بھیج کر چھ غیر ملکیوں کے ٹکٹ منگوائے میوزیم میں داخلہ سے قبل گیٹ پر اَیک شخص نے مجھ سے کیمرہ مانگا اور ہدایات کی جانِب اشارہ کیا جس پر درج تھا۔''کیمرہ اندر لے جانا منع ہے'' اُس نے کیمرہ لیکر ٹوکن دے دیا،انگلش

میں کہا آپ واپسی پر ٹوکن دے کر کیمرہ لے جائیں۔مجبوراً مُجھے کیمرے کے بغیر اندر جانا پڑا۔

پہلا کمرہ میں گائیڈ کھڑا تھا۔وہ میرے ہمراہ ہو گیا۔اس نے بتایا یہ سب حنوط شدہ لوگ اشرافیہ میں سے تھے۔لاشیں تین فٹ چوڑے تین فٹ اونچے کاونٹروں پر رکھیں تھیں۔ایسے دو کاونٹر ایک دوسرے کے اوپر بنے تھے۔ممیاں (Mummies) پٹیوں میں لپٹی ہوئیں تھیں۔ایک گنجی ممی کے سر پر دو تین بال واضح تھے،جو پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے اس کی آنکھیں کھلیں تھیں۔آنکھوں کی چمک اتنی روشن تھی کہ دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے لرزہ طاری ہوا۔پلکیں اور بھنویں سیاہ،چہرے کے تمام خدوخال گہرے اور واضح تھے۔

ان فَراعِنہ (pharaohs) کا ایمان تھا۔کہ جسم تو فنا ہونے والی شے ہے،قیامت کے روز 'جی' (روح) اپنے جسم کو تلاش کرتی آئے گی،تو اس کتبہ پر کندہ تصویر کی مدد سے وہ اپنے جسم کو تلاش کر لے گی اور یہ شخص پھر زندہ ہو جائے گا۔تھوتھ نامی ایک فرشتہ اس کے منہ کو انگلی سے چُھوئے گا۔جس سے یہ تمام پٹیاں خود بخود کُھل جائینگی اور اس مردہ شخص کو قوتِ گویائی مل جائیگی۔ وہ مردہ شخص اس فَرشتہ سے اپنی یاداشت کی واپسی کا مطالبہ کرے گا۔فرشتہ یاداشت واپس دینے سے پیشتر اس شخص کے دل کو ترازو کے اَیک پلڑے میں اور دوسرے پلڑے میں جنت کے پرندے 'معات' کے 'پر' کو تول کر دیکھے گا۔اگر دل کا وزن اُس کے برابر یا زیادہ ہوا۔تو وہ اُس کو یاداشت واپس کر دیگا اور اُسے ایسی آرام دہ کشتی میں سوار کر دیگا جو ہمیشہ کیلئے سمندر میں تیر رہی ہوگی۔لاکھوں نیک انسان اُس کشتی میں پہلے سے موجُود ہوں گے۔اگر دل کا وزن کم ہوا تو اُس کے ساتھ کھڑا " تھوتھ فَرشتہ " اُس کو نگل کر ہمیشہ کے لیے فنا کر دیگا۔

گائیڈ سے میں نے دریافت کیا کہ حنوط کرنے کا کیا طریقہ تھا۔اُس نے بتایا کہ پہلے دل کو لاش کے ساتھ ہی حنوط کرتے جسم کے دیگر اعضاء اور دماغ کو غیر ضروری اور بیکار مادہ سمجھ کر ضائع کر دیتے۔اِس کے بعد وہ درخت کی چھال کو جسم میں بھر کر پندرہ سولہ روز تک لاش کو دھوپ میں سکھاتے اس دوران لاش اگر سخت ہو جاتی تو اُس کو کاٹ کر سیدھا کرتے۔اگر لاش خشک ہو جاتی تو تیل کی مالش کر کے اصلی حالت میں لانے کی کوشش کرتے۔میں نے اس سے دریافت کیا۔

'' طوطخ آمون (Tutankhamun) کی ممی کون سی ہے؟''

اُس نے بتایا۔

''وہ بادشاہوں کے میوزیم میں رکھی ہے۔ البتہ طوط عنخ آمون کا سامان اور زیورات اسی میوزیم کے ایک کمرہ میں علیحدہ رکھے ہیں۔''

میں نے اُس کمرہ میں چلنے کا کہا۔ وہ کمرہ میوزیم کا حصہ تھا۔ کمرہ کے درمیان لکڑی کا چارپائی نما پلنگ رکھا تھا۔ جس میں ہر انچ کے فاصلہ پر ٹیڑھے ترچھے بے ہنگم سوراخ کھدے تھے۔ لکڑی پر رندہ لگنے کے نشانات واضح تھے۔ البتہ کونے اور دھاری ہزاروں سال گزرنے کے باوجود قائم تھی۔ پلنگ کا چوبی گول تکیہ تقریباً دگنی اونچائی کو گھیرے ہوئے تھا۔ سوراخوں میں بید کو دو حصوں میں تقسیم کر کے گزارہ گیا تھا۔ بید کا گول حصہ نیچے اور چپٹا حصہ اُوپر کی جانب تھا۔ اس کے ساتھ کُرسی رکھی تھی کرسی کے پائے سونے میں بنے تھے۔ کُرسی کے سامنے والے پائے شیر کے اگلے پنجوں کی شکل کے تھے اور پچھلے پائے شیر کے پچھلے پنجوں کی شکل کے تھے۔ اس کرسی کی پشت پر سونے کی ایک تختی جڑی تھی۔ جس پر آمنتو ہوپ ٹپ (Amenhotep) کی بڑی تصویر کندہ تھی۔ تصویر میں امنتو ہوپ ٹپ نے کسی گول چیز کو کو ہاتھوں پر اُٹھا رکھا تھا۔ تختی پر سب سے اُوپر سورج کندہ تھا۔ جس کی لاتعداد شعاعیں باہر نکل رہی تھی شعاعوں کے دائیں بائیں دونوں جانب ایک پر پھیلائے ہما اور ایک طوطے کی تصویر، چند الٹے سیدھے دائرے، چند عمودی لکیریں بھی بنی ہوئی نظر آئیں گائیڈ نے بتایا کہ یہ آمنتو ہوپ ٹپ کے راہب اعظم کی تحریر کردہ دعا ہے۔ راہب اعظم نے یہ دعا بادشاہ کے ہمیشہ زندہ رہنے کے لیے تحریر کی تھی۔

اگلے شوکیس میں دو سات فٹ لمبے ڈنڈے رکھے تھے یہ ڈنڈے طوط عنخ آمون کے باڈی گارڈوں کے تھے قد آدم باڈی گارڈوں کو تو ممیوں کے کمرہ میں رکھ دیا گیا تھا۔ ان اشیاء کے ساتھ چھ فٹ لمبی اور ڈھائی فٹ چوڑی ریشمی تہمد دیوار پر آویزاں شوکیس میں رکھی تھی۔ اس تہمد کو موسمی اثرات اور وقت کی شکست وریخت سے بچانے کیلئے محلول چھڑک دیا گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی چمک مدھم ہوگئی تھی۔

گائیڈ نے بتایا کہ جس دن خزانہ دریافت ہونے کی خبر مصری ذرائع ابلاغ پر نشر ہوئی پوری دنیا سے اتنے زیادہ سیاح قاہرہ پہنچ گئے کہ قاہرہ کے تمام ہوٹل مہمانوں سے بھر گئے۔ میں نے گائیڈ سے دریافت کیا۔

''بادشاہ سلامت سونے کے جوتے پہن کر چلتے کیسے تھے۔''

گائیڈ نے بتایا۔

''بادشاہ جب دربار میں بیٹھتے تو یہ چیزیں زیب تن کرتے۔''

ایک سونے کا بنا بڑا تابوت بھی ساتھ رکھا تھا۔ اس کی بغلی دیواریں تقریباً ایک انچ موٹی، دو فٹ اُونچی اور تقریباً آٹھ فٹ لمبی تھیں۔ اس کے اندر ایک سونے کا ٹب نما تابوت بھی رکھا تھا۔ ڈھکن پر طوط عنخ آمون کی سہ جہت شبیہ بنی ہوئی تھی۔ جس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے اور ایک ہاتھ میں ایک لپکتی شمع تھی۔ گائیڈ نے بتایا کہ طوط عنخ آمون کی موت بعد اس کا تمام سامان قبر میں ترتیب سے رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد قبر کے دروازہ پر معبد کے راہب اعظم نے ہمیشگی کی دعا پڑھی۔ جس کے بعد قبر کو بند کر دیا گیا۔ دریافت کے بعد جب قبر کو کھولا گیا تو دروازہ کے پاس گلاب کے پھولوں کا دو فٹ لمبا گلدستہ اپنی اصلی حالت میں بکھرا ہوا ملا۔ گلدستہ کی ہر ٹہنی پر محلول چھڑکا ہوا تھا۔ گلدستہ کی ٹہنیاں مختلف سائز کی تھیں۔ پھولوں کے گلابی شگوفے زردی مائل کلیاں اور سبز کونپلیں اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ گلدستہ میں موجود ہر پھول روزِ اول کی طرح آج بھی تر و تازہ تھا۔ قبر کھولتے وقت ان پھولوں میں خوشبو بھی موجود تھی۔ یہ چار ہزار سال پرانی خوشبو انگریز مورخ کے علاوہ اسکے ہمراہ مصری مددگار نے بھی سونگھی جو ہزاروں سال پرانی ہونے کے باجود تازہ تھی۔

ان سب اشیاء پر عربی اور انگریزی میں تختیاں لگی تھیں ہمارے گائیڈ نے ہمیں تختیاں پڑھنے کی زحمت نہ کرنے دی وہ خود ہی نہایت تفصیل سے فراعنہ کی تہذیب اور تاریخ سے متعلق پہلوؤں پر روشنی ڈال رہا تھا۔ اُس نے فراعنہ کے مذہب پر بھی روشنی ڈالی اور بتایا فراعنہ مرے ہوئے شخص کا بہت احترام کرتے اور اس کی دوسری زندگی کو آرام دہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ان کا ایمان تھا۔ کہ جب ہم سب دوبارہ زندہ ہوں گے تو ہمیں بادشاہ کے سامان کا مکمل حساب دینا پڑے گا یہی وجہ تھی کہ طوط عنخ عامون کے جوتے انگوٹھیاں اور دیگر ذاتی استعمال کی تمام اشیاء کو سلیقہ سے رکھا گیا تھا۔

اس عہد کے رواج کے مطابق ولی عہد شہزادہ کو بادشاہ کے زیر استعمال اشیاء اپنے زیر استعمال لانا ضروری ہوتا۔ اس لیے بادشاہ کو اپنی ماں سے شادی کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوتی۔ اس بناء پر فراعنہ میں ٹیڑھی ہڈیوں کی بیماری عام ہوگئی۔ میوزیم میں اور بہت کچھ رکھا تھا،

لیکن بچوں نے تھکاوٹ اور بھوک کا ذکر کیا۔ مجبوراً واپسی کا پروگرام بنایا اور ہوٹل آ گئے۔ ٹیکسی والے سے دوسرے روز ناشتہ کے فوراً بعد آنے کا کہا۔

دوسرے روز صُبح ڈرائیور سِیدھا ہمارے پاس آیا۔ اُس نے ہوٹل میں اپنا نام اور نمبر لکھوایا۔ سب اس کے ہمراہ اہرام دیکھنے چلے گئے۔ ان اہرام کے اس طرح بنائے جانے کا ذکر ابن بطوطہ اپنے سفر نامہ میں کر چکا تھا۔ اس نے اپنے سفر نامہ میں، مصری عوام میں مشہور پیشین گوئی کا ذکر کیا ہے۔ جو وہاں پر زبان زد عام تھی کہ حضرت شیس علیہ اسلام جو حضرت نوحؑ علیہ السلام کے دادا کے دادا تھے نے طوفان نوح کی پیشین گوئی کی تھی۔ زمیں پر پانی کا ایک ایسا سیلاب آنے والا ہے جس میں دنیا کے اندر بنی ہر شے مٹ جائیگی۔ بادشاہ وقت نے اپنی سلطنت میں بسنے والے تمام نجومیوں کو بلایا اور ان سے سوال کیا کہ اس طوفان سے کس طرح سے بچا جا سکتا ہے؟ انہوں نے حساب لگا کر بتایا کہ وہ تعمیرات جو دریائے نیل سے جنوب میں ہوں گی۔ یا وہ تعمیرات جو سطح زمین سے بیس کیوبٹ (ہاتھ کی کہنی تک لمبائی) اوپر یا زمین کے اندر ہوں گی وہ بچ جائیں گی۔ چنانچہ اہرام کو زمین سے بیس کیوبٹ اونچا بنایا گیا۔

بادشاہ نے ان نجومیوں سے پھر سوال کیا کہ کوئی خزانہ دریافت بھی ہوگا؟ جواب میں انہوں نے حساب لگا کر بتایا کہ ایک خزانہ اپنی اصلی حالت میں مل جائیگا۔ یہ پیشین گوئی بیسوی صدی میں حرف بحرف درست ثابت ہوئی اور طوطؑخ آمون بمعہ اُپنی دولت کے ظاہر ہو گیا۔

پرانے قاہرہ شہر سے تھوڑی دیر میں ہم قاہرہ کے علاقہ گزہ میں چیوپس کے اہرام (Pyramid of Khufu or the Pyramid of Cheops) کے سامنے تھے۔ اس کی عظمت، شان وشکوہ کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ حیران تھا کہ مصری قوم نے آج سے ساڑھے چار ہزار سال (2580–2560 BC) پہلے اس عظیم اور پرشکوہ عمارت کو ڈیزائین اور تعمیر کیا۔

پتھروں کے بنے اس بڑے اہرام کی بنیاد 53084.16 سکوئر میٹر پر محیط ہے۔ 'چیوپس' یا 'کوفو' اہرام کی ایک طرف کی چوڑائی 230.4 میٹر اور اُنچائی 138.8 میٹر ہے۔ مصری ماہرینِ آثار قدیمہ کے مطابق اہرام کی تعمیر دس سے بیس سالوں میں تقریباً 2560 BC (۲۵۶۰ سال حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے) میں مکمل ہوئی۔ آجکل کے سیاحوں کے لیے اہرام

میں جانے کا راستہ لٹیروں کی ٹنل (Robbers' Tunnel) کہلاتا ہے۔ اہرام کے داخلی راستے کے قریب آنے پر معلوم ہوا کہ اِیک اونچے بڑے پلیٹ فارم پر دو چٹانی تکون سامنے اور دو پیچھے سر جوڑے کھڑے ہیں۔

اہرام کے اندر جانے کے لیئے چوڑی سیڑھی بنی تھی۔ بچّوں کے لیے سیڑھیاں چڑھنا کافی مشکل تھا۔ بیس پچیس سیڑھیاں طے کرنے کے بعد ایک پندرہ بیس فٹ مربع کے پلیٹ فام پر ہم سب دوبارہ اکھٹے ہو گئے۔ سامنے اِیک غار (Tunnel) کُھلی تھی۔ غار کی دیواروں پر لا تعداد دائرے تکونیں، مستطیلیں، طوطے، مینا، سانپ اور دیگر جانوروں کی اَشکال بنی ہوئی تھیں۔ گائیڈ نے تصویر کی جانب اِشارہ کیا اور بتایا کہ تصویر اُس زمانے کے حکماء کی دریافت کردہ علوم کے متعلق ہے۔ تمام تصاویر یا اشکال مختلف بیماریوں کے علاج کے تعویز تھے۔ میں نے گائیڈ سے ان تعویزوں اور فارمولوں کو یہاں کندہ کرنے کی وجہ پوچھی؟ اس نے بتایا بیس کیوبٹ اونچے اہرام بنانے کی وجہ حضرت نوحؑ علیہ السلام کے طوفان کے آمد کی پیشین گوئی تھی۔ حکماء اور دیگر اہل علم نے اپنے علوم وفنون جن سے وہ اس وقت تک آگاہ ہو چکے تھے۔ ان سب کو یہاں کندہ کر دیا، تا کہ آنے والے طوفان نوح کی تباہ کاری سے بچ جائیں۔

اہرام میں داخل ہونے کے لیے کوئی سیڑھی نہ تھی۔ البتہ غار کے دونوں جانب سہارے کے لیے رسیاں آویزاں تھیں اور پاوں جمانے کے لیے لکڑی کے تختوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر لکڑی کے دو انچ چوڑے اور ایک انچ موٹے ٹکڑے جڑے ہوئے تھے۔ ان پر پاؤں ٹِیک کر سیاح نیچے جا سکتے تھے۔ ہم سب نے نیچے اُترنا شُروع کر دیا۔ سب سے پہلے میں نیچے اُترا۔ پھر بچّوں میں یٰسین میری طرح اُلٹا اُترا۔ اس کے بعد نگہت، سنبل، کوکب اور آخر میں بیگم صاحبہ نیچے پہنچیں۔ یہ بڑا ہال تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا تھا، ستوُن یا بیم کے بغیر پورے اہرام کا ہزاروں ٹن بوجھ ہزاروں سال سے اٹھائے کھڑا تھا۔ سامنے تین اطراف تین سے چار مربع فٹ روشن دان کھلے تھے۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ روشنی اور ہوا کے لیے ہیں۔ تین اطراف سے سورج کی روشنی آ سکتی تھی لہٰذا یہ روشن دان صرف تین اطراف میں تھے۔ چوتھی طرف سیڑھی بنی تھی۔ اس چوتھی طرف کے راستہ سے بادشاہ کا سامان اور اس کی لاش نیچے لائی گئی۔ بڑے ہال کے اندر ایک مستطیل شکل کا کمرہ تھا۔ جس کے اندر مزید چار چُھوٹے چُھوٹے ڈربہ نما کمرے بنے تھے۔ یہ چُھوٹے

کمرے بادشاہ کی چار بیویوں کے تھے۔ بڑے کمرے میں بادشاہ کی لاش اور سامان رکھا تھا۔ میں نے گائیڈ سے پوچھا۔

''کیا اُسکی بیویوں کی لاشوں کو حنوط کر کے یہاں رکھا گیا تھا؟''

گائیڈ نے لاعلمی کا اظہار کیا اس نے انگریزی عربی اور اشاروں میں بتایا کہ یہ بڑا اہرام 'کوفو' (Khufu) فرعون کا ہے۔ دوسرا ساتھ والا بیٹے کا اور اس سے اگلا جو سب سے چھوٹا ہے وہ پوتے کا ہے۔ سب سے چھوٹی جگہ بھی فٹ بال سٹیڈیم سے بڑی تھی۔

اہرام کے تمام اطراف میں گھومنے کے بعد ہم اسی ترتیب سے باہر نکلے جس سے اندر گئے تھے۔ اہرام کے اندر کی فضا میں کافی گھٹن تھی باہر نکلے۔ ایک شخص کوک کی چھوٹی بوتل ایک سو پچیس ملی لیٹر کی لیے کھڑا تھا۔ وہ پی کر خدا کا شکر ادا کیا گائیڈ نے اپنا انعام وصول کیا اور دوسرے سیاح کو لیکر اہرام کے اندر چلا گیا۔

لکڑی کے زینہ سے نیچے اُترے تو ہمارے ڈارائیور نے دریافت کیا کہ آگے بادشاہوں کی وادی میں جانا ہے یا پہلے بادشاہ 'خفرے (Khafre) کا مُجسمہ دیکھنا ہے۔ بادشاہوں کی وادی میں جانے کے لیے واپس جانا ہُو گا۔ جب کہ 'خفرے' کا مُجسمہ پاس ہی ہے۔ ہم نے 'خفرے کے مجسمے کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ خفرے کے مجسمہ کا نیچے کا دھڑ شیر کا تھا۔

گائیڈ نے اشاروں اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ اس بُت کو ایسے زاویہ پر نصب کیا گیا ہے کہ سال میں ایک مرتبہ سورج اس مجسمہ کے سر کے پیچھے مکمل چھپ جاتا ہے۔ اس دن کو مصری نئے سال کا پہلا دن شمار کرتے اور جشن بہاراں مناتے تھے۔ خفرے کا مجسمہ پیدل آدھا کلومیٹر کے فاصلہ پر تھا۔ ہم نے ریگستان میں چلنے کی بجائے سڑک کے راستہ جانا پسند کیا۔ تھوڑی دُور ہی گئے تھے۔ کہ ڈرائیور نے ایک دیوار کے ساتھ گاڑی کو روک لیا۔ اس نے بتایا۔

''یہ سب سے افضل دیوتا 'را' کی عبادت گاہ ہے۔ اسی عبادت گاہ کے راہب اعظم آمنتو ہوپ نے سکندر اعظم کو دیوتا ہونے کا درجہ عطا کیا تھا۔''

یہ ایک کشادہ عبادت گاہ تھی۔ جس کے اندر ایک درمیانہ سائز کی مسجد بنی تھی۔ مسجد کے مینار فراعنہ کی تعمیر کردہ عبادت گاہ کے مینار سے بہت اُونچے دکھائی دئے۔ اس کی دیواریں نسبتاً چھوٹے پتھروں سے بنی تھیں لیکن پرشکوہ اور عظمت میں لاجواب تھی۔ عبادت گاہ کے اندر پرانی

دیوار کے ٹوٹے ہوئے پتھر بکھرے پڑے تھے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ اس دیوار کے پیچھے امنتو ہوپ کا مجسمہ اور مینار بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مستطیل مینار دیوار کے عقب میں تھا۔ اس کے ساتھ دیوار کے سایہ میں آمنت ہوپ کا مجسمہ موجود تھا۔ دیوار کے پتھروں کو ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا کہیں کوئی خم محسوس نہ ہوا۔ یہ دیوار تقریباً سولہ فٹ اُونچی تھی۔ عبادت گاہ کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر خفرے کا مجسمہ نصب تھا۔ گائیڈ نے پتھر کے بنچ کی جانب اشارہ کیا کہ اس پر بیٹھ کر خفرے کے سامنے تصویر بنوائی جائے تو مجسمہ عبادت گاہ اور اہرام تینوں بیک گراونڈ میں آجائیں گے ہم سب نے وہاں بیٹھ کر یادگار تصویر بنوائی۔ اور واپسی کا سفر اختیار کیا۔

ہمارے راستے میں انور السادات کا مزار تھا۔ ڈرائیور ہمیں وہاں لے گیا۔ انور السادات اپنی مقتل گاہ کے سامنے سو گز دور سڑک کی دوسری جانب ہی دفن ہے۔ اُس کے مزار پر اہرام کے ڈایزین پر مبنی میموریل تعمیر کیا گیا ہے۔ مزار نے کافی جگہ بھی گھیر رکھی ہے۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بعد ہم مزار کے احاطہ میں گئے۔ گارڈ نے بتایا انور السادات کی اصلی قبر تو نیچے ہے اور جس جگہ ہم کھڑے ہیں وہ قبر کی چھت ہے اور یہ مصنوعی قبر چھت کے اُوپر بنی ہے۔ قبر تک جانے کا زینہ دوسری جانب ہے۔ یہاں سے سامنے سڑک کی دوسری جانب چبوترا پر انور السادات فوج سے سلامی لے رہے تھے، کہ ایک باغی سپاہی نے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ چبوترے کے عقب میں چودہ فٹ اونچی دیوار بنی ہے۔ اس دیوار کے وسط میں ایک پانچ فٹ چوڑی چار فٹ اُونچی ڈھال کنندہ ہے۔ چبوترے پر ایک سو کرسیاں رکھنے کی گنجائش ہے۔ چبوترے کی دیوار پر فراعنہ کی تصاویر بنی ھیں۔ اب ہم نے ہوٹل کا رُخ کیا کیونکہ شام ہونے سے پیشتر ائیر پورٹ پہنچنا تھا۔

اس ائیر کمپنی کے جہاز سے میرا یہ پہلا سفر تھا۔ اس کمپنی اور اس کے سٹاف کے متعلق جھوٹی سچی طوطا کہانیاں تو کافی سننے کو ملیں۔ کنفرم سیٹ کو ریکوسٹ (Request) کر دینا اور ریکوسٹ سیٹ کو کنفرم کرنا تو ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل بتایا جاتا تھا۔ دو مختلف ملکوں کے مسافروں کو ہوٹل کے ایک کمرے میں ٹھہرا دینا اور سیاحوں کا سامان غائب کرنے کے قصے تو زباں زد عام تھے۔ تاہم میں نے اللہ تو کل اس جہاز سے سیٹیں بُک کروائی تھیں۔ وہ کنفرم بھی کر دی گئیں۔ کانو کے جہاز کی بورڈنگ شروع ہونے پر ٹکٹ پیش کیے۔ بورڈنگ کارڈ مل گئے۔ جونہی بورڈنگ کا اعلان ہُوا خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ تمام مراحل بخیر وخوبی طے ہو گئے اور ہم جہاز میں بیٹھ گئے۔ سیٹیں کافی بوسیدہ

تھیں۔ان میں روائیتی چمک اورصفائی نہ تھی یہ عیاں ہورہا تھا، کہ یہ کسی غریب ملک کی جہاز کمپنی ہے۔ہم اُن بوسیدہ کرسیوں میں دھنس گئے ۔ جہاز روانگی کیلئے تیار تھا کہ ایئر لائن کے اِیک ملازم نے انگریزی اورعربی زبان میں جہاز کے جُملہ مسافروں سے درخواست کی کہ نیچے آ کر اپنا سامان شناخت کروائیں۔میں دروازہ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔فوراً نیچے گیا اور اپنے تمام بکس اور بیگ شناخت کئے اور لوڈر کے حوالے کئے۔ مجھ سے اگلی نشست پر اِیک اور مسافر نے بھی اُتر کر اپنا جُملہ سامان شناخت کروایا۔اُس کی لوڈر سے تُوں تُوں میں میں ہوگئی۔تاہم وہ اپنا تمام سامان بڑی احتیاط سے جہاز میں لوڈ کروا آیا۔کیبن بند ہونے سے پیشتر وہ جہاز میں واپس آیا اور اپنا دستی سامان بھی ہمراہ لے گیا اِس کو بھی کیبن میں رکھ آیا۔اِس دفعہ واپسی پر اس کے ہاتھ میں اِیک بوتل تھی مُجھے اُس نے بُتایا۔

''اِس میں شہد ہے میں اِسے بیگ سے نکال لایا ہوں۔اگر یہ کُھل گئی یا ٹوٹ گئی تو بیگ میں رکھا سامان خراب ہوجائیگا۔''

کانو جہاز سے اُتر کر اپنا جُملہ سامان وصول کرنے کے بَعد، میں امیگریشن کاؤنٹر پر نائیجیریا میں داخلہ مہر لگوانے کے لیے کھڑا تھا۔کہ اُسی مسافر سے دوبارہ ملاقات ہوگئی۔اُس نے ہاتھ میں وہی شہد کی بوتل پکڑ رکھی تھی۔اس کا تمام سامان جھگڑالو لوڈر نے قاہرہ ائر پورٹ پر لاوارث قرار دیکر کیبن سے واپس اُتار لیا تھا۔وہ جہاز کمپنی اور اُس کے مُلازمین کو بُرا بَھلا کہہ رَہا تھا۔

رات کانو کے ایک ہوٹل میں رکے۔دوسرے روز کانو سے چوہدری حنیف صاحب کے گھر کی ٹیکسی لی۔ان کے گھر کے باہر ایک گارڈ بیٹھا تھا جس نے بتایا کہ وہ تو پاکستان سے ابھی نہیں آئے شاید کل آجائیں۔اسی ٹیکسی والے سے''مینا'' کا کرایہ طے کرکے واپس اپنے شہر مینا پہنچ گئے۔

مرکزی حکومت نائجیریا نے یونیورسل پرائمری ایجوکیشن کا پروگرام ختم کر دیا تھا۔اس پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیئے بھرتی کیئے گئے تمام ملازمین کو مرکزی سکولوں اور کالجوں میں ضم کر دیا گیا۔مرکزی محکمہ تعلیم حکومت نائیجیریا نے مجھے واپس بلا کر فیڈرل ایڈوانس ٹیچر کالج 'کانٹا گورا' میں رپورٹ کرنے کا حکم دیا۔ میں مرکزی حکومت کے احکامات کے مطابق 'کانٹا گورا' رپورٹ کرنے چلا گیا۔وہاں کے پرنسپل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ان کا تعلق سابقہ

باغی ریاست بیافرا سے تھا۔اس ریاست کے باشندے سیاسی طور پر زیادہ باشعور اور تعلیم یافتہ لوگ تھے۔اس باغی ریاست کے جملہ ملازمین کو حکومت نائیجیریا نے مرکزی حکومت میں ضم کرلیا تھا۔یہ پرنسپل صاحب غیر ملکی ملازمین کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے مجھے جائن کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے اپنی ملازمت جانے کا خدشہ ہوا۔لیگاس جانے کی بجائے واپس اپنی پرانی ریاست میں آگیا۔انہوں نے یہ کہہ کر کالج آف ایجوکیشن میں رپورٹ کرنے کا حکم دیا کہ مرکز کے پاس تو ایڈوانس ٹیچر کالج ہے۔جس کے مقابلہ میں ہمارے پاس تو کالج آف ایجوکیشن ہے۔یہ ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ تھی جہاں پر اے لیول پاس کرنے کے بعد تین سالہ کورس کے بعد بیچلر آف ایجوکیشن کی ڈگری دی جاتی۔ یہاں پر مالی فائدہ کے علاوہ ہر سال پاکستان آنے جانے کے بزنس کلاس کے ٹکٹ بھی پانچ بچوں تک کو دیئے جاتے تھے۔

دوسری بچی سنبلینہ کا اُولیول کا لندن یونیورسٹی کا نتیجہ آیا، اُسنے اولیول کے سات مضامین میں امتحان دیا تھا۔اُن سب میں 'اے' گریڈ لیا۔ پورے نائیجیریا میں چوبیس ہزار طلباء نے اس امتحان میں حصہ لیا تھا وہ سب سے پہلی پوزیشن میں پاس ہوئی تھی۔

اب اُس کی تعلیم کو مزید کیسے جاری رکھا جائے۔اس سے ایک سال پہلے تو بڑی بچی نے بیچلر آف ایجوکیشن میں داخلہ لیا تھا۔سنبلینہ بچی ایجوکیشن کی بجائے قانون کا پیشہ اپنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔اے لیول کے داخلہ کے لیے نزدیک تریں کالج ڈیڑھ سوکلومیٹر دور' کا ڈونا' یا دو سو میل دور ' آبادان' میں تھا۔ بچی کو دوسرے شہر تنہا بھیجنا بیگم صاحبہ کو منظور نہ تھا۔دوسرا حل اس کا یہ بھی تھا کہ بچی کو گھر پر ہی تیاری کروا کے لندن یونیورسٹی کا اے لیول کا امتحان دلوایا جائے۔ایشیائی ممالک کے اور بچے بھی اسی مسئلہ سے دوچار تھے۔ طے پایا کہ ایک جگہ پر بچوں کو اکٹھا کیا جائے اور لندن یونیورسٹی کے کورس کی کتب کا بندوبست کیا جائے۔کتب کہیں سے بھی دستیاب نہ تھیں۔اب یہ احساس ہوا کہ یہ مسئلہ یہیں ختم والا نہ تھا۔اس کے بعد بیٹا اور پھر چھوٹی بیٹی سب قدم با قدم اس مسئلہ سے دوچار ہونے چلے آرہے تھے۔سب کو سکول ٹیچر تو بنانا مقصود نہ تھا۔'مینا' میں یونیورسٹی قائم کرنے کا اصولی فیصلہ تو ہوچکا تھا۔لیکن اس کے قیام میں کتنا عرصہ لگ جائے گا۔وہ کب کلاسسز کا اجراء کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔کسی کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا۔میں نے اس مسئلہ کا آسان حل حکومت نائیجیریا کی ملازمت سے استعفیٰ دینا ہی مناسب جانا۔

یہ میرا نائیجیریا کا آخری سال تھا۔ انتہائی پریشانی کے عالم میں صبح شام یہی سوچتا کہ بچوں کو کیسے سیٹل کیا جائے گا۔ بچے تو ابھی ناپختہ ذہن کے مالک تھے۔ بیٹے کو تو نائیجیرین، 'محمدؤ'، 'اوڈؤ'، 'عبدلاہی'، اور بچیوں کو 'سلامتو'، اور 'فاطمہ تو'، وغیرہ پاکستان میں رہتے، دانش، عمر، رستم، نجیب، سعدیہ اور روبینہ سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔ مینا اور بیڈا کی گلیاں زیادہ مانوس اور پیاری تھیں۔ انہیں تو پنجابی یا اردو صرف گھر میں یا پاکستانی بچوں کے ساتھ بولنی ہوتی جن کی تعداد کم ہوتی۔

کبھی وہ پاکستان جاتے تو وہاں وہ اُسی طرح سے رکتے، جیسے وہ 'روم' 'لندن'' آمسٹرڈام' میں، فرق تو صرف اتنا تھا کہ روم اور لندن میں وہ چند دن رہتے اور اسلام آباد میں چند ہفتے۔ اتنے سے انہیں اسلام آباد کی گلیوں سے اتنا ہی پیار ہوسکتا تھا جتنا انہیں روم یا لندن کی گلیوں سے۔ وہ پاکستان آنے کو تیار ہی نہ تھے۔ لیکن میں نے انہیں پیار سے انگلینڈ کینیڈا اور امریکہ میں داخل ہونے اور وہاں کی رہائش کے مسائل سمجھائے تو وہ سبھی پاکستان جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

باب دہم

پاکستان واپسی

میں جب پاکستان پہنچا تو میرے لیے مسائل کا انبار تھا۔ ایک پنڈورا بکس کھل گیا۔ رہائشی مکان تو میرے پاس دو تھے۔ لیکن رہائش کے قابل ایک بھی نہ تھا۔ دس سال کی غیر حاضری میں کرایہ وصول کرنے والے کرایہ لے جاتے لیکن مکان کی سالانہ مرمت نہ کراتے۔ جب کرایہ دار توجہ دلاتے تو انہیں یہ جواب ملتا کہ مرمت مالک مکان خود آکر کرائے گا۔ اسلام آباد والا مکان تو آباد گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ چار پایئوں کے علاوہ گھر کا تمام سامان سٹور میں ترتیب سے رکھ کر بند کر دیا تھا۔ اور چابی بڑے بھائی جان کو دے دی تھی۔ مکان کو کرایہ پر دینے کا اختیار بھی رجسٹرار کے سامنے جا کر ایک اشٹام پر لکھ دیا۔ اس مختار نامہ کی بدولت انہوں نے مکان کی ایک منزل کرایہ پر دے دی۔ دوسری اپنے پاس رکھ لی۔ جب کبھی وہ اسلام آباد آتے تو وہیں رکتے۔ ضرورت کی اشیا بھائی جان نے سٹور سے نکال لینی اور جاتے ہوئے کرایہ دار کو اماناً دینی کہ واپس آکر سٹور میں رکھتا ہوں، چنانچہ وہ اشیاء اکثر کرایہ دار استعمال کرتے۔ کبھی کبھی بوقت ضرورت مزید سامان بھی نکال کر استعمال کرتے اور واپس رکھ دیتے۔ کبھی نہ بھی رکھ سکتے۔ مکان خالی کرتے ہوئے وہیں چھوڑ جاتے اور نیا کرایہ دار لاوارث سمجھ کر اپنے ہمراہ لے جاتا۔ آہستہ آہستہ سامان کا صرف نشان رہ گیا۔ دوسرا مکان والد صاحب کے زیر استعمال تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے۔ وہ ہر مسلہ کو حل کرواتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد چھوٹے بھائی نے اس کو کرایہ پر دے دیا۔ تین چار سال تک تو اس کی حالت میں میں کوئی فرق نہ آیا۔ جب وہ بھی رہائیش کے قابل نہ رہا، تو کرایہ دار نے خالی کر دیا۔ جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ ان میں رہائیش ناممکن تھی۔

ایک نیا اور سب سے اہم مسلہ ٹرانسپورٹ سے متعلق سامنے آیا۔ ہم تمام گھر والے گاڑی

دائیں ہاتھ چلانے کے عادی ہو چکے تھے۔ جبکہ پاکستان میں تو بائیں ہاتھ چلنے کا قانون تھا۔ میں نے پاکستان آنے کے ساتھ ہی ایک موٹر سائیکل اور ایک گاڑی خرید لی سارا دن موٹر سائیکل چلاتا۔تا کہ گاڑی بائیں ہاتھ چلانے کی عادت ہو جائے۔ گاڑی تو بہت کم چلاتا۔لیکن اس کے باوجود گاڑی چلانی پڑتی۔ایک روز میں محکمہ ایکسائیز میں گاڑی اپنے نام رجسٹر کروانے گیا۔گاڑی کو ایک طرف علیحدہ کھڑی کر کے دفتر میں چلا گیا۔واپس لوٹا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ میری گاڑی کے پاس کھڑے ہیں۔ایک گاڑی میری گاڑی سے چپکی کھڑی تھی دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک بنک منیجر صاحب اپنی گاڑی کا کنٹرول کھو بیٹھے اور میری گاڑی سے ٹکرا گے۔ وہ گاڑی وہیں چھوڑ کر ہسپتال مرہم پٹی اور حواس درست کرنے گے تھے۔انہوں نے گھر سے ایک بزرگ کے ہاتھوں پیغام بھیجا۔کہ وہ گاڑی کی ڈینٹنگ اور پینٹنگ کروا دیں گے۔مزید دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بزرگ اس کی بیوی کے والد تھے اور انہوں نے منیجر صاحب سے کہا کہ اس گاڑی کی وجہ سے تمہاری جان بچی اسے دوبارہ اسی حالت میں کروا دو۔انہوں نے حسب وعدہ گاڑی کو ایک بڑے گیراج میں بھجوا دیا اور دس روز کے بعد مجھے گاڑی دوبارہ اصلی حالت میں ملی۔

کلرک بادشاہ

جب اَپنے سابقہ محکمہ میں جائن کرنے کے لیے لاہور سکریٹریٹ پہنچا۔ رپورٹ کلرک کے حوالے کی تو اُس نے لینے سے صاف اِنکار کر دیا کہ پہلے سکریٹری صاحب سے منظور کرواؤ پھر لوں گا۔ایک دن کی غیر حاضری بھی قابل معافی نہیں ہوتی،آپ تو آٹھ سال سے غیر حاضر ہیں۔ ڈپٹی سیکریٹری کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ نہ مانے۔ مجبوراً دفتر میں بیٹھے کلرکوں کے پاس آ گیا۔کہ آپ لوگ کوئی راستہ نکالیں۔ میں نے وہیں بیٹھے سپر نٹنڈنٹ صاحب سے بات کی کہ آپ لوگ اپنے نوٹ کے ساتھ سکریٹری صاحب کو ڈاک میں بھیج دیں اور ساتھ ہی جیب سے پانچ سو روپے کا نوٹ نکالا۔کہ یہ آپ لوگوں کی مٹھائی ہے۔اسی کمرہ میں سپر نٹنڈنٹ صاحب کے علاوہ سیکشن کا دیگر سٹاف بھی بیٹھا تھا۔نوٹ لینے کے لئے پانچ ہاتھ سامنے آئے۔ میں سخت پریشان ہو گیا کہ نوٹ کس کے ہاتھ میں دوں۔ مجھے دس سال پہلے کا پاکستان یاد آ گیا۔جب میں ڈیپوٹیشن پر جانے کی منظوری لینے کے لئے آیا تھا۔تو سپر نٹنڈنٹ صاحب نے دوسو روپیہ کانپتے

ہاتھوں سے لیا۔اُنھوں نے مجھے کہا تھا۔

''نوٹ میز کے نیچے سے پکڑاو۔''

آج وہی کانپتے ہاتھ میز کے اُوپر سے پانچ سو کا نوٹ میرے سے چھیننے کے لئے بیتاب تھے۔میں حیران تھا کہ دس سال کے مختصر عرصہ میں حرام کو حلال بننے میں تھوڑا وقت ہی لگا ہے۔ یہ سب لوگ اِیک دوسرے سے سبقت لینے کی کوشش میں ہیں۔ میں نے وہی پانچ سو کا نوٹ چپڑاسی کے ہاتھ میں پکڑا دیا کہ یہ سپر نٹنڈنٹ صاحب کو پہنچا دے،ان کی میز سب سے بڑی تھی اور ان کے پھیلے ہاتھ تک رسائی مشکل تھی ان کا ہاتھ کچھ فاصلہ پر تھا۔ دوسرے روز جب میں سکریٹریٹ پہنچا تو سیکشن افسر صاحب سپر نٹنڈنٹ کی میز پر ہی براجمان تھے۔اُن کا ایک جواں سال بیٹا بھی ان کے پاس بیٹھا تھا،وہ اپنے بیٹے سے معذرت خواہ تھے۔

''بیٹا آج آمدنی کچھ نہیں ہوئی۔اگر کچھ پیسے مل گئے تو تمہیں ضرور دونگا۔''

وہ اُونچی آواز میں مجھے سنا رہے تھے۔تا ہم کلرک نے درخواست اپنے پاس رکھ لی۔ایک روز نئے ڈپٹی سیکریٹری سے تاریخ تبدیل کر کے جائننگ رپورٹ پر دستخط کروالائے۔بعد میں کلرک محکمہ سے تبدیل ہو کر سیکریٹریٹ کی کسی اور برانچ میں چلا گیا، مجھے اس کا نام بھی یاد نہ تھا کہ اس کا شکریہ ہی ادا کر سکتا۔

چندروز بعد میں ٹائپسٹ کے پاس اپنی ری اَنسٹیٹمنٹ کے آرڈر ٹائپ کروانے بیٹھا تھا۔ میں نے اُن کو کچھ پیسے مٹھائی کے طور دینے کی کوشش کی تو وہ کہنے لگا۔

''بھائی یہ پیسے اپنے بٹوے میں واپس رکھو آپ کی بڑی مہربانی میں جانتا ہوں کہ آپ سونے کے بنے ہوئے ہیں،آپ کے کندھے پر صرف ہاتھ پھیرنے سے میرے ہاتھوں پر بہت سا سونا لگ جائیگا۔لیکن میں حرام کی کمائی لے کر بچوں کا پیٹ پالنا پسند نہیں کرتا۔اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے بہت کچھ دَے رکھا ہے۔میرے بچے حلال کا رزق کھاتے ہیں،اور اچھے سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔''

میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا حیران تھا۔کہ اِس معاشرہ میں ابھی ایسے لوگ موجود ہیں جو حلال اور حرام کی اہمیت کو پہنچانتے ہیں۔میں نے اصرار بھی کیا لیکن وہ نہ مانے۔اپوائنٹمنٹ لیٹر لے کر وہ خود ہی ڈپٹی سکریٹری صاحب سے دستخط بھی کروالائے۔میرے ہمراہ جا کر وہ لیٹر ڈسپیچ کلرک سے دستی

دلوا دیا۔ میں وہیں اس کے پاس بیٹھا گپ لگا رہا تھا۔ فون پر گھنٹی بجی۔ کلرک نے فون اٹھایا اور بولا
'' جی سر۔۔۔ بول رہا ہوں ۔ سر۔حکم سر۔۔۔۔ وہ تو کافی دیر ہوئی چٹھی دستی لے کر چلا گیا ہے۔''

اُس نے ٹیلیفون پرَ باتیں کرتے ہوئے مجھے اِشارہ کیا کہ نکلو اور جاوَ۔ بغیر رسمی الوداع کے میں دفتر سے نکلا اور گیٹ سے باہر آ گیا۔ اپنے پرانے محکمہ میں حسبِ حُکم سَیکریٹری صاحب جائن کر لیا۔ بَعد میں اِیک بار ملاقات پرَ انہوں نے اِس راز سے پردہ اٹھایا کہ اِس روز ڈپٹی سَیکریٹری صاحب فون پر یہ حُکم دَے رہے تھے کہ پروفیسر غلام فاروق کا اپوائینٹمنٹ لیٹر غلطی سے دستخط ہو گیا ہے۔ اُسے روکا جَائے وہ اس تک نہ پہنچنا چاہیے۔ غالبًا وہ بھاری رِشوت لینے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔

ڈپٹی سَیکریٹری صاحب نے ڈائیریکٹر ایجوکیشن راولپنڈی کو تحقیقات کر کے رپورٹ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ڈائیریکٹر صاحب نے پرنسپل گورنمنٹ کالج راولپنڈی کو انکوائیری افسر مقرر کر کے سیکریٹری ایجوکیشن کو مطلع کر دیا۔ پرنسپل صاحب میرے پرانے کولیگ تھے۔ میں نے اپنا اِیک بیان لکھ کر پرنسپل صاحب کو دکھایا۔ انہوں نے پہلے خود پڑھا اور ڈرافٹ میں کچھ تصحیح کی، بَعد میں اُنھوں نےَ خود بیان لکھوایا۔ اور کہا اب یہ بیان عدالت میں بھی کام آئے گا۔ تیسرے روز اُنہوں نےَ اَپنی رپورٹ لکھ دی اور مجھے پڑھنےَ کے لیے دی۔ انہوں نے تحریر کیا تھا۔

'' مسٹر شیخ غلام فاروق رخصت کی درخواستیں بغیر تنخواہ (Leave with out pay) وقت پر دیتا رہا ہے۔''

اپنےَ ریمارکس اور جُملہ ثبوت بھی فِیصلہ کے ساتھ منسلک کیے اور اپنی رپورٹ ڈائریکٹر ایجوکیشن کو فیصلہ صادر کرنے کے لیے بھیج دی گئی۔

بیرون ملک سے واپس آنے والے محکمہ تعلیم کے ملازمین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان کی سہولت کے لیے سیکریٹری ایجوکیشن نے پالیسی خط تمام ریجنل ڈائیریکٹر صاحبان کو لکھا۔ کہ جو ملازم بھی بیرون ملک سے واپس پاکستان آئے اس کو انکواری سے پیشتر عارضی طور پر اپنے ڈومیسائل کے ضلع میں تعینات کیا جائے۔ اور جتنے سال وہ غیر حاضر رہا اتنے سال کی انکریمنٹ روک کر نوکری پر بحال کر دو۔ اس اصول کے مدنظر مجھے ضلع چکوال کے ایک دور افتادہ شہر کٹاس میں جائن کرنے کا حکم دیا گیا۔

بچوں کا پاکستان

جب میں پاکستان سے نائیجیریا گیا تھا تو سب سے بڑی بچی پرائمری میں پڑھتی تھی۔ اب واپسی پر چھوٹی بچی پرائمری میں پڑھتی تھی۔ نائیجیریا میں ہم سب گھر میں پنجابی میں بات کرتے تھے۔ بچوں کو البتہ کلاس روم، بازار، گلی محلے میں انگریزی میں بات کرنی پڑتی، آہستہ آہستہ بچوں کو انگریزی پر عبور حاصل ہو گیا۔ وہ اکثر اپنے کمرہ میں پنجابی بولتے بولتے انگریزی میں بات شروع کر دیتے، تو میں سمجھ جاتا کہ اب وہ کسی مسلہ پر جھگڑ رہے ہیں۔ بچے اردو بول لیتے لیکن پڑھ نہیں سکتے تھے۔

اب جب دس سال بعد پاکستان لوٹا تو معلوم ہوا کہ انگریزی کی طرح اردو زبان کو ایف ایس سی تک ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ بیٹے کا اردو زبان کا معاملہ کسی حد تک اطمینان بخش تھا۔ یہاں اس کے سکول کے پرنسپل میرے اچھے جاننے والے تھے۔ میں نے بیٹے کو دسویں جماعت میں داخل کرنے کا کہا وہ کہنے لگے۔

'' میں اسے دسویں جماعت میں داخل تو کر لیتا ہوں لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ کا بچہ دسویں میں فیل ہو جائے یا اردو میں کمزوری کی بناء پر تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو، بہتر ہے کہ آپ اس کو نویں جماعت میں اور اس کی چھوٹی بہن کو چوتھی جماعت میں داخل کروا دیں۔''

تاہم اُنہوں نے داخلہ فارم پر دستخط کرنے سے پہلے کہا۔

'' اِن کے داخلے کی شرط یہ ہے کہ اگر یہ دونوں بچے دو مہینے کے عرصہ میں کلاس کے معیار کے مطابق پورے نہ اُتر سکے تو میں دونوں کو ایک ایک جماعت پیچھے کر دوں گا۔''

میں نے کہا، شرط منظور ہے۔

پرنسپل صاحب نے دونوں کے لیے سکول کے اوقات کار کے بعد اردو میں ٹیوشن کا بندوبست بھی کر دیا۔ ایک ماہ گزرنے کے بعد میں نے ٹیوٹر کی فیس پیش کی۔ جسے انہوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔

'' یہ دونوں بچے اب میرے بچے ہیں اور اِن کی تعلیم کی تمام تر ذمہ داری اب میری ہے۔ سکول کی فیس کے علاوہ کسی قسم کی ٹیوشن فیس نہ ہو گی۔''

میں بڑا مشکور رہوا اور بچوں کی تعلیم سے مطمعن ہو گیا۔ بیٹے کو سکول میگزین کا ایڈیٹر چن لیا

گیا۔ دسویں جماعت میں وہ سکول کا بیسٹ سٹوڈنٹ قرار پایا۔

دسویں جماعت کے امتحان دینے کے بعد مسئلہ کالج میں داخلے کا تھا۔ جس کے لیے میں اسلام آباد کالج میں گیا اس کے پرنسپل صاحب میرے پرانے جاننے والوں میں سے تھے۔ پرنسپل صاحب مجھے پچھلے دس سال سے جانتے تھے۔ اِن کے بڑے بھائی صاحب نائیجیریا میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ پرنسپل صاحب نے تکلفاً بچے کے حاصل کردہ نمبروں کے متعلق سوال نہ کیا۔ میں نے خود ہی اُن کو بتایا کہ بچے کی بورڈ میں گیارھویں پوزیشن ہے۔ پرنسپل صاحب کی آنکھیں حیرانگی سے کُھل گئیں۔ وہ خود ہی کہنے لگے۔

’’بچے کو گورنمنٹ کالج لاہور والے بڑی خوشی سے لے لیں گے۔ آپ اسے میرے پاس لے آئے ہیں وہاں داخل کروا دیں۔‘‘

میں نے جواب میں کہا۔

’’ٹھیک ہے میں داخل کروا دیتا ہوں، لیکن گورنمنٹ کالج لاہور کا پرنسپل اس کا چچا تو نہیں ہے، جو اس پر خصوصی توجہ دے گا۔‘‘

ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور بولے۔

’’اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یہ بچہ میرا سب سے قابلِ فخر طالب علم ہوگا۔ اور انشاء اللہ کالج کا نام ضرور روشن کرے گا۔‘‘

اُنہوں نے بچے کو کالج میں داخلہ دیا اور کہا ساری فیس معاف کرتا ہوں۔ میں نے فیس کی معافی سے انکار کر دیا۔ یوں تو بیٹا کسی مضمون میں کمزور نہ تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اُس کے لیے ہر مضمون میں ٹیوشن کا بندوبست کر دیا۔ اس ٹیوشن کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایف ایس سی میں کالج میں اول تھا اور بورڈ میں اس کی دسویں پوزیشن تھی۔ اب خیال تھا کہ اسے انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے لاہور بھیجوں۔ لیکن مجبوراً گھر سے نزدیک ہونے کی بنا پر ٹیکسلا میں داخل کرا دیا۔

یہی حال بچیوں کا تھا۔ انگریزی زبان پر عبور حاصل تھا لیکن اردو میں اُن کی حالت ایک ان پڑھ کی تھی۔ ایک روز چھوٹی بچی کو کالج ٹیچر نے کھڑے ہو کر سبق پڑھنے کا کہا۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیچر نے دوبارہ کہا۔

’’خاموش کیوں کھڑی ہو، پڑھو۔‘‘

پروفیسر صاحبہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ٹیچر نے وجہ دریافت کی تو اُس نے بتایا کہ وہ اردو نہ تو پڑھ سکتی ہے اور نہ ہی لکھ سکتی ہے۔ ٹیچر بہت پریشان ہوئی۔ اُس نے اردو سے ناواقفیت کی وجہ جاننے کے لیے دونوں بہنوں کو سٹاف روم میں بلایا۔ حقیقت جاننے کے بعد اُن سے کہا کہ وہ سوموار سے اردو کی پہلی جماعت کا قاعدہ لے کر کالج میں آئیں۔ بچیاں دوسرے روز ہی پہلی جماعت کا قاعدہ لیے ٹیچر کی خدمت میں پیش ہوگئیں۔ اُس نے بتایا کہ وہ اُنہیں زیادہ وقت تو نہ دے سکے گی۔ البتہ وہ ان کی رہنمائی ضرور کرے گی۔ خود لائبریری میں بیٹھ کر پڑھیں اور کاپی پر لکھیں۔ ایک ماہ میں وہ ساتویں جماعت کی کتاب پڑھنے کے قابل ہوگئیں تلفظ اکثر غلط ہوتے۔ زیر، زبر پیش اور شد اور مد پڑھنے کا علم نہ تھا۔ اب وہی ٹیچر روزانہ دونوں بچیوں کو کلاس روم میں کھڑے ہو کر اگلا سبق پڑھنے کا حکم دیتیں۔ اکثر لفظوں کا تلفظ اور معنی بچیوں کو نہ آتے تھے۔ اِیسے الفاظ کے معنی سمجھنے کے لیے بچیاں پروفیسر صاحبہ سے ہر اُس لفظ کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی درخواست کرتیں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ بچیاں شاید اردو میں ناکام ہو جائیں۔ لیکن خُدا کا شُکر ادا کیا کہ بچیوں نے اردو میں ایف۔ ایس۔ سی میں ساٹھ فیصد نمبر حاصل کیے۔ بی۔ اے کرنے کے بعد ایک بچی نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے داخلہ لیا اور دوسری نے ایم۔ اے انگریزی۔ دونوں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوئیں تھیں۔ میں نے بچوں کے لیے درمیانہ درجہ کے اداروں کا انتخاب ذاتی تعلقات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کیا۔ بڑی بچی نے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد سی۔ ایس۔ ایس کے امتحان کی تیاری کا علان کر دیا۔ اِس کی چھوٹی بہن جس نے قانون کی ڈگری لی تھی اُس نے بھی سی ایس ایس کا فارم منگوا لیا اور دونوں نے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ بیٹا ابھی اپنی تعلیم مکمل نہ کر پایا تھا لہٰذا وہ خاموش رہا۔ سی ایس ایس کا امتحان نومبر، دسمبر میں ہوتا تھا ابھی بچیاں امتحان دینے کی تیاری کر رہی تھیں کہ حکومتِ پاکستان نے بنکنگ (Banking) فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے قیام کا فیصلہ کیا۔ بنکنگ سروس کے امتحانات سی ایس ایس کے معیار کے عین مطابق تجویز ہوئے۔ بڑی بچی نے تو کوئی امتحان نہ دیا۔ اُسے حسبِ خواہش پاکستان کی ایک ایرویز کمپنی میں اچھی اور باوقار ملازمت مل گئی۔ دوسری بچی نے سی۔ ایس۔ ایس کا امتحان پوری تیاری سے دیا۔ اس امتحان کے فوراً بعد بنکنگ فیڈرل پبلک سروس کمشن کے مقابلہ کا امتحان بھی دے دیا۔ دونوں مقابلہ کے امتحانات تھے۔ دونوں کا معیار

ایک جیسا تھا۔ پہلے سی۔ایس۔ایس کے نتیجے کی اعلان ہوا۔ چند دن بعد بنکنگ سروس کمیشن کے نتیجہ کی اطلاع آئی۔ بچی دونوں امتحانات میں کامیاب تھی۔ بچی کو انٹرویو کے لیے میں نے کئی بار گھر میں ریہرسل کروائی کہ کمرہ انٹرویو میں کیسے داخل ہونا چاہیے، ممکنہ سوالات کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے موزوں ترین جوابات کیا ہونے چاہیں۔ جب وہ پہلی بار انٹرویو کی ریہرسل کے لیے ڈرائنگ روم میں آئی تو اُس پر نفسیاتی اثر بہت زیادہ تھا۔ اِسی طرح آسان سوالوں کے جوابات بھی اعتماد سے نہ دے سکتی۔ تاہم تیسرے اور چوتھے روز درست جوابات کے علاوہ اِس کا طرزِ تکلم بھی کافی پر اعتماد ہو گیا۔ انٹرویو دونوں کمیشنوں میں دیا۔ سی ایس ایس کے امتحان میں اُس کی پوزیشن دور تھی زیادہ سے زیادہ ڈاکخانہ یا ریلوے کی ہی آفر آ سکتی تھی۔ البتہ بینکنگ میں وہ ٹاپ ٹین میں سے تھی۔ اُس کو نوکری کی آفر ہوئی کہ سٹیٹ بنک یا نیشنل بنک میں جائن کرو۔ اس نے پہلے سٹیٹ بنک جائن کیا، لیکن ماحول میں گھٹن محسوس کرتے ہوئے مستعفی ہونے کا عندیہ دیا۔ میں اپنے کالج کے ہم جماعت سے کراچی میں ملا جو حکومت پاکستان کے ایک اعلی عہدے پر فائز تھا۔ اس نے بچی کو نیشنل بینک آف پاکستان جوائن کرنے کی اجازت دلوا دی۔

اِسی طرح بیٹے نے جب مقابلہ کا امتحان دیا تو اس نے میرے ساتھ بیٹھ کر انٹرویو کی ریہرسل تو نہ کی تاہم انٹرویو سے پیشتر وہ بہت سی کتابیں پڑھنے کے لیے لے آیا۔ رات ہم دونوں ایک ایک کتاب لے لیتے۔ بیٹا رات کو کتاب مشکل سے ہی ختم کر سکتا۔ میرا کتاب پڑھنے کا اپنا ایک طریق کار تھا۔ ہر کتاب میں اسکی ضخامت کو بڑھانے کے لیئے موضوع سے ہٹ کر بہت سا مواد ہوتا ہے، وہ میں چھوڑ دیتا۔ دوسری صبح میں بیٹے کو بتلا رہا ہوتا، کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے۔ اتفاق سے رچرڈ نکسن کی کتاب میرے حصہ میں آ گئی۔ میں نے پہلے اُس کی ترتیب دیکھی پھر دیباچہ پڑھا اور اُس کے بعد وہ باب پڑھے جو موضوع کو واضح کرتے تھے۔ اس کے علاوہ نیٹو کے متعلق ایک تفصیلی باب بھی تھا جو تقریباً چوتھائی کتاب بنتا تھا۔ یہ باب میں نے مکمل چھوڑ دیا اور بیٹے کو اس کی وجہ بتائی، کہ سرد جنگ ختم ہو چکی، روس اور امریکہ کا ریاستی مقابلہ ختم ہو چکا۔ اس کتاب میں نیٹو کے متعلق لکھے گئے ابواب کو قصہ پارینہ سمجھ کر ترک کر دو۔

''رچرڈ نکسن نے اپنی کتاب میں پاکستان کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ دُنیا میں ترکی اور جاپان کے درمیان صرف پاکستان ہی ایسا ملک ہے جس کی دوستی پر ہم اعتماد کر سکتے ہیں''۔

جب انٹرویو ہوا تو چیئرمین نے حسنِ اتفاق سے ابتدائی سوالوں میں رچرڈ نکسن کے خیالات کے متعلق سوال کیا کہ اس نے پاکستان سے تعلقات کو کس وجہ سے اہم قرار دیا بیٹے نے وہی جواب بڑے اعتماد سے دیا جو میں نے اِس کو بتایا تھا، بعد ازیں دوسرے ممبر نے نیٹو کی ماہیت اور اُس کی افادیت پر سوال کیا، بیٹے نے جواب میں اس کو بڑے اعتماد سے بتایا۔ کہ اب دُنیا دو حصوں میں منقسم نہیں ہے لہٰذا نیٹو عملی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ نتیجہ آنے پر معلوم ہوا کہ بیٹے کی پوزیشن امتحان میں پہلے بیس امیدواروں میں سے ایک تھی۔ چنانچہ بیٹے کو اس کی خواہش کے مطابق پولیس کے محکمہ کے لیے منتخب کر لیا گیا۔

چھوٹی بچی کوکب نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب شروع کیا۔ میں بضد تھا ہاؤس جاب کی بجائے سی ایس ایس کی تیاری کرے مگر وہ مریضوں کو دیکھنا ایک کارِ ثواب سمجھتی۔ ایک روز وہ چھتیس گھنٹے کی ڈیوٹی ختم کر کے گھر آ رہی تھی۔ کہ ایکدوسرے وارڈ کے پاس سے گذری وہاں چند عورتیں نوحہ کناں تھیں۔ بچی وارڈ میں چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک مریض موت و حیات کی کشمکش میں ہے۔ اس کی طبی (Clinicle) موت ابھی واقع نہ ہوئی تھی۔ مریض کے اہل خانہ نا امید ہو کر رو رہے تھے۔ بچی ڈیوٹی ڈاکٹر کے پہنچنے تک مصنوعی سانس(underventilation) دے کر ہوش میں لے آئی۔ بچی کو اس واقعہ پر بڑا فخر تھا کہ اُس کی بروقت مدد سے مریض کو نئی زندگی مل گئی تھی۔ لیکن میں پھر بھی بضد تھا کہ سی۔ایس۔ایس میں زندگیاں بچانے کے کافی مواقع ملیں گے۔ آخر تمام گھر والوں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ سی۔ایس۔ایس کا امتحان ضرور دے۔ اس نے گھر میں موجود کتب، بڑی بہنوں اور بھائی سے رہنمائی حاصل کر کے امتحان نمایاں کامیابی سے پاس کر لیا۔ بچی نے انٹرویو کی تیاری کے لیے بار بار ریہرسل کی۔ اِسے اپنے کسی جواب پر اعتماد نہ تھا۔ اُلٹا مجھ سے سوال کرتی، کہ اِس کا موزوں ترین جواب کیا ہو سکتا ہے؟ تین چار دن کی ریہرسل کے بعد اس میں اعتماد پیدا ہو گیا۔ اس کے جواب دینے اور طرزِ تکلم میں قابل ستائش حد تک بہتری آ گئی۔ میں نے بچی کو اسی وقت بتا دیا کہ بیٹا انشاءاللہ تمہاری پوزیشن پورے پاکستان میں اول ہو گی۔ چند دنوں کے بعد نتیجہ کا اعلان ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے میری عزت رکھ لی وہ لڑکیوں میں سے سب سے اول پوزیشن پر تھی اور تمام امیدواروں میں تیسری پوزیشن تھی۔ بچی کو تربیتی کورس کے دوسرے نصف میں گروپ لیڈر بننے کا

اعزاز حاصل ہوا۔ اختتامی تقریب میں الوداعی تقریر گروپ لیڈر کو کرنی تھی۔ اُس نے الوداعی تقریر لکھ کر مجھے پڑھنے کو دی۔ میرے مشورہ کے بعد اس نے کچھ طنزیہ فقرے حذف کر دیئے اور تقریر کا مسودہ منظوری کے لیے انتظامیہ کو پیش کر دیا۔ انتظامیہ نے تھوڑی ردوبدل کے ساتھ اس کو منظور کر لیا۔ اور بجی نے وہی تقریر پڑھ دی، جس میں ایک پیرا گراف کو بڑی پذیرائی ملی وہ کچھ اِس طرح سے تھا۔

''جب ہم پہلے روز اکیڈمی میں آئے تو ہم اپنی قومیت اور انفرادیت پر بڑے نازاں تھے۔ ہم سب ایک دوسرے کی قومیت کو بڑی آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ سب کی آنکھوں کی چمک مختلف تھی آج ایک سال کی ٹریننگ کے بعد ہم ایک نئے جذبہ لیئے جا رہے ہیں۔ لباس تو سب نے اپنی اپنی قومیت کا پہن رکھا ہے، لیکن اب ہم میں نہ کوئی پنجابی ہے نہ پٹھان، سندھی نہ بلوچی، آج ہم سب پاکستانی ہیں۔''

کٹاس راج

جس وقت مجھے کٹاس میں جائن کرنے حکم دیا گیا۔ اس گورنمنٹ کالج کو قائم ہوئے دس سال گزر گئے تھے۔ لیکن یہاں پر میرے مضمون میں کوئی پروفیسر اس دن تک بھیجا نہ گیا تھا۔ کٹاس میں سہولیات کا فقدان تھا۔ میری تو مجبوری تھی۔ جس دن سے میں کٹاس میں جائن کرتا، مجھے تنخواہ اس دن سے ملنی شروع ہوتی۔ ملازمت پر بحال ہونے کے لیئے اسی روز کٹاس چلا گیا۔

کٹاس شہر تو نہ تھا۔ البتہ پانچ چھ گاؤں کے درمیان واقع ایک چھوٹے سے تالاب نما چشمہ آب کو کٹاس جھیل کا نام دیا گیا تھا۔ ہندو مذہب میں متھرا جو کرشن چندر مہاراج کا جائے پیدائش ہے۔ اور بنارس جہاں سے انہوں نے ہندومت کا پرچار شروع کیا، کے بعد یہ ہندو مذہب کا ایک متبرک تریں مقام مانا جاتا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ اس جھیل کا اصل منبع چشمہ ویرای ناگ ہے جو ہندومت کے مقدس تریں دریائے گنگوتری کا منبع ہے۔

کٹاس سنسکرت کے لفظ کٹشکا کا مخفف ہے۔ جس کے لغوی معنی آنسو کے ہیں۔ کٹاس جھیل کی ابتدا ہندوٗروایت کے مطابق، ان کے سب سے افضل دیوتا 'شوا' کے رونے سے ہوئی۔ وہ اپنی بیوی کی وفات پر اس کے غم میں بہت رویا۔ دیوتاؤں نے اس کے دکھ کو کم کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن

'شوا' کے غم میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ 'شوا' اپنی بیوی 'ستی' کی لاش کو لے کر آسمان کی جانب اُڑ گیا۔ آسمان پر پہنچنے کے بعد بھی بیوی کے غم میں آنسو بہاتا رہا۔ اس کے دو آنسوں آسمان سے زمین پر گرے ان میں ایک آنسو کٹشکا دوسرا اجمیر کے پاس پوکھران کے مقام پر گرا۔ دونوں جگہوں پر ایک ایک جھیل نمودار ہو گئی۔

ہندو پنڈتوں کا کہنا تھا۔ کہ اس چشمہ آب کا اصل منبع چشمہ ویری ناگ ہے جو دریائے گنگوتری کے علاوہ بہت سے دریاوں کا منبع ہے۔ اس چشمہ کا پانی زیر زمیں یہاں آ کر نمودار ہوا۔ ان دنوں یہ علاقہ سلطنت کشمیر میں شامل تھا۔ مہاراجہ کشمیر جو ہندومت کا پیروکار تھا، نے بھی کٹاس جھیل کے کنارے اپنے لیئے ایک محل تعمیر کروایا۔

مہاراجہ ہر سال اپریل کے ابتدائی دنوں جس دن سورج برج حمل سے برج حوت میں داخل ہوتا۔ یہاں عبادت کے لیے آتا۔ ہندو اپنے عقیدہ کے مطابق اس جھیل کے پانی میں نہاتے، جس سے ان کے تمام پاپ جھڑ جاتے۔ اور وہ پوتر ہو کر جھیل سے باہر نکلتے۔

تقسیم ہند کے فوراً بعد میں ایک بار چوہا سیدن شاہ کے میلہ پر جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تو مندر دیکھنے کٹاس چلا گیا تھا۔ اس وقت تک ''ست گھرا'' نامی مکان اپنی اصلی حالت میں قایم تھا۔ اور اس کے ہر دروازہ کے باہر ہندومت کے کسی رشی (بزرگ ہستی) کا بت رکھا تھا۔ اور جھیل کے اندر سفید سنگ مرمر سے بہت سی سیڑھیاں دور تک بنی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر ہر عطیہ دینے والے کا نام کندہ تھا۔ ان دنوں درمیال گاوں سے چوہا سیدن شاہ جانے کے لیے سڑک کٹاس راج کے سامنے پچاس گز کے فاصلہ سے گزرتی۔ جھیل تک رسائی کا وہی ایک راستہ تھا۔ مشرقی جانب جھیل کے کنارے ایک مندر اور مغرب میں مہاراجہ کشمیر کا محل بنا تھا۔ جھیل کو تین اطراف سے مندر، محل اور پہاڑی نے گھیر رکھا تھا۔ اس وقت مندر اور جھیل کو دور سے ہی دیکھ سکا، خواہش کے باوجود مندر کے اندر نہ جا سکا۔ میرے ساتھی چوہا سیدن شاہ پہنچنے کی جلدی میں تھے۔ دیر ہو جانے کی صورت میں انہیں رہائش کے لیے معقول جگہ نہ مل سکتی۔ پہلی بار جب میں یہاں آیا تو ست گھرا اور جھیل اپنی اصلی حالت میں قایم تھے۔ ہر طاق میں بت سجے تھے۔ میں مندر کے اندر نہ جا سکا تھا۔ تاہم خدمت گذاروں کی عدم موجودگی کے باوجود اس جگہ کو دیکھ کر ایک پاکیزہ عبادت گاہ کا احساس ہوتا۔ پینتیس سال کے بعد میں دوبارہ ملازمت کے سلسلہ میں یہاں آیا تو دیکھا کہ مناسب دیکھ

بھال نہ ہونے کی وجہ سے سنگ مرمر کی تمام سیڑھیاں، ست گھرا کے تمام دروازے کھڑکیاں چھت کے بالے اور شہتیر غائب تھے۔ 'ست گھرا' کے اندر مٹی کے ڈھیر لگے تھے۔ اب وہی پاکیزہ جھیل ایک گندے جوہڑ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ اب جانور ہی اس کا پانی پیتے اور جھیل کو ناپاک کر رہے تھے۔ انیس سواسی کی دہائی میں ہندو یاتریوں کی آمد کے بعد محکمہ اوقاف نے اس جھیل اور مندر کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس چشمہ آب سے غلاظت کے ڈھیر نکال کر اس کو دوبارہ پاکیزہ کر دیا۔ مندر اور اس کے محافظ پنڈتوں کی رہایشی بلڈنگ کے درمیان سے پہاڑی کو کاٹ کر ایک پختہ سڑک بنا دی گئی۔ پختہ سڑک بن جانے سے درمیال تک کا راستہ زیادہ طویل ہو گیا۔ ایک فرلانگ کے بعد پختہ سڑک ایک دائرہ کی صورت میں دوبارہ چوہا سیدن شاہ جانے والی سڑک سے جا ملتی ہے۔

ایک گوالہ جو مجھے روزانہ دودھ فروخت کرنے آتا نے بتایا۔

''جب ہندو یہ مندر چھوڑ کر جا رہے تھے۔ تو اس کے والد مندر کے خدمت گزار پنڈتوں کو رخصت کرنے خاص طور پر گاوں سے آئے۔ ہندو پجاریوں کا بڑا پنڈت جانے سے پیشتر ابا کے گلے ملا۔ دونوں رخصت ہوتے وقت رو رہے تھے۔ ابا نے اسے تسلی دی۔ کہ یہ صرف چند دنوں کی بات ہے۔ اللہ نے چاہا تو حالات بہت جلد پرسکون ہو جائیں گے۔ اور آپ لوگ واپس لوٹ آئیں گے۔''

اسی نے بتایا کہ ست گھرا کے مرکزی دروازہ کے باہر ایک بت تھا۔ جس میں ایک خوب صورت مرد ایک جوان لڑکی کو اُٹھائے چاند پر بیٹھا ہے۔ لڑکی کے دونوں بازو اور ٹانگیں زمیں کی جانب لٹک رہی ہیں۔ ایک چوہے کے سر والا بت لڈو کی مٹھائی لیے ایک طاقچے میں رکھا تھا۔ ایک اور طاق میں رکھا بت ایک 'توتڑی' (بانسری) بجا رہا تھا۔ دوسرے طاقچے میں ہاتھی کے سر کے ساتھ ایک موٹے بچے کا دھڑ جڑا بت رکھا تھا۔ اسی نے ایک روز بڑے فخر سے بتایا کہ کچھ عرصہ کے بعد ہم گاوں کے بہت سے لڑکے کلہاڑیاں لیکر یہاں آئے اور تمام بت توڑ دیئے۔

ایک روایت کے مطابق پانڈو بھائیوں کا مسکن بھی کٹاس تھا۔ انہوں نے اپنی اکلوتی بیوی یہاں جوا میں کورو بھائیوں کو ہار دی تھی۔ ایک اور ہندو روایت کے مطابق رام چندر جی نے بن باس گزار کر واپسی پر کٹاس آئے تھے اور پھر یہاں سے اجودھیا گئے۔ رام چندر جی اسی پہاڑی پر

بیٹھے تھے کہ رام چندر جی کی بیوی سیتا جی نے گنگا اشنان کا مطالبہ کیا۔ رام چندر جی نے ایک چٹان کو ہاتھوں سے اٹھایا تو وہاں سے جھیل کا یہ پانی بہہ نکلا۔ ان کا فرمان تھا کہ اس کا پانی زیر زمین دریائے گنگوتری کے منبع چشمہ وری ناگ سے آ رہا ہے۔

جھیل کے مغرب میں بدھ مذہب کا ایک بڑا مندر اور چند کوس کے فاصلہ پر بدھ مت کی ایک یونیورسٹی کے کھنڈرات ہیں۔ فاہیان نے اپنی سفر نامہ میں تحریر کیا ہے کہ ایک اور یونیورسٹی ٹیکسلا سے ایک سو دس 'لی' (چین کے ایک کلو میٹر سے کم فاصلہ کا نام) فاصلہ پر قائم ہے۔ یہ یونیورسٹی ہر جانب پہاڑوں کے درمیان گھری ہے۔ یہاں بدھ بھکشو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے اور شاگردوں کو بدھ مت کی تعلیم دیتے ہیں۔ عملی تعلیم کے لیئے بیس بائیس کے قریب غاریں بھی ایک میل کے فاصلہ میں بنائی گئی تھیں۔ جو ابھی تک موجود ہیں۔ ان غاروں کی ہمسائیگی میں ایک گاوں جس کا نام گھانوالہ ہے، اس نسبت سے آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ البیرونی نے بھی کٹاس میں کچھ وقت صرف کیا۔ اُس نے یہاں زبانوں کی یونیورسٹی سے سنسکرت سیکھی۔ البیرونی نے اپنی معروف کتاب 'کتاب الہند' کا کچھ حصہ یہاں رہ کر تحریر کیا۔

میں ایک سال ہی کٹاس میں رہ سکا۔ اور تبادلہ راولپنڈی کروالیا۔ یہ میرا پرانا کالج تھا، میں جب نائجیریا گیا تھا، تو ایک فٹ بال ٹورنامنٹ کا روح رواں تھا۔ جو میری غیر حاضری میں ختم ہو گیا۔ میں نے آتے ہی ٹورنامنٹ ٹرافی کو تلاش کیا۔ وہ ایک پرنسپل صاحب کے دفتر کی زینت تھی۔ میں جا کر ان سے لے آیا اور اپنے پرنسپل صاحب سے ٹورنامنت کو دوبارہ شروع کرنے کی اجازت چاہی۔ انھوں نے اس تجویز کو بہت سراہا اور کہا کہ فلاں صاحب سے جو چیرمین سپورٹس بورڈ تھے سے بات کروں۔ ان سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔ البتہ فلاں صاحب فٹ بال ٹیم کے پریذیڈنٹ ہیں ان سے اس موضوع پر بات کریں۔ ان سے بات ہوئی تو انہوں نے کوئی حامی نہ بھری اور کہا کہ آپ کو جو کرنا ہے کریں۔ میرے پاس ٹورنامنٹ کروانے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ میں بہت دل برداشتہ چیرمین سپورٹس بورڈ سے ملا۔ انہوں نے بتایا کہ جب آپ پاکستان سے گئے تھے تو ہر پروفیسر شام کو فارغ ہوتا تھا، حالات وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے۔ تنخواہوں میں تو مکان کا کرایہ ہی ادا ہوتا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ ایک ماہ کی تنخواہ ہفتہ بھر میں ختم ہو جاتی ہے۔ میں تو آپ کے ساتھ ہوں لیکن کوئی اور شام کو فارغ نہیں

ہوتا۔ بہتر ہے کہ آپ اس ٹورنامنٹ کا خیال چھوڑ دیں۔ اور اپنے تعلقات دیگر پروفیسر صاحبان سے خراب نہ کریں۔ میں خاموشی سے جا کر وہ ٹرافی واپس کالج کے پرنسپل صاحب کو دے آیا۔

اسلام آباد سٹاک ایکسچینج

حکومت پاکستان نے لاہور اور کراچی کے بعد تیسری سٹاک ایکسچینج کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اور تمام اضلاع کی چیمبرز سے درخواستیں بھی طلب کر لیں۔ اسلام آباد اور راولپنڈی کے علاوہ کوئٹہ، فیصل آباد اور پشاور، تمام اضلاع سٹاک ایکسچینج قائم کرنے کے خواہشمند تھے۔ کارپوریٹ لاء اتھارٹی نے کوئٹہ فیصل آباد اور دیگر درخواست دہندگان کی درخواستوں کو بوجوہ انکار کر دیا۔ میدان میں دو چیمبرز اسلام آباد اور راولپنڈی رہ گئے۔ عدالت نے ان کو بھی افہام وتفہیم سے کام کرنے کی ہدایت کی۔

سٹاک ایکسچینج کی خبر کے ساتھ ہی میں نے سٹاک ایکسچینج پر کتاب لکھنی شروع کر دی۔ ٹائپسٹ کی جز وقتی خدمات حاصل کر لیں۔ ترتیب اور موضوعات مختلف کتابوں سے لیے، پاکستان سٹاک ایکسچینج مارکیٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے اس ترتیب کے مطابق انگریزی زبان میں کتاب لکھی۔ 'How can you benfit from Stock exchange'۔ نئی کتاب تھی سب نے اسے پسند کیا۔ اور اس کے صلہ میں مجھے نئی قائم ہونے والی اسلام آباد سٹاک ایکسچینج کی ممبر شپ دی گئی۔

اسلام آباد سٹاک ایکسچینج یکم اگست انیس سو بانویں کو کھول دیا گیا۔ عوام کو سٹاک مارکیٹ سے روشناس کرنے کے لیئے ہم آئے روز عوام کی ایک میٹنگ بلاتے۔ اور سوال وجواب کا سیشن ہوتا۔ بہت سے لوگ اپنی کم علمی کی بنا پر سٹاک مارکیٹ کو ایک جواء خانہ سمجھتے۔ ایک میٹنگ میں سامعین نے سوال جواء خانہ ہونے کے متعلق کر دیا۔ چیرمین نے وہ سوال میری جانب اُچھال دیا۔ میں نے سوال کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جواء اس عمل کو کہتے ہیں۔ جس میں فیصلہ عقل سے ماوراء ہو۔ جہاں پر کوئی کسی قسم کی پیش گوئی نہ کی جا سکتی ہو۔ میں نے کہا کہ قسمت کوئی چیز نہیں ہر کام پلاننگ کے مطابق کیا جانا چاہیے۔ اچھی پلاننگ کامیابی کی ضامن ہوتی ہے اور بری پلاننگ ناکامی کا موجب بنتی ہے۔ حقایق کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ کیا جائے تو کامیابی کی جانب قدم ہوگا اور اگر

حقایق سے ماورا فیصلہ کیا جائے تو کامیابی ضروری نہیں۔ جوا تو ہر جگہ کھیلا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا کہ سٹاک ایکسچینج جوا خانہ ہے سراسر زیادتی ہوگی۔ سٹاک ایکسچینج دیگر بازاروں کی طرح کا ایک بازار ہے۔ جہاں پر آٹا دال چاول فروٹ اور کپڑا نہیں بلکہ کپڑا بنانے والی اور دیگر فیکٹریوں کے حصص فروخت اور خرید کیئے جاتے ہیں۔

سٹاک مارکیٹ کو حصص کی مارکیٹ کی بجائے سٹاک مارکیٹ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت اس کے تشکیل پانے میں ہے۔ ابتدا میں تاجر اپنا تجارتی سامان خچر پر لاد کر ملک ملک جاتے۔ ایک ملک سے خرید کردہ اشیاء دوسرے ملک میں فروخت کرتے۔ بحری جہاز پر سامان لیکر جاتے اور ہر تاجر کو اسکے جمع کیے گئے سٹاک کی ایک رسید دیتے، جسے سٹاک سرٹیفیکیٹ کہتے۔ ایسے سرٹیفیکیٹ ہولڈر اکثر جہاز کی خیریت اور اس کی واپسی کی خبریں سننے کے لیئے کمپنی کے دفتر میں آ کر گھنٹوں بیٹھتے۔ بعض اوقات سٹاک سرٹیفیکیٹ ہولڈر ضرورت پڑ جانے پر اپنے سٹاک کے سرٹیفیکیٹ فروخت کے لیے کمپنی کے دفتر میں پیش کر دیتے۔ کمپنی نمائیدگان جہاز کی واپسی کی مدت اور اس کے پچھلے منافع کو مدنظر رکھ کر اس کی نئی قیمت کو متعین کر دیتے۔ چنانچہ سرٹیفیکیٹ متعین شدہ قیمت کے مطابق فروخت کیے جانے لگے۔ اس طرح سٹاک سرٹیفیکیٹ کی پہچان ہونے لگی۔ کمپنی کی انتظار گاہ جہاں یہ سرٹیفیکیٹ ہولڈر اکٹھے ہوتے کو سٹاک ایکسچینج کا نام دیا گیا۔ اس طرح سٹاک سرٹیفیکیٹ اور سٹاک ایکسچینج وجود میں آ گئے۔

اسلام آباد میں کھلنے والی سٹاک ایکسچینج کے بورڈ آف ڈائیریکٹرز نے ممبر شپ کے لیے درخواستیں طلب کر لیں۔ جس میں دیگر شرائط کے علاوہ ایک شرط ٹیکس ایبل آمدن تھی۔ میں نے ممبر شپ انٹرویو کے دوران سٹاک ایکسچینج پر اپنی کتاب پیش کر دی، بورڈ نے کتاب کی اچھی طرح سے چھان پھٹک کی۔ سیلیکشن بورڈ نے کتاب کو مدنظر رکھ کر مجھے بھی ممبر چن لیا۔

پہلے سال میں نے کتاب میں تحریر کردہ ان تمام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اکیلے کام کیا۔ پہلے سال کا منافع چھتیس لاکھ روپیہ تھا۔ اس منافع کا سنتے ہی گاہکوں کی ایک لائن لگ گئی۔ نئے آنے والے گاہک زیادہ تر لاکھوں کا نقصان اٹھائے لوگ تھے۔ وہ جلد سے جلد اپنا نقصان پورا کرنے یا زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے اور جلد امیر ہونے کی خواہش لیے ہوئے تھے۔ زیادہ گاہکوں نے لالچ میں بڑے بڑے سودے کرنے شروع کر دیے۔ ایک صاحب کو

صرف ایک سودے پر تقریباً چالیس ہزار کا منافع تھا۔ میں نے اسے کئی بار رائے دی کہ وہ منافع حاصل کرلے۔ لیکن وہ زیادہ منافع کی لالچ میں تھا۔ اچانک سٹاک مارکیٹ نے ایک افواہ کے زیراثر مندی کی جانب رخ موڑ لیا۔ ہر شخص اپنا شیئر فروخت کر رہا تھا۔ مارکیٹ نے رکنے کی بجائے گرنے کا سفر تیزی سے اختیار کیا۔ بہت سے گاہک اپنے سرمایہ سے محروم ہوکر گھر چلے گئے۔ مارکیٹ نے تمام حدیں فارمولے اور اندازے غلط ثابت کر دیئے۔ بہت سے ممبران دیوالیہ ہو گیئے۔ مجھے بھی ممبر شپ اونے پونے فروخت کرنی پڑ گئی۔اور سٹاک مارکیٹ سے باعزت باہر آ گیا، اللہ کا شکر ادا کیا کہ عزت رہ گئی۔

رشتوں کی تلاش

ابھی ان مسائل سے چھٹکارا نہ پایا تھا کہ ایک اہم مسئلہ عفریت کی طرح سامنے آیا۔ وہ بچوں کے لیے مناسب اور ہم پلہ رشتوں کی تلاش کا تھا۔ برادری میں موجود تمام رشتے میرے بچوں کے نہ تو ہم پلہ اور نہ ہی مناسب رہے تھے۔ کوئی ایف اے پاس تھا تو کوئی ابھی ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اکثر احباب یہ دلیل دیتے کہ ایک ایم اے پاس پروفیسر کا ایک میٹرک پاس بیوی کے ساتھ گزارہ ہوسکتا ہے۔ تو ایک ایم اے پاس لڑکی کا میٹرک پاس خاوند سے گزارہ بھی ہونا چاہیے۔ میں ایسے حماقت پر مبنی دلائل کو نہ مانتا۔ بچوں کی شادی تو کرنی تھی۔ مجبوراً شادی دفتروں کا سہارا لینا پڑا۔ شادی دفتر والوں نے بہت سے رشتے بھیجے۔ انکے پاس سے بہت سے لالچی لوگ، کھانا اور چائے پینے کے شوقین، رشتہ لینے کا لبادہ اُوڑھے گپ لگانے آجاتے۔ سب کو عزت دی اور بٹھایا۔ روزانہ ہی کوئی نہ کوئی مہمان چائے یا کھانے کے وقت آ رہا ہوتا۔ بہت سے لوگوں کے حلیہ سے آوارگی اور لالچ ٹپک رہی ہوتی۔ ان کو پہچاننے کے باوجود ان کی عزت کی اور انہیں کبھی سخت الفاظ نہ کہے۔ سب کو عزت دی اور بٹھایا۔

فون کی گھنٹی بجتی اور پہلا سوال ہوتا۔ کہ آپ کا گھر کدھر ہے ہم رشتہ دیکھنے آ رہے ہیں۔

ایسا ہی فون آیا اور میں نے دریافت کیا۔

''آپ کون ہیں اور کہاں سے آ رہے ہیں۔''

جواب ملا سٹلائیٹ ٹاون سے آئیں گے۔

''لڑکا کیا کام کرتا ہے۔''

''وہ بیرون ملک ہوتا ہے اگلے ماہ آئے گا''

''بیرون ملک کچھ تو کرتا ہوگا۔''

''ہاں جی آخر کام کرتا ہے پیسہ کماتا ہے۔''

''پچھلے ماہ اس نے آپکو کتنے پیسے بھیجے تھے۔''

''ہمیں تو کچھ نہیں بھیجا۔''

''اچھا پہلے میں آپ کے گھر آنا پسند کرونگا۔''

اور فون بند ہوگیا۔

ایک دفعہ باہر گیٹ سے کسی نے گھنٹی بجائی۔ میں گیٹ پر گیا دیکھا ایک پرانی پچھتر ماڈل ٹویوٹا گاڑی میں دو مرد اور ایک عورت بیٹھے ہیں۔

''جی فرمائیے آپکو کس سے ملنا ہے؟''

''جی آپ سے۔''

''کس سلسلہ میں؟''

''ہم بچی کا رشتہ دیکھنے مردان سے آئے ہیں۔''

''تشریف لائیے۔''

وہ تینوں ڈرائینگ روم میں ایک ہی صوفہ پر بیٹھ گئے۔

تینوں تھکے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

''پیاس لگی ہے اگر پانی مل جائے تو مہربانی ہوگی۔ بڑی پیاس لگی ہے۔''

میں نے نوکر کو بلایا اور اسے تین بوتلیں سیون اپ کی لانے کا کہا۔

خاتون بولی۔

''میری لیئے پیپسی ہوتو بہتر ہے۔''

میں نے نوکر سے پیپسی لانے کا کہا۔

خاتون نے آواز لگائی۔

''ذرا جلدی آنا۔''

”آپ کے گھر فون ہو تو ذرا منگوا دیں۔“

میں خود اندر گیا اور فون اُٹھا لایا۔مرد نے کہیں ایف ایٹ میں ہی فون کیا۔

”ہم ایف ایٹ میں پہنچ گئے ہیں۔بس پانی پی کے آتے ہیں“

اور فون بند کر دیا۔جی میں آیا کہ ان سے کہوں کہ آپ کی بڑی مہربانی آپ پھر کبھی تشریف لائیں۔
لیکن بزرگوں کا قول یاد آ گیا کہ گھر میں اگر بھنگی بھی رشتہ کے سلسلہ میں آئے تو اس کی بھی عزت
کرو۔بوتل پی کر وہ اُٹھے اور فرمانے لگے۔

”ہم نے لڑکی دیکھ لی ہے۔پھر کبھی آئیں گے۔“

اسی روز ایک اور فون آیا۔

”ہم آرہے ہیں۔“

”آپ کون ہیں؟ کہاں سے آرہے ہیں۔“

”راولپنڈی کے پرانے قلعہ سے آرہے ہیں۔میں ڈاکٹر ہوں اور پریکٹس کرتا ہوں۔“

”آپ کتنے لوگ آرہے ہیں۔“

”ہم دو ہونگے میں اور میری بیوی۔“

تھوڑی دیر بعد ایک گاڑی گیٹ پر نمودار ہوئی۔گاڑی سیدھی کینٹی لیور (cantilever) کے
پاس آ کر رکی۔ڈرائینگ روم پیچھے رہ گیا تھا۔وہ ہمارے بیڈ روم تک پہنچ گئے تھے۔ڈاکٹر نے ململ
کی ڈبل کاج والی قمیص پہن رکھی تھی جس میں چاندی کے بٹن لگے تھے۔گلہائی اور کندھوں پر نیلے
دھاگہ سے کڑھائی کی ہوئی تھی۔منہ میں پان اور ہاتھوں میں سگریٹ کی بڑی ڈبیا اور لائیٹر پکڑا ہوا
تھا۔پاوں میں بند منہ والی کروم میں بنی چپل پہنی تھی۔ڈبیا والے ہاتھ میں ایک موٹے نگ والی
چاندی کی انگوٹھی تھی۔ان کی بیوی بڑی سادہ عورت نظر آئی۔آنکھوں میں کاجل اور کانوں میں
سونے کی ایک باریک مندری پہن رکھی تھی۔

سگریٹ کے لمبے کش لیتے ہوئے ،انہوں نے ہوا میں دھوئیں کا ایک بڑا مرغولہ بنایا۔اتنے
میں ملازم چائے اور کیک لایا۔ڈاکٹر صاحب موصوف نے کیک سے ایک ٹکڑا جو کیک کی چوتھائی
کے برابر تھا،کاٹ کر اپنی بیگم کو دیا اور اتنا ہی بڑا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھا اور کھانا شروع کر دیا۔ختم کر
چکے تو میں نے کہا گھبرائیں نہیں اور لیں۔انہوں نے غالبًا دوپہر کا کھانا نہ کھایا تھا۔کیک پر ہی

گزارہ کا موڈ تھا۔ایک اور ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

ان کی بیگم میرا طنزیہ لہجہ پہچان گئی۔جب میں نے ان سے مزید لینے کا کہا۔وہ شرمندہ ہو کر بولی۔

”بس جی مہربانی پہلے ہی بہت زیادہ تھا، میں نے مشکل سے ختم کیا ہے۔“

وہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی ہانکتے رہے۔اور اُٹھ کر چلے گئے۔دوسرے
روز ان کا فون پھر آیا کہ ہم ایک مکان دیکھنے ایف ایٹ میں آرہے ہیں خیال آیا کیوں نہ آپکے گھر
کا چکر لگالیں۔

کچھ دنوں کے بعد ایک اور فون آیا۔

”میں سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج فار گرلز مسز فرید مقبول بات کر رہی ہوں۔مجھے اپنے بیٹے کے
لیے شریف خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔فلاں صاحب نے آپ کا نمبر دیا ہے کہ
آپ سے رابطہ کروں۔“

”جی آپ کا بیٹا کیا کام کرتا ہے۔“

”جی وہ ایم ایس کمپیوٹر سائینس کر رہا ہے اور امریکہ جانے کا خواہش مند ہے۔“

”میں ایف ایٹ کی فلاں گلی اور فلاں نمبر مکان میں رہتا ہوں آپ تشریف لائیں۔“

میں نے جواب دیا۔

مغرب کے قریب فون آیا کہ میں مسز فرید مقبول بول رہی ہوں۔ہم فلاں جگہ پر کھڑے ہیں۔کسی
نوکر کو بھیجیں جو ہمیں یہاں سے آ کے آپ کے گھر تک رہنمائی کرے۔میں خود انہیں لینے چلا گیا وہ
کافی دور کھڑے تھے۔گھر تک پہنچتے پہنچتے مغرب ہو گئی۔باتوں باتوں میں بیگم نے تکلفاً کہا۔

”کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔“

بڑے بے تکلفانہ انداز میں مسز فرید مقبول کہنے لگی۔

”تکلف کی کوئی ضرورت نہیں جو کچھ پکا ہے۔وہی اکٹھے بیٹھ کے کھالیں گے۔“

گرمیوں کے دن تھے ان کے لیے آئس کریم بھی منگوائی۔مسز فرید مقبول کہنے لگی۔

”ونیلا منگوائیں اس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی۔“

انہوں نے آئس کریم خوب لہک لہک کے کھائی۔اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلے گئیں۔چند
دن کے بعد رمضان شروع ہو گیا ان کا فون آیا ہم آرہے ہیں۔کسی قسم کا تکلف نہ کرنا۔آج

ہمارے ساتھ ہمارا بیٹا بھی ہوگا۔ مجبوراً ان کی افطاری کا اور کھانے کا اہتمام کرنا پڑا کرنا پڑا۔ ان کے ہمراہ ان کا بیٹا بھی تھا۔ چھوٹا قد اور سرکندھوں پر فٹ دکھائی دیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرے بڑے بھائی فلاں تاریخ کو آرہے ہیں۔ وہ آپ کے گھر آنا پسند کریں گے، فرمائیں ہم کب آئیں۔ کہنے لگی۔

''کل سے ہم گاوں جارہے ہیں۔ ہم خود آکر آپ کو اطلاع دیں گے۔''

اور ان کی واپس آنے کی اطلاع کبھی نہ آئی۔ اسی طرح کے مفت خورے، کھانے کے شوقین، رشتہ لینے کا لبادہ اُوڑھے کافی تعداد میں آئے، مجبوری تھی انہیں برداشت کرنا پڑا۔ پھر وہ لوگ بھی آئے جو انتہائی شریف اور معزز تھے۔

بیٹیوں کے رشتوں کے معاملہ میں بیٹے کی رائے کو افضل گردانتے تھے۔ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ مجھے نہ تو رشتہ دینا آتا ہے، نہ لینا۔ اس معاملہ میں بیٹا بہتر فیصلہ کرسکتا ہے، جو وہ کہے اسی کو قبول کیا جائے۔

بیٹے کو غلط فہمی ہوگئی کہ وہ اپنے معاملہ میں بھی بہتر فیصلہ کرسکے گا۔ اس معاملہ میں اس کی سوچ سطحی تھی۔ انسانوں کو بھی پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اسے اکیڈمی میں پڑھائی کے دوران ایک لڑکی کے ظاہری اور خوشامدانہ طرز عمل سے غلط فہمی ہوگئی۔ ان میں اور ہم میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ہم زمین کے باسی تھے اور وہ کسی اور سیارہ کی مخلوق تھیں۔

مجھے ان سے پہلی ملاقات میں ہی سمجھ آگئی تھی کہ ہمارا ان سے گزارہ مشکل ہے لیکن بیٹا نہ مانا۔ جب اسے سمجھ آئی کہ اس نے گھریلو زندگی کے راہ رسم کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ تو بیٹے نے اس سے پیشتر کہ دیر ہوجائے علیحدگی اختیار کرلی۔ بچے کی دوسری شادی ایک انتہائی شریف اور معزز خاندان میں کردی۔ اس کے دو انتہائی ذہین اور عقلمند بچے ہیں۔ دونوں میاں بیوی خوش باش اور پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

جوں جوں معقول اور ہم پلہ رشتے ملتے گئے بچوں بچیوں کی شادیاں کرتا گیا۔ بیٹے، ایک بھتیجی اور بھانجے کی شادی دو دفعہ کرنی پڑی۔ بھتیجے کی شادی تیسری بار کامیاب ہوئی۔ آج سب اپنے اپنے گھروں میں ہنسی خوشی رہ رہے ہیں۔ بڑے بھائی کا ایک بچہ غیر شادی شدہ تھا۔ اس کی بھی شادی کروادی ہے۔ بھانجے بھتیجے سب شادی شدہ ہیں بلکہ چند کے بچے بھی دادا بن گئے ہیں۔

صد سالہ برتھ ڈے

میرے پچانوے فیصد ہم عصر اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔ جسم کے سب نظام اور اعضا کمزور ہوگئے ہیں۔ ٹانگوں میں جسم کا بوجھ اُٹھانے کی سکت نہیں رہ گئی۔ غصہ بہت جلد آجاتا ہے۔ نروس سسٹم کمزور ہوگیا ہے۔ یاداشت بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔ ملازمین کو سودا سلف کیلئے پیسے دیکر بھول جاتا ہوں کہ کتنے روپے دیئے تھے۔ ہر بچے کو اس کی آواز سے پہچانتا ہوں۔ اکثر بچوں کے نام بھی بھول جاتا ہوں۔ کئی باریوں بھی ہوا کہ کسی بچے کو بلایا جب وہ آیا تو اس وقت تک بھول چکا ہوتا ہوں کہ کیوں بلایا تھا۔ نظر تو عرصہ دراز ہوا ختم ہوگئی دونوں آنکھوں کا اپریشن تین بار کروایا ہے لیکن آنکھوں میں بادلوں کا جھنڈا ابھی تک موجود ہے۔ ایک آنکھ میں کہیں کہیں بادل چھٹے ہیں راستہ دیکھائی دے جاتا ہے اور چشمہ لگا کر اس خلاء کے اندر سے دو تین سطر اخبار کی پڑھ لیتا ہوں۔ چھڑی کے علاوہ کسی اور شخص کا سہارا لیکر چل لیتا ہوں۔ چند قدم چلتا ہوں تو گھٹنے مڑنے لگ جاتے ہیں۔ بڑی مشکل سے زیادہ سے زیادہ ایک فرلانگ چل سکتا ہوں۔ نماز کرسی پر بیٹھ کر پڑھتا ہوں۔ جمعہ کی نماز میں پہلی رکعت میں جماعت میں کھڑا ہو کر شامل ہوجاتا ہوں اور رکوع کے بعد کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں، گھٹنے دوہرے نہیں کرسکتا، سجدہ کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔

اگلے روز ایک بچے نے سوال کیا۔

''آپ دانتوں کو نکال کر دھو لیتے ہیں۔ لیکن میں نہیں نکال سکتا۔ یہ دیکھیں اس نے اپنے منہ میں سے دانت نکالنے کے لیئے اپنے انگوٹھہ سے زور لگایا۔''

''پچاس سال پہلے میرے بھی نہیں نکل سکتے تھے۔''

''آپ اب نوے سال کے تو ہونگے۔''

''نہیں بیٹا پچانویں کہو''

وہ خوشی سے تالیاں بجاتے بولا۔

''پانچ سال بعد ابو کی صد سالہ برتھ ڈے منائیں گے''

اور جب میں نے اسے کہا۔

''اس برتھ ڈے کے لیئے آپ کو پندرہ سال مزید انتظار کرنا پڑے گا۔''

تو اس کا منہ لٹک گیا۔

اختتامیہ

(Epilogue)

یہ خودنوشت ابھی نظرثانی کے مراحل میں ہی تھی کہ میں ایک بڑے المیہ سے دوچار ہوگیا ہوں۔ میری سب سے ہونہار لائق عقلمند ذہین بیٹی، نیشنل بنک کی اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ، مختصر سی علالت کے بعد اس جہان فانی سے کوچ کرگئی۔

بچوں کو لے کر تعطیلات گزارنے مری گئے تھے۔ ہوٹل کے پچھواڑے میں درختوں کے جھنڈ کے پاس رات کافی دیر تک گپ شپ میں مصروف رہے۔ میری پیاری بیٹی سمبل نے نائیجیریا کے تعلیمی مقابلہ میں چوبیس ہزار امیدواروں میں پہلی پوزیشن لی ۔ پاکستان کے فیڈرل بنکنگ کمیشن کے امتحان میں دسویں پوزیشن لی تھی۔ اُسکو اچانک رات گئے، کھانسی کی شکائیت ہوگئی۔ ہم صبح ہونے سے پیشتر واپس گھر لوٹ آئے اور اسلام آباد کے بہتریں ہسپتال 'معروف' میں داخل کروایا جہاں سے کچھ بہتر ہو جانے پر اسے شفا انٹرنیشل ہسپتال میں منتقل کردیا، لیکن وہ کھانسی سے نجات نہ حاصل کرسکی اور خالق حقیقی سے جاملی۔

اناللہ وانا علیہ راجعون۔

میں شاعر تو نہیں لیکن بچی لی وفات پر پنجابی میں ایک نوحہ موزوں ہوگیا۔ لہذا اُسے یہاں بطور اختتامیہ شامل کردیا ہے۔

مرثیہ

سمبل میری بچپیے قولاں دیئے سچیئے سکھیاں نوں کہندی سیں۔۔۔
ہکو واری ڈگاں گی فر کدے نہ اُٹھاں گی سمبل میری بچئیے ،قولاں دیئے پکئیے
ستائیسویں رمضان سی قدر دی او رات سی جدوں توں ڈگی سیں قولاں دیئے سچیئے
بھرا زور لا تھکے ،سیانڑیں دارو کھوا تھکے ڈاکٹر ٹیکے لا تھکے، تویز دھاگہ کرا تھکے
ٹونڑیں ٹوٹکے مکا تھکے جگراتے بھی کٹا تھکے پر تینوں نہ جگا سکے قولاں دیئے پکئیے
ماں مصلا ملیا ہراک رُلیا، پر بھید کوئی نہ کھلیا تینوں نہ اُٹھا سکے ،قولاں دیئے پکئیے
نکے تینوں لبدے ڈیڈی ول تکدے نظریں نہ آندی ایں، تے روندے زوروزور نی
انہاں نوں چپ کرا معصوم تیرے بال نی مار مار چیکاں ہوئے سب نڈھال نی
پاک تیرا روح سی نیکیاں ای کردی سیں اللہ تینو اجر دیوے بھلا سب دا کردی سیں
جنت وچوں آئی سیں جنت ول گئی ایں جنت تینوں نصیب کرے ،اہو تیری تھاں نی
اللہ تیرے درجے ودھائے نی جا میری بچیئے دوجی واری جانی
اُتھے تاے چاچے سارے نے جیہڑے سارے تینوں پیارے نے
سمبل میری بچپیے قولاں دیئے سچیئے

....

شیخ غلام فاروق کی اوڈیسی

پروفیسر شیخ غلام فاروق کے آباو آجداد شہاب الدین غوری کے عہد میں اجمیر شریف سے بیکانیر اور وہاں سے ملوٹ آئے۔ 'گڈھوک شیخان' کا موروث اعلیٰ کالی داس ہندو راجپوت تھا۔ وہ پرتھوی راج چوہان کا انیسویں پشت پوتا اور شیخ غلام فاروق کا دسویں پشت دادا تھا۔ کالی داس اپنے عہد میں عقلمند ماہر تعمیر جانا جاتا تھا۔ اس نے قلعہ ملوٹ کی دوبارہ تعمیر کروائی۔ ظہیر الدین بابر ۱۴۹۶ء میں کلر کہار آیا تو دیکھا آبادی ناپید ہے۔ سلطان نے زمین کو آباد کرنے کا حکم دیا۔ بمطابق 'گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخان' کالی داس نے بابر سے فرمان جاری کرنے کی درخواست کی۔ کالی داس نے 'کرنگلی' پہاڑ کے دامن سے جھیل کا پانی جو پہلے ہی کوہ 'جودہ' سے دریائے جہلم میں جارہا تھا کو مزید گہرا کروا دیا بڑے رقبے پر کھڑا پانی دریائے جہلم میں بہہ گیا۔ بابر نے کالی داس کو علاقہ کا ''کاردار'' مقرر کر دیا۔ کالی داس نے سلطان کی اجازت سے نئے آباد کردہ علاقہ کو ''دھن'' کا نام دیا۔ کالی داس کے فوت ہونے پر اہل کلر کہار نے تیسرے روز آگ کے ٹھنڈا ہونے پر چتا کے پھولوں کو اکٹھا کر کے دفن کر دیا اور وہاں ایک چبوترہ بنا دیا۔ جو آج بھی کلر کہار میں 'کالی داس کی مڑھی' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

پروفیسر شیخ غلام فاروق کو لکھنے کے جراثیم وراثت میں ملے ہیں۔ شیخ صاحب کے دادا شیخ نور الدین اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شیخ نور الدین نے ''گلدستہ تاریخ گڈھوک شیخاں'' تحریر کی۔ یہ اجمیر سے بیکانیر تا ملوٹ ہجرت کی داستان ہے۔ شیخ صاحب کے والد میاں شیخ نور احمد، شیخ نور الدین صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ مئی ۱۹۴۶ء میں شیخ نور احمد کو کشمیر کے شہر ہمیر پور سدھڑ بطور پوسٹ ماسٹر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ شیخ غلام فاروق نے لڑکپن یہیں ہمیر پور سدھڑ میں دیکھا۔ شیخ صاحب کا بچپن دوات قلم اور تختی کے ساتھ سیالکوٹ کنٹونمنٹ سکول میں گذرا ہے۔

پروفیسر شیخ غلام فاروق ۲۲ جولائی ۱۹۳۲ء کو اٹک میں پیدا ہوئے۔ پروفیسر صاحب نے انگریزی ادب میں ماسٹر کرنے کے ساتھ ساتھ تکنیکی تعلیم میں ڈپلومہ فزیکل ایجوکیشن مکمل کیا۔ ساری عمر فزیکل ایجوکیشن کے شعبے سے وابستہ رہے۔ ڈائریکٹر فزیکل ایجوکیشن پنجاب اور چیف ایجوکیشن آفیسر نائجیریا رہے۔ دس سال ممبر اور ایک سال ڈائریکٹر اسلام آباد سٹاک ایکسچینج رہے۔ انکی مزید تصانیف انگریزی زبان میں ہیں۔ How can you benifit from Stock Exchange، اور دوسری کتاب، Adopted Physical Education ہے۔

اطہر رسول
ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلیکیشن (Emeritus)
لوک ورثہ اسلام آباد
atharrasul@gmail.com